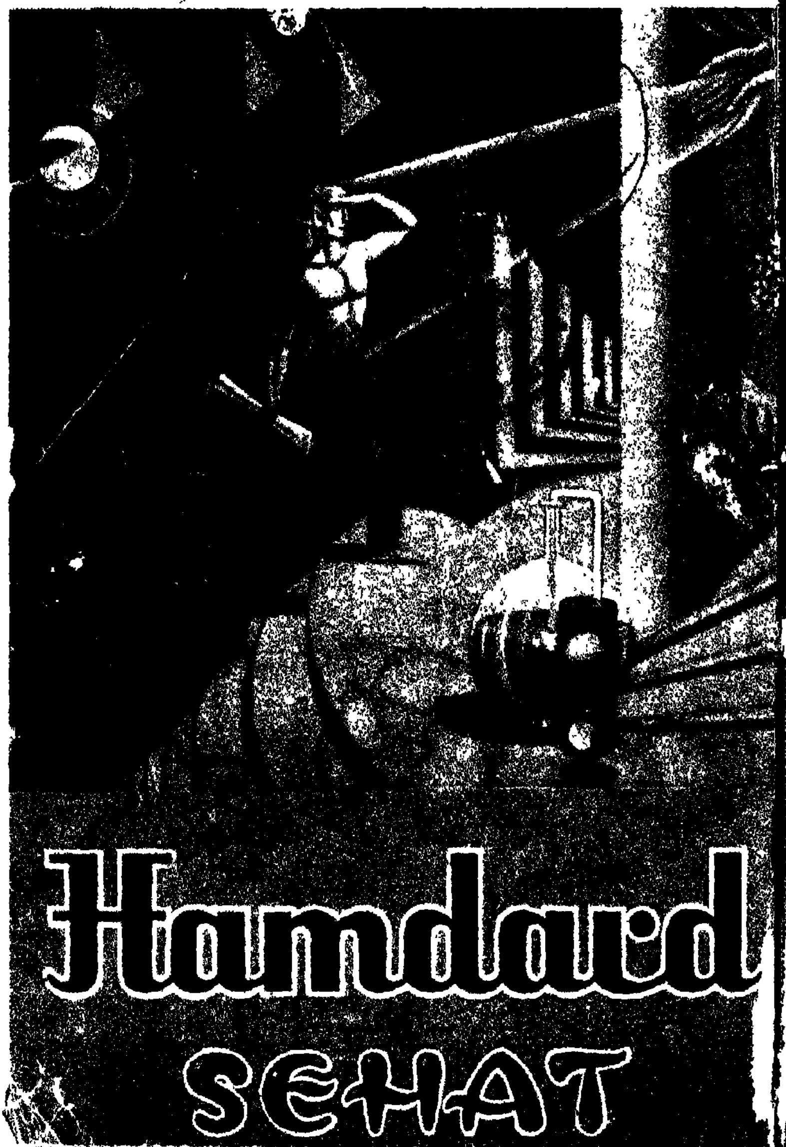
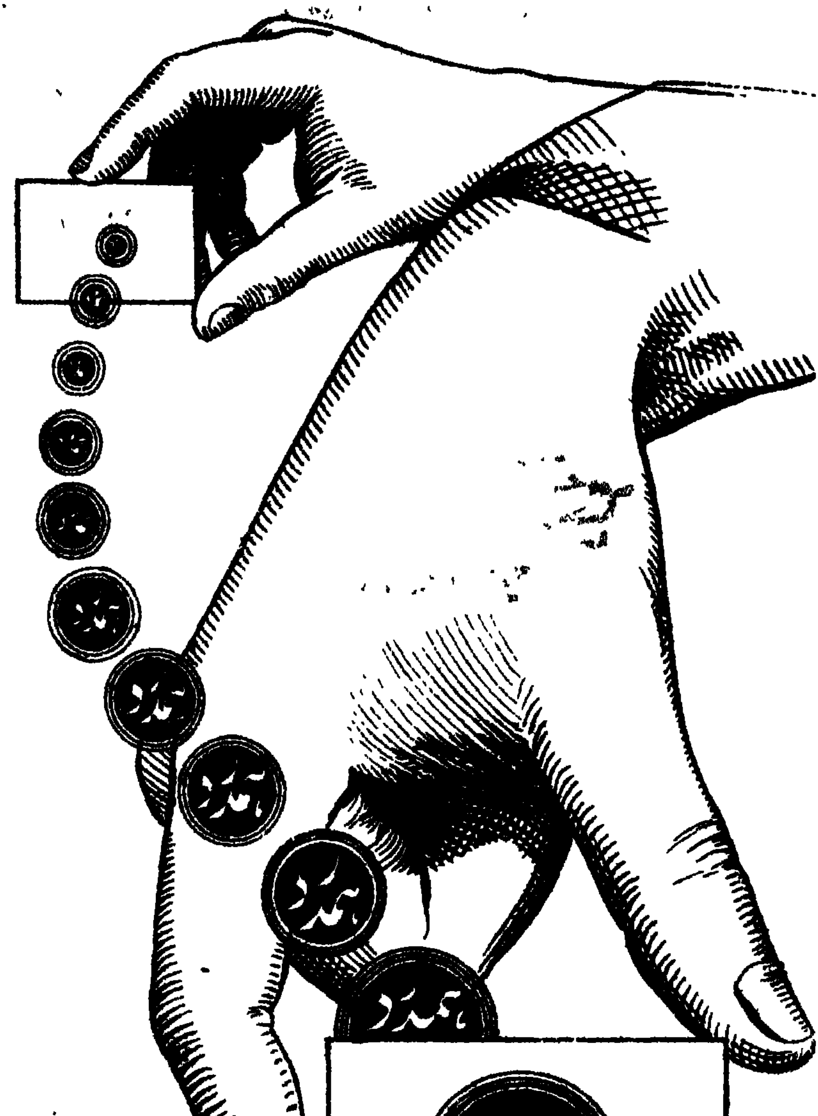
ہمدرد صحت





ایک لفظ، طبِ یونانی کی تاریخ میں جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا!

ہمدرد صحت

نگران حکیم حاجی عبدالحمید، دہلوی

ایڈیٹر حکیم حافظ محمد سعید، دہلوی

صدر دفتر انتظام : بندر روڈ، کراچی

دفتر ادارہ : ۵۵ ، اپر سندھ کولونی، بندر روڈ ایکس ٹینشن، کراچی

صدر دفتر ہند : ہمدرد منزل، لال کنواں، دہلی

دفتر بمبئی : دلال سٹریٹ، فورٹ، بمبئی

دفتر ایڈورٹائزنگ : دلال اسٹریٹ، فورٹ بمبئی

دفتر سعودی عرب : ثولیقہ بازار، مکۃ المکرمہ

ہمدرد صحت ماہانہ شائع ہوتا ہے "ہمدرد دواخانہ دہلی"

اس کے شائع کرنے والے ہیں۔!

قیمت سالانہ (ہندستان و پاکستان میں) پانچ رُپے

قیمت فی پرچہ، آٹھ آنے۔ محصول ڈاک دو پیسے

طابع و ناشر: حکیم محمد سعید دہلوی

مطبع : مشہور آفسٹ لیتھو پریس .. میکلوڈ روڈ - کراچی نمبرا (پاکستان)

رسالہ

ہمدرد صحت

کراچی

جلد: ۱۷ نمبر: ۱

12564

فہرست مضامین

مئی سنہ ۱۹۴۸ء

ہمدرد صحت

کی

سالانہ قیمت پانچ (۵) روپے

اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کیا حالات پیش آئے اور کس طرح ہمدرد صحت کا دفتر کراچی منتقل ہوگیا اور اس کی لائبریری کیسے یہاں پہنچ گئی۔ یہ کچھ ارادتاً بھی ہوا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکثر حرکات غیر ارادی تھیں۔ غرض ہمدرد صحت کراچی آگیا اور یہاں اتفاق سے ایسے حالات بھی میسر آگئے کہ اسے واپس دہلی جانے کی فی الحال ضرورت محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ دفتر بہر حال کہیں ہو مقصد بہر حال خدمت ہے۔ ہر ایک کی خدمت، بلا لحاظ مذہب و ملت۔ اور خدمت ہر جگہ بیٹھ کر کی جاسکتی ہے۔ مسلسل سولہ سال سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ آئندہ بھی خدا نے چاہا تو جاری رہے گا۔ لیکن اب کسی کے لیے یہ محسوس کرلینا مشکل نہیں کہ "ہمدرد صحت" کے لیے ناممکن ہے کہ آئندہ صرف ایک روپیہ سال میں بارہ رسالے پیش کیے جاسکیں۔ اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہمدرد صحت کی سالانہ قیمت پانچ روپے کردی جائے جو رسالہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اس کی قیمت آٹھ آنے ہے اور یہ آٹھ آنے واقعی اس کی لاگت ہے۔ پچھلے سولہ سال میں سینکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں بلا مبالغہ لاکھوں روپے نقصان اُٹھا کر ہمدرد صحت آپ کی خدمت کرچکا ہے۔ اب بھی اس سے کسی قسم کی تجارت مقصود نہیں ہے۔ لیکن اب یہ ضروری اور مناسب ہے کہ اس پر واقعی جو اخراجات آئیں وہ اسی سے پورے ہوسکیں۔ اور اخراجات اسی سے پورے ہوں گے کہ رسالہ کی سالانہ قیمت پانچ روپے مقرر کی جائے اور فی پرچہ آٹھ آنے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمدرد صحت کے ناظرین اور سرپرستوں کے لیے رسالے کی یہ قیمت ادا کرنا ناگوار نہ ہوگا اور ہم ہمدرد صحت کو اسی معیار پر جاری رکھ سکیں گے۔

فسادات دہلی کے دوران میں ہمدرد صحت کے رکارڈ کا بیشتر حصہ ابھی ڈاک خانوں میں رُکا ہوا ہے، اور ہمیں ابھی تک نہیں ملا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ہم سب خریداروں کی خدمت میں اپریل کا رسالہ وقت پر نہ بھیج سکیں۔ ہمارا اصول کار اب یہ ہوگا کہ جن خریداروں کا چندہ ابھی چھ ماہ یا اس سے کم واجب ہے ان کو رسالہ کی ایک کاپی بھیجی جائے گی اور ان کا چندہ ختم ہو جائے گا۔ اور جن حضرات و خواتین کے چندے چھ ماہ سے زیادہ کے دفتر میں جمع ہیں اُن کو دو ماہ کے رسالے پیش کیے جائیں اور دو رسالوں کے ساتھ ان کے چندے ختم ہو جائیں گے۔ اور ان کو سالانہ پانچ روپے کے حساب سے نئے چندے دفتر میں جلد از جلد بھیج دینے چاہییں۔ تاکہ ان کا نام رجسٹروں میں باقی رہے۔ سالانہ چندہ آپ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا کراس چیک ذریعے بھیج سکتے ہیں۔ چندے ان پتوں پر بھیجیے :-

ہند کے خریدار : دفتر ہمدرد صحت، ہمدرد منزل، دہلی۔

پاکستان کے خریدار : دفتر ہمدرد صحت، بندر روڈ، کراچی۔

نوٹ ۱ ہند کے خریدار براہ راست کراچی بھی چندے بھیج سکتے ہیں۔

نوٹ ۲ رسالے کے بارے میں باقی جملہ خط و کتابت کراچی کے پتے پر کی جائے گی۔

نوٹ ۳ طلبا اور طالبات کے لیے سالانہ قیمت للعہ ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ چندہ کے ساتھ ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل کی تصدیق بھی جائے۔

آپ کا خادم

ناظم ہمدرد صحت

اشارات

ہماری جسمانی قوتیں خدا اور قوم کی امانت ہیں

اِن کی حفاظت اور دیکھ بھال ہمارا اخلاقی و قومی فرض ہے!

علم و سائنس کی بڑھتی ہوئی ترقی نے جہاں کچھ لوگوں کو اس فریبِ نفس میں مبتلا کر دیا ہے کہ انسان اصل میں پہلے حیوان تھا، خود بہ خود عالمِ وجود میں آیا اور بے شمار ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا اب اس ہیئت میں آیا ہے کہ اسے انسان کہا جانے لگا، وہاں لوگوں کی ایک بڑی تعداد پر اس حقیقت کو بھی القا کر دیا کہ اس کائنات میں انسان بھی خدا کی ایسی مخلوق ہے جیسے جمادات، نباتات اور حیوانات۔

آج کوئی بلید الذہن ہی ہوگا جو خدا کی وحدانیت کے تصور و تیقن سے پیدا ہونے والے صحیح قسم کے اخلاقیات کی نفی کرنے کی جرأت کرے۔ ملحد سے ملحد کو بھی یہ کہتے بن آتی ہے کہ اس دنیا میں اگر خدا کے وجود کو فرض کر لیا جائے تو انسان کی اخلاقی تربیت کے لیے صحیح و مستحکم نوعیت کی بنیاد مل جاتی ہے۔ بہر حال ہم ہیں خدا ہی کی مخلوق اور جب اس کی مخلوق ہیں تو لامحالا اسی کے بندے بھی ہیں۔ ہمیں یہ حق کسی طرح نہیں پہنچتا کہ ہم اپنی جسمانی قوتوں کو ــــــ جن کے ہم خود مالک نہیں بلکہ مخلوق و بندہ ہونے کی حیثیت سے محض امانت دار ہیں ــــــ ایسے راستوں پر ڈال دیں جو تباہی و ہلاکت کے گڑھے میں لے جانے والے ہوں اور جس کے نتیجے میں پوری انسانیت کو خطرہ لاحق ہو جائے۔

الٰہی نقطۂ نظر سے قطع نظر، اگر خالص اجتماعی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو وہ شخص جس نے کسی معاشرہ میں آنکھ کھولی ہے اور اس کی گود میں پل بڑھ کر جوان ہوا ہے اپنی کسی جسمانی یا دماغی قوت کا یہ کہہ کر غلط استعمال نہیں کر سکتا کہ اس کی ذاتی چیز ہے، لہٰذا جس طرح وہ چاہے استعمال کرے۔ عین اس وقت جب وہ محض ایک مضغۂ گوشت تھا جوانی تک جب کہ وہ خود دنیا میں ہاتھ پیر مارنے کے قابل ہوا، وہ پورے معاشرے کا دست نگر رہا ہے۔ والدین نے اس کے لیے راتوں کی نیندیں حرام کیں اور خود بے شمار تکلیفیں اٹھا کر اس کے لیے ہر طرح کی آسائشیں مہیا کیں تاکہ اس کی جسمانی قوتوں کو پوری طرح بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع ملے۔ اس کے ساتھ ہی سماج نے اس کے استعمال اور ضرورت کی بے شمار چیزیں اس کے گرد و پیش جمع کر دیں تاکہ اس کی شخصیت و سیرت کی تکمیل میں کوئی کسر نہ رہ جائے ان حالات میں یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص بھی اپنے آپ کو سماج کے اس فرض سے سبکدوش سمجھ کر دنیا میں اپنے جسم و دماغ کو استعمال کرے۔ خودکشی تمام دنیا کے ممالک میں اسی وجہ سے تو جرم قرار دی گئی ہے کہ کوئی حکومت انسان کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنے جسم کو ہلاک کر دے۔ یہاں ہی سے یہ نکتہ نکلتا ہے کہ ہم دراصل اپنی جسمانی قوتوں کے امین ہیں، مالک نہیں۔ ان قوتوں کو ہم بس انھی

کاموں میں استعمال کر سکتے ہیں جن سے قوم، ملک یا خود اپنے جسم کا فائدہ ہی فائدہ ہو، نقصان نہ ہو۔ جن کاموں سے نقصان پہنچتا ہو ان کے کرنے سے نہ صرف خدائے تعالیٰ ہی منع کرتا ہو بلکہ ملک کا قانون بھی اسے ناجائز قرار دیتا ہو تاکہ انسان اپنی قوتوں کو نادانی کی وجہ سے ضائع نہ کرنے پائے۔

انسانی زندگی کی اس بنیادی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد یہ چیز آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کا شہری اور قوم و ملک کے لیے واقعی مفید اور کارآمد بننے کے لیے یہ ہمارا اخلاقی و قومی فرض ہو کہ ہم اپنی جسمانی قوتوں کی حفاظت و بقا کے لیے پیہم و منظم جد و جہد کرتے رہیں اور جس طرح ہم اب تک کرتے رہے ہیں معمولی و غیر اہم سمجھ کر اس سے بے اعتنائی نہ برتیں کہ اس صورت میں ہم خدا اور سماج دونوں کے سامنے مجرم ٹھیرتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے کہ قیام صحت کے لیے ہماری انفرادی کوششوں کا دار و مدار بڑی حد تک اس امر پر موقوف ہو کہ ہماری اپنی حکومت اس معاملے میں کیا مستحسن اقدامات کرتی ہیں اور قیام صحت سے متعلق اس پر جو زبردست ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان سے وہ کس خوبی سے عہدہ برآ ہوتی ہو۔

ہمارے نزدیک اس اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک ذمے دار او مسئول حکومت کو اپنی پوری مشینری اور طرز حکومت پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ وہ محض اس طرح کام نہیں چلا سکتی کہ صحت و صحیح غذا کی اہمیت اور اس سے متعلق کچھ معلومات پر مشتمل لٹریچر شائع کر دے اور جی چاہے تو کچھ ہسپتال اور سینی ٹوریم کھول دے۔ اور بس —— یہ بھی ضروری ہیں —— مگر اس کے لیے سب سے زیادہ اور اہم اور بنیادی چیز یہ ہو کہ اس کا اقتصادی نظام نہایت اچھا ہو۔ وہ اتنی صحیح و متوازن بنیادوں پر قائم ہو کہ اس کے تحت وہاں کوئی بھوکا ننگا باقی نہ رہے اور زندگی و قیام صحت کے لیے جتنی چیزیں ضروری ہیں وہ ہر شخص کی قوت خرید کے اندر ہوں۔ اس کے ساتھ ہی نظام تعلیم بھی اتنا اچھا ہو کہ بچپن ہی سے ہر شخص کو اپنی جسمانی قوتوں کے صحیح استعمال کی اہمیت معلوم ہو جائے۔ اور وہ بری صحبتوں سے بچنے لگے۔ آوارگی خیال و عمل کی اکثر و بیشتر راہیں قانوناً مسدود کر دی جائیں تاکہ انسان صحت فکر و عمل کی دولت سے مالا مال ہو جائے۔ ایسے اور فقط ایسے ہی پاک اور ستھرے ماحول میں ہم اجتماعی طور پر اپنی صحتیں درست رکھ سکتے ہیں۔ اس سے کم جو کچھ بھی کیا جائے گا اس کی حیثیت اس معالجے کی نوعیت سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوگی جس میں بنیادی اسباب مرض کو تو علیٰ حالہٖ قائم رکھا جائے اور محض تکلیف دہ علامتوں کو رفع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ کام تو بہر حال حکومت ہی کے کرنے کے ہیں اور طویل منصوبہ بندی سے متعلق ہیں اب اگر ان پر فوری طور پر بھی عمل درآمد شروع کیا جائے تو تکمیل کی مدت کئی سال ہو۔ لیکن سوال یہ ہو کہ ہماری موجودہ حکومت حالات کو اس نگاہ سے دیکھ رہی ہو؟ قومی مفاد کی کوئی تڑپ اراکین حکومت کے دلوں میں ہو؟ ان "اشارات" میں ہم اس موضوع پر فی الحال کوئی بحث چھیڑنا نہیں چاہتے۔ اس وقت ہم جو کچھ بتانا چاہتے ہیں وہ اس سے زیادہ نہیں ہو کہ اس معاملۂ خاص میں ایک خاندان کی مختصر سی سلطنت میں ہماری انفرادی ذمہ داریاں کیا ہیں اور انھیں ہم کس طرح پورا کر سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر حکومت کا دائرۂ عمل ایک ملک ہے تو فرد کا دائرۂ عمل اس کا اپنا گھر اور خاندان ہے۔

ایک خاندان کی ابتدا، دو آدمیوں سے ہوتی ہے ـــــ ایک مرد اور ایک عورت ـــــ اب اگر یہ دونوں افراد صحت وتن درستی کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور ان کے پاس وہ ضروری علم بھی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر وہ صحی زندگی کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں اور اپنی اولاد و متعلقین کے لیے ایک نمونہ پیش کر سکتے ہیں تب تو ان کی اولاد کی تربیت صحیح خطوط پر انعقاد حمل ہی کے وقت سے شروع ہو جائے گی اور ان کے بچے آنکھ ہی ایسے صاف ستھرے ماحول میں کھولیں گے کہ انھیں مصنوعی طور پر علیحدہ علیحدہ ایک ایک چیز کی اہمیت بتانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی بچے جس طرح اپنے بڑوں کو کرتا دیکھیں گے خود بھی وہی کرنے لگیں گے۔ اس کے بعد معمولی سی تربیت اپنا پورا پورا کام کر جائے گی۔

یہ ایسی پیش پا اُفتادہ حقیقت ہے کہ اس کو بتانے اور ذہن نشین کرانے کے لیے کسی لمبے چوڑے استدلال کی ضرورت نہیں ہے معمولی سی عقل کا آدمی بھی اسے جانتا اور سمجھتا ہے مگر یہاں عملی زندگی میں ہم کچھ اور ہی دیکھتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کم و بیش یہی چاہتا ہے کہ وہ خود تو جو چاہے کرتا رہے، مگر اس کی اولاد نیک، خوش اخلاق اور صحت مند اٹھے۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے؟ کاشت تو ہم لیموں کے پودے کی کریں اور توقع یہ رکھیں کہ ان درختوں سے پھل آم کے نمودار ہوں گے! یہ خام خیالی نہیں تو اور کیا ہے؟ اب اگر اس آب و گل میں یہ نہیں ہو سکتا تو عالمِ اسباب میں یہ کیوں کر ممکن ہے کہ بنیاد تو ہم ایک خاص طرح کے خاندان و معاشرہ کی رکھیں اور توقع یہ قائم کریں کہ اُس مخصوص معاشرہ سے عمل بالکل ہی دوسری نوعیت کا سرزد ہوگا۔ ان معجزوں کی توقعات میں رہنا ایک سخت قسم کی بھول نہیں تو اور کیا ہے؟

اپنی اولاد کی صحی زندگی کو درست کرنے کے لیے ہمیں بالکل شروع ہی سے چلنا ہوگا۔ صحی زندگی کے معمولات پر ہم خود عمل پیرا ہوں گے اور اپنی جسمانی قوتوں کی حفاظت کریں گے تو ہماری اولاد بھی ایسی ہی اُٹھے گی اور ہمارے پڑوسیوں اور ہمسایوں پر بھی اس کا اچھا اثر پڑے گا اور جب ہم میں سے ہر شخص اس اصطلاح میں سوچنے اور عمل کرنے لگے گا تو چونکہ افراد سے خاندان بنتے ہیں اور خاندانوں سے قوم، پوری قوم کی صحی زندگی رفتہ رفتہ درستی کی طرف آنے لگے گی اور وہ دن دُور نہ ہوگا کہ ہماری سوسائٹی کی "صحی حس" اتنی تیز ہو جائے گی کہ اس میں کم زور اور بیمار رہنے والے آدمیوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھا جانے گا اور ان کے خاندان کے متعلق یہ خیال کیا جانے لگے گا کہ وہ غلط کار اور سُست الوجود قسم کے لوگوں پر مشتمل ہو گا جو ایسے کم زور و بیمار آدمی پیدا ہوتے۔ خود ان لوگوں کے کیرکٹر بھی مشتبہ ہو جائیں گے اور پورے معاشرے میں ایسے لوگوں کے لیے عزت و وقار کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گا۔

بیمار اور کم زور رہنا جرم ہے۔ اپنی صحتوں کو درست کیجیے۔ اعتدال کی زندگی بسر کیجیے۔ اپنے کیرکٹر کو مضبوط بنائیے۔ اپنے خاندان اور اپنے پڑوسیوں کو صحیح راہ دکھائیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو کم زور پاکر کوئی آپ کی آزادی پر حملہ کر سکے۔ بہادر اور قوی لوگ ہی اپنے ملک کو قوی بناتے ہیں اور قوی ملک

ہی خود کو سربلند رکھ سکتا ہے۔ اپنے سے کم زوروں کا مذاق نہ اُڑائیے۔ آپ کا فرض ہے کہ کم زوروں کو سہارا دیں اور عزّت کی زندگی گزارنے میں اُن کی مدد کریں۔ اپنی زندگی کو دوسروں کے لیے بھی مفید بنائیے جس قوم و ملک کے افراد ایسے ہوں دنیا کی کوئی طاقت اور قوت اسے اپنا دست نگر نہیں بنا سکتی۔

ہمدرد دوَاخانہ

دہلی کی قسمت ہی میں اجڑنا اور بسنا لکھا ہے۔ نہ معلوم یہ کتنی بار اُجڑی اور کتنی بار بسی ہے ستمبر سنہ ۴۷ء میں اس دہلی پر جو بھی گزری سب کو معلوم ہے۔ بہرحال اب امن و صلح کی قوتیں بروئے کار آچکی ہیں، بسنے والے بس چکے ہیں اور جو تباہ حال روٹھ کر چلے گئے تھے واپس بسنے کے لیے آرہے ہیں، بس رہے ہیں اور بسائے جا رہے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ امن دائمی ہو۔ محبت و ملاپ جو پہلے تھا پھر قائم ہو اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم ہو۔ ہندو، مسلم اور سکھ ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں اور بھائیوں کی طرح رہیں بسیں، دنیا کی ایک بڑی شخصیت —— گاندھی جی —— نے اسی کارن اپنی جان دی ہے۔ آئیے اس قربانی سے ہم سبق لیں اور آپس کے بیر ختم کردیں اور انسانوں کی طرح زندگی بسر کریں۔

دہلی کی اس تباہی سے کم و بیش ہر ایک ہی متاثر ہوا ہے۔ اتلاف جان ہوا نقصانِ مال بھی، سارے کاروبار بند ہو کر رہ گئے اور ہر طرف ابتری ابتری ہی نظر آتی تھی۔ ہمدرد دواخانہ بھی دہلی ہی میں تھا اور ہے، اس پر کوئی بڑی آفت تو نازل نہیں ہوئی تاہم اس ادارے کا کوئی شعبہ نہ تھا جو متاثر ہوئے بغیر رہا ہو۔ تاہم حالات پر جلد قابو پا لیا گیا۔ خدا کو منظور ہی یہ تھا کہ ہمدرد دواخانہ ہر حال میں قوم کی بلا لحاظ مذہب و ملت خدمت کرے۔ اسی خدمت کے لیے وہ باقی رہا اور اسی خدمت کے لیے وہ باقی ہے۔ اُن قیامت کے دنوں میں بھی ہمدرد نے بیماروں کی خدمت کی، اور آئندہ بھی وہ خدمت کے لیے ضرور قائم رہے گا انشاءاللہ۔

دہلی ہند میں طب یونانی کا مرکز ہے۔ ہمدرد دواخانہ کا مرکز بھی دہلی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور کوئی قوت نہیں جو ان کو جدا کر سکے۔ اور دنیا میں جہاں جہاں طب یونانی اپنا مرکز حاصل کرتی جائے گی، کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمدرد اس کے ساتھ نہ ہو۔

ہندو پاکستان کے بعض غیر ذمہ دار اخبار نویسوں نے اپنی کوتاہ نظری کی بنا پر ہمارے پائے استحکام کو متزلزل کرنے کی کوشش کی ہے اور ہمدرد دواخانہ دہلی چھوڑ دینے اور اسے فروخت کر دیے جانے کے افسانے تراشے ہیں لیکن ان کی حیثیت ایک واہمے سے زیادہ نہیں ہے۔ اس قسم کی اطلاعات بے بنیاد اور قطعاً غلط ہیں۔ جس طرح طب یونانی کوئی مقامی یا شخصی طب نہیں ہے۔ اسی طرح ہمدرد دواخانہ کوئی مقامی یا شخصی دواخانہ نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہندو پاکستان سے باہر بھی —— انگلستان اور امریکا تک میں —— اس کی تیار کردہ دوائیں استعمال کی جاتی ہیں۔ مقصد صرف ایک ہے، اور وہ ہے خدمت۔ علاج معالجہ مذہب و ملت کا نہیں ہوتا بیماروں کا ہوتا ہے انسانوں کا ہوتا ہے۔ ہمدرد دواخانہ دہلی میں رہے گا، پاکستان میں بھی اس کی آزاد شاخیں قائم ہوں گی اور خدا توفیق دے

تو موقع اور وقت آنے پر سعودی عرب کی طرح دوسرے ممالک میں بھی شاخیں اور ایجنسیاں قائم کی جائیں گی۔ اور اگر خدا کو یہ منظور نہیں ہو تو حکومتیں اور سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ ہمدرد دواخانہ بھی ہو سکتا ہو اور تباہ کیا جاسکتا ہو۔ لیکن فروخت نہیں ہو سکتا۔ فروخت نہیں کیا جاسکتا۔

طبِّ یونانی

یہ بڑی مسرت کی بات ہو کہ اطبا۔ کا ایک بیدار طبقہ طب یونانی کی ترقی کے لیے اور اس فن کو اس کی صحیح جگہ دیے جانے کے لیے آمادہ جد وجہد ہو اور انھوں نے اپنے مطالبات بھی پیش کر دیے ہیں۔ ہرچند کہ اسی قسم کے مطالبات کی آوازیں کانوں نے بارہا سنی ہیں، لیکن تقسیم ہند کے بعد ان مطالبات نے ایک نئی صورت اختیار کی ہو، جو مختلف حیثیتوں سے قابلِ غور ہو۔

مطالبات یہ ہیں جو طول طویل بیانات سے ماخوذ ہیں:۔

۱۔ طبِ یونانی ایک مفید ترین طریقہ علاج پیش کرتی ہو۔ اس لیے اسے ملک میں عام کیا جائے۔

۲۔ طبِ یونانی کو ڈاکٹری کے برابر درجہ دیا جائے اور حاملین طب یونانی کو وہی مرتبہ حاصل ہونا چاہیے کہ جو ڈاکٹروں کو حاصل ہو۔

۳۔ چونکہ طب یونانی مسلمانوں کا فنِ معالجہ ہو۔ لہٰذا اسے طب اسلامی کا نام دیا جائے۔

اول الذکر دو مطالبوں کے متعلق تو ہم مختصراً یہ کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ اس میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ طب یونانی جو طریق علاج پیش کرتی ہو وہ مفید ترین ہو۔ اور جہاں تک اس کے اصول علاج کا تعلق ہو اُسے صحیح اور سائنٹفک تسلیم کرنے کے لیے آج یورپ بھی مجبور ہو۔ لیکن طبِ یونانی کے عام کیے جانے اور اسے ڈاکٹری کے برابر درجہ دیے جانے کے لیے جو راہیں اختیار کی گئی ہیں وہ وہی پُرانی ہیں جن پر چل کر ہم آج تک منزلِ مقصود کو نہیں پہنچ سکے ہیں۔ مطالبات پیش کر دینا اور موقع آجائے تو گاہے گاہے حمایتِ طبِ یونانی میں بیانات چھپوا دینا کافی نہیں ہو۔ نئی نئی جماعتیں بنا لینا اور چند لوگوں کا جمع ہو کر عہدے تقسیم کر لینا اور بیانات دے کر خاموش بیٹھ جانا کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہو جس کے بدلے میں آپ کو طب یونانی کا درخشاں حال و مستقبل مل جائے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے والوں کو کبھی کچھ نہیں ملا کرتا، پیہم کوشش، اَن تھک محنت اور بے غرض ہو کر کام کرنا، یہی ذرائع ہیں جن سے مسلح ہو کر ہی آپ راہ میں پیدا ہونے والی مشکلات پر فتح پا سکتے ہیں۔ پورے ملک میں اپنی ایک اور محض ایک آواز پیدا کیجیے، متحد ہو جائیے، عزم کر لیجیے کہ طب یونانی کو ترقی دینی ہو اور پھر دیکھیے کہ کون ہو جو آپ کی نہیں سنتا، کون ہو جو آپ کی آواز پر کان نہیں رکھتا، کون ہو جو آپ کے مطالبات کو تسلیم نہیں کرتا؟

ہمارے یہ مطالبات کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ ہمیشہ ہم نے اسی نوعیت کی آواز بلند کی ہو اور نتیجہ ہمیشہ ہماری تمناؤں کے خلاف برآمد ہوا ہو۔ آخر کیوں؟ آئیے ذرا اپنی ناکامیوں کے اسباب بھی ڈھونڈ لیں۔ ہم نے جہاں تک غور کیا ہو حسبِ ذیل پانچ بنیادی اسباب ہیں جن کی بدولت طبِ یونانی اپنی جگہ

حاصل نہیں کرسکی ہے۔

۱۔ ہمارے پاس کوئی مکمل اور اعلا درسگاہ نہیں ہے۔

۲۔ جو درسگاہیں ملک میں موجود ہیں اُن کے فارغ التحصیل فن کا کوئی اعلا نمونہ پیش نہیں کرتے اس کی وجہ یہ ہے کہ نصابِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم نہایت ناقص ہیں اور معیارِ داخلہ ان درسگاہوں کا قطعاً پست ہے۔

۳۔ ایسے آدمی موجود نہیں ہیں جو فن کی بے لوث اور بے غرض خدمت کر رہے ہوں۔

۴۔ پورے ملک میں ہماری آواز ایک آواز نہیں ہے۔

۵۔ طبِ یونانی کے نام پر اشتہار بازی کرنے والوں نے اس فن کو بدنام کر دیا ہے۔

۱۔ ایک اعلا درس گاہ :

یہ موقع نہیں ہے اور نہ ان صفحات میں گنجائش ہے کہ ہم ایک اعلا درس گاہ کا خاکہ پیش کریں تاہم ایک اعلا درس گاہ کا مطلب یہ کبھی نہیں ہے کہ کوئی عالی شان عمارت بنا کر کھڑی کر دی جائے اور اسے طب یونانی کی ایک اعلا درس گاہ کا نام دے دیا جائے۔ ایک اعلا درس گاہ کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ جہاں طبِ یونانی کے پورے مطالب کا لحاظ رکھ کر تعلیم دی جائے۔ ہم انشاء اللہ ہمدرد صحت کی آئندہ اشاعت میں اس سلسلے میں تفصیل کے ساتھ لکھیں گے اور ایک معیاری درس گاہ کا خاکہ پیش کریں گے۔

۲۔ ہماری موجودہ درس گاہیں :

طبیہ کالج دہلی ہی ایک ایسی درس گاہ طب تھی جس پر ہم بجا طور پر فخر کرسکتے تھے مسیح الملکؒ کے کھینچے ہوئے خطوط پر جب تک اس کالج میں تعلیم و درس کا سلسلہ رہا۔ اس مادرِ علمی کے فارغ التحصیل فن کو ترقی کی بلند منزلوں تک پہنچاتے رہے۔ لیکن افسوس یہ سلسلہ زیادہ عرصے باقی و قائم نہ رہا۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کیا حالات پیش آئے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس اعلا درس گاہ کا معیارِ تعلیم ہوتے ہوتے اتنا پست ہوگیا کہ اسے کسی طرح بھی فن کے شایانِ شان قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس کے بعد طبیہ کالج علی گڑھ کو اہمیت حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم کا معیار یہاں اچھا ہے۔ معیارِ داخلہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن تعلیم کا انداز یہ ہے کہ جب طالب علم یہاں سے فارغ ہو کر نکلتا ہے تو ایلوپیتھی کا مداح ہوتا ہے اور طب یونانی کو ڈاکٹری کے مقابلے میں کم درجہ دیتا ہے۔ دوسرے کالجوں اور اسکولوں کا معیارِ داخلہ یہ ہے کہ جو طالب علم ہر شعبۂ علم میں جب ناکام ثابت ہوتا ہے تو وہ کسی طبی کالج میں داخل ہوجاتا ہے، کئی ایسے طبیہ کالج بھی موجود ہیں جو محض ایک کمرے میں طب کے سارے شعبوں کی تعلیم دے رہے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومت نے ان کو "رگگنائز" کیا ہوا ہے۔

غرض طبِ یونانی ایسے حالات سے دوچار ہے۔ ظاہر ہے کہ فن کی ترقی کے لیے اور اسے بلند درجہ دلانے کے لیے یہ سب کچھ کافی نہیں ہے اور اس چیز کی سخت ضرورت ہے کہ حالات کا صحیح جائزہ لیا جائے۔ ہند میں طبیہ کالج دہلی کو ایک بار پھر انھی خطوط پر چلایا جائے جو مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب

نے کھینچے تھے اور جو ایک معیاری اور اعلیٰ درس کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اور پاکستان میں سارے اطبا، مل بیٹھ کر ایک نظامِ عمل مرتب کریں۔ اور ایک درس گاہِ طبِ یونانی کے قیام پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔

۳۔ فن کی بے لوث خدمت

اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ فن کی ترقی اور خدمت ہمارا مقصدِ اعلیٰ ہو۔ اور اس ترقی سے ہماری کوئی ذاتی غرض وابستہ نہ ہو۔ لیکن صورتِ حال مختلف ہے۔ ہر شخص اپنی ذاتی غرض لے کر اس میدان میں قدم رکھتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کام میں کوئی اس کا شریک نہ ہو اور ساری شہرت اسی کے حصے میں آجائے، اور اس کے "کارناموں" سے ہر ایک متاثر ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ فریب میں مبتلا ہے، اور اپنے خیالات کے اعتبار سے مریض ہے۔

۴۔ ایک آواز :-

ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری آواز ایک آواز نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کھڑا ہوتا ہے اور ایک جماعتِ اطبا، بنالیتا ہے، اور اس وقت پورے ہند و پاکستان میں ایک دو نہیں، لاتعداد ایسی ہی جماعتیں موجود ہیں۔ ہر جماعت کا صدر اپنی راہ علیحدہ چلتا ہے اور کبھی اس قابل نہیں ہوتا کہ طبِ یونانی کی فلاح کا کوئی کام کرسکے۔ ہند میں ایک "آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس" کے نام سے اطبا اور ویدوں کی جماعت موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے زندہ کیا جائے۔ اور ایک بار پھر اس جماعت سے وہی کام لیا جائے جو یہ کرچکی ہے۔ دوسری طرف پاکستان میں ایک ایسی طبی جماعت بنائی جائے جس کی آواز پر پورے ملک کے اطبا لبیک کہیں۔ مناسب ہو تو اس کا نام "آل پاکستان یونانی اینڈ آیورویدک طبی کانفرنس" رکھا جائے، اور ہند و پاکستان کی دونوں جماعتیں اشتراکِ عمل کریں۔

۵۔ اشتہار بازی

طبِ یونانی کو سب سے زیادہ نقصان جس چیز نے پہنچایا وہ "غیر ذمہ دار دوا فروشوں کی اشتہار بازی ہے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر آپ خود کو حکیم ظاہر کریں تو دوسرا آدمی فوراً آپ سے "دوائے ممسک" طلب کرے گا۔ اگر آپ کسی کو کوئی مرہم دیں تو وہ اسے طلا سمجھے گا۔ گویا یونانی طب کے حاملین کے متعلق یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ یہ حضرات صرف ضعفِ باہ کا علاج کرتے ہیں۔ اور کیوں نہ سمجھیں جب کہ ایک حکیم صاحب ہیں کہ "سات دن میں جوانی کی واپسی" کا ٹکٹ دیتے ہیں۔ ایک صاحب "تین دن میں سوزاک غائب" فرمارہے ہیں۔ ایک صاحب "ممسک تا ترشی" کا دعوےٰ فرمارہے ہیں۔ ایک صاحب دوائے مبہی اور دوائے ملذذ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملارہے ہیں۔

ایک شریف فن کے ساتھ یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے نتیجے میں آپ تباہی اور بدنامی فن کے سوا اور کیا توقع کرسکتے ہیں؟ ہر چند کہ صوبۂ پنجاب کی حکومت نے اس فحش اور لغو اشتہار بازی کو روکنے کا انتظام کیا اور دہلی کی حکومت نے تو اشتہار بازوں کے نام لے کر اور اشتہارات کے عنوانات نوٹ کرکے اخبارات کو بھیجے کہ ان اشتہارات کی اشاعت قانوناً ممنوع ہے لیکن یہ اشتہار

بند ہونا تھے نہ ہوتے۔ اس لیے کہ ہماری آواز میں کوئی جان نہیں ہے جسے سُن کر حکومت کے لیے خاموش ہوجانا ناممکن ہوجائے۔

یہاں پھر ضرورت اس کی ہے کہ ہم ایک مرکز پر جمع ہوں۔ ہماری آواز کی یہ قیمت ہو کہ حکومت اُسے سُننے اور ماننے کے لیے مجبور ہو۔ دوا فروشوں کی دواسازی کا ہم جائزہ لے سکیں۔ اشتہاروں کا ایک معیار ہم مقرر کرسکیں اور اس معیار کے خلاف کوئی اشتہار شائع نہ کیا جاسکے۔ حکومت ہماری سفارشات کو ماننے کے لیے مجبور ہو۔

یہ ہیں پانچ اسباب ہماری ناکامیوں کے، اور فنِ طب کی ترقی کی راہ میں رُکاوٹ کے۔ اِن اسباب کا پوری ذمہ داری اور سنجیدگی سے جب تک جائزہ نہیں لیا جائے گا ہم اس طب کی کوئی خدمت نہیں کرسکیں گے، اور یہ فن بتدریج تباہی کی طرف چلا جائے گا اور اس کے بعد ناممکن ہوجائے گا کہ اس مفید ترین طریقِ علاج کو زندہ کیا جاسکے۔

چند اطبّائے پاکستان کا ایک مطالبہ یہ ہے کہ طبِ یونانی کو پاکستان میں "طبِ اسلامی" کا نام دیا جائے،

اس مطالبے پر ہمیں مختلف حیثیتوں سے غور کرنا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ آخر آپ طبِ یونانی کو طبِ اسلامی کیوں کہنا چاہتے ہیں؟ اس کا جواب آپ کے پاس سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ چوں کہ طبِ یونانی مسلمانوں نے ایجاد کی ہے اور اب جب کہ پاکستان ایک اسلامی ملک بن گیا ہے کیوں نہ طبِ یونانی کو واضح طور پر طبِ اسلامی کہا جائے! ہم اوّل تو یہ عرض کریں گے کہ آیورویدک کے اکثر اصول خود میں جذب کرلینے کے بعد طبِ یونانی درصل طب ہندی بن چکی ہے۔ کیا آپ پاکستان میں اسے طبِ اسلامی بنا کر بلکہ مسلمان بنا کر آیورویدک کے وہ تمام اصول اس سے خارج کردیں گے جو اس کی رگ رگ میں سرایت کرکے اس کی افادیت کو بہتر سے بہتر بنا چکے ہیں؟ تعصب کا تقاضا تو یہی ہے کہ آپ ایسا کریں!

دوسرا سوال یہ ہے کہ متحدہ ہندستان میں آخر کیا چیز مانع تھی کہ آپ نے طبِ یونانی کا نام طبِ اسلامی نہیں رکھا؟ کیا متحدہ ہندستان میں آپ مسلمان نہیں تھے؟ کیا اس وقت آپ کو معلوم نہیں تھا کہ طبِ یونانی کے ہندستان میں لانے والے کون تھے؟

اس تمام بحث سے قطع نظر کیا آپ ایک لمحہ کے لیے بھی غور فرماسکتے ہیں کہ طبِ یونانی کا نام طبِ اسلامی کردینے کے بعد ہند میں اس طب کی کیا حیثیت باقی رہ جائے گی؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہند میں طبِ یونانی باقی رہ جائے گی تو یہ آپ کی خوش فہمی ہی ہوسکتی ہے، واقعات اس کے خلاف پیش آئیں گے۔ ہماری رائے میں تو کسی ایک فن پر جس میں انسانیت کی فلاح ہو، اور ہر مذہب کے بیمار کے لیے سامانِ شفا، مذہبی اعتبار سے غور کرنا ہی سرے سے غلط ہے۔ علم و فن کسی کی میراث نہیں ہیں۔ مسلمانوں کو کسی طرح بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ طبِ یونانی کو اپنی طب کہیں۔ ایلوپیتھی کے حاملین نے کبھی یہ دعوےٰ نہیں کیا کہ ایلوپیتھی عیسائی طب ہے۔ ایلوپیتھی کو عالم گیر بنانا ان کا مقصدِ اعلا ہے۔ وہ

اپنے فن کو مفید بنانے اور اس کی افادیت کو ثابت کرنے کے لیے آج کیا کچھ کر رہے ہیں کون ہے جو نہیں جانتا۔ ایک طرف آپ ہیں کہ فن کا دائرہ محدود کیے جا رہے ہیں۔ اصطلاحات میں الجھ رہے ہیں اور اپنی قوتوں کو غلط راستوں پر صرف کر رہے ہیں۔

یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ آپ وضع اصطلاحات میں لسے ضائع کریں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم طب یونانی کو مفید تر بنانے کے سامان پیدا کریں۔ اسے ہر ایک کے لیے فائدہ مند بنائیں۔

اسٹرپٹو مائی سین کی تیاری پر قمار بازی

قدرتی یا نباتی "پنسلین" جو پھپھوندی سے تیار کی جاتی تھی اس کی تجارتی کامیابی کو دیکھ کر امریکا کے بعض دوا سازوں نے خیال کیا تھا کہ اگر "کیمیائی پنسلین" تیار کی جائے گی تو اس کی مانگ بھی اسی قدر زیادہ ہوگی، اور اس نو ایجاد دوا کی جس کی افادی حیثیت ابھی کامل طور پر ثابت نہیں ہوئی ہے، سپلائی میں جو عالمگیری پائی جاتی ہے، اس کو پورا کر دینے سے بہت بڑی دولت حاصل ہو جائے گی۔ لیکن یہ مقصد بری طرح ناکام ہوا، اور بعض کمپنیوں کی بڑی بڑی رقمیں ڈوب گئیں۔ اب "پنسلین" کے بعد "اسٹرپٹو مائی سین" کی باری ہے۔ اس کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ "پنسلین" سے بھی زیادہ جادو اثر دوا ہے۔ اور "جرثومہ سل" جیسے خطرناک جرثومہ کو ہلاک کرتی ہے جو اب تک کسی دوسری دوا کی گرفت میں نہیں آیا تھا۔ اس دوا کا اثر بھی عملی تجربات میں ابھی مشتبہ ہے۔ مگر قمار بازی کی ذہنیت رکھنے والی امریکن دوا ساز کمپنیوں کی نگاہوں میں اس کا مستقبل اگر روشن نہیں تو تاریک بھی نہیں ہے اور انھوں نے اس دوا کی تیاری پر کافی سرمایہ لگانا شروع کر دیا ہے۔

جہاں تک انگلستان کا تعلق ہے، اگرچہ اس ملک کی وزارت صحت نے احتیاط اور انتباہ کے ساتھ یہ کہا ہے کہ دق و سل کے جرثومہ سے پیدا ہونے والے "گردن توڑ بخار" میں "اسٹرپٹو مائی سین" کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تاہم برطانیہ میں اس دوا کی تیاری ابھی محدود ہے۔ اور اتنی کم ہے کہ صرف بیسیوں گرام میں گنی جا سکتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ آیندہ سال بھی اس کی مقدار تیاری میں اضافہ نہیں ہو سکے گا اور اس وقت تک دوسرے ممالک کی طرح برطانیہ کو بھی امریکا ہی سے یہ دوا فراہم کرنی پڑے گی۔

امریکا میں "اسٹرپٹو مائی سین" کی پیداوار نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ دو سال پہلے جہاں اس کے صرف ۰۰۰، ۳ گرام تیار ہوئے تھے، وہاں اب ایک ماہ کی تیاری کی مقدار ۰۰۰، ۰۰۰، ۱ گرام ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تیاری کے میدان میں سب سے زیادہ سرگرمی "مرک اینڈ کمپنی" نے دکھائی ہے۔ جس کے ہاں "اسٹرپٹو مائی سین" کی سالانہ پیداوار کی قیمت تقریباً ۰۰۰، ۰۰۰، ۰ ڈالر بتائی جاتی ہے، یعنی موجودہ قیمت کے مطابق ۰۰۰، ۰۰۰، ۲ گرام کی مقدار۔

اس دوا کی افادیت ابھی اچھی طرح ثابت نہیں ہوئی ہے اور نہ اس کا میدان استعمال متعین ہوا ہے بلکہ اب تک اس کا نتیجہ مشتبہ خیال کیا جاتا ہے، تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکن کمپنیاں ایک

" دھندے مقصد کے لیے بھی کافی رقمیں پھینک کر ایک خیالی بازار اپنی گرفت میں لانا چاہتی ہیں۔
جیساکہ امریکا کا رسالہ " فورچون " کہتا ہے. مرک کمپنی کا جدید فیصلہ کہ وہ مزید مقدار میں اسٹرپٹو مائی سین' تیار کرے گی۔ اس اعتبار سے اور بھی حیرت انگیز ہے کہ ابھی تھوڑے ہی دن گزرے "کیمیائی پنسلین" کی تیاری میں بھی یہی پالیسی اختیار کی گئی تھی جو قطعاً ناکام ثابت ہوئی۔ تمام منصوبے خاک میں مل گئے اور بڑی رقمیں ضائع ہوگئیں۔

پنسلین کی تیاری میں قمار بازانہ غوطہ سنہ ۱۹۴۳ء میں لگایا گیا تھا جب کہ تقریباً بیس برطانی اور امریکن ریسرچ لیبوریٹریوں نے "آفس آف سائنٹی فک ریسرچ اینڈ ڈولپمنٹ" کے تعاون سے، اور ۳۵۰۰۰۰۰ ڈالر کی سرکاری امداد سے پنسلین کی کیمیائی تیاری شروع کی تھی۔ چونکہ مرک کمپنی کو پہلے کیمیائی حیاتین "ب" کی تیاری میں کامیابی ہو چکی تھی اس لیے اس نے کیمیائی پنسلین پر بھی ۵۰۰۰۰۰، ڈالر سرمایہ لگانے کا فیصلہ کیا، اس کمپنی کو اس امر کا یقین ہوگیا تھا کہ پنسلین کی تیاری کا آخری اور کامیاب ترین طریقہ یہی ہوگا کہ اسے کیمیائی ترکیب سے تیار کیا جائے۔ اس لیے اس نے وعدہ کیا تھا کہ سنہ ۱۹۴۵ء تک پنسلین کی تھوڑی مقدار نہیں بلکہ "بوتلیں" دستیاب ہونے لگیں گی اگرچہ اس طرح خالص کیمیائی پنسلین کی قلمیں تیار کی گئیں، لیکن بعد میں یہ پنسلین خراب ہوگئی، اور اس کے ذرات منتشر ہونے لگے۔ الغرض یہ تمام کوششیں بےکار ہوگئیں اور تجارتی پیمانے پر یہ کیمیائی پنسلین تیار کرنے اور فروخت کرنے کا خواب ممنون تعبیر نہ ہوا۔

لیکن اس پوری ناکامیابی اور درماندگی سے سبق حاصل نہ کرکے ایک دوسرے موقع کا خیر مقدم کیا گیا ہے اور جب "اسٹرپٹو مائی سین" کے موجد ڈاکٹر ایس. وکیس مین اپنی نوایجاد دوا کو مرک کمپنی کے پاس لے گئے تو مرک نے ایک معاہدے کے ذریعے ان کو ریسرچ کے لیے کچھ مالی اور فنی امداد دی اور اس کے بدلے میں تجارتی پیمانے پر اسٹرپٹو مائی سین کی پیداوار کا پہلا حق حاصل کیا۔
(یہ کمپنی بیرونی ریسرچ پر اور اپنی دواؤں کی معالجاتی جانچ پر ۲۵۰۰۰۰ ڈالر سالانہ خرچ کرتی ہے۔)

لیکن کچھ حالات ایسے پیش آئے کہ مرک کمپنی اس اجارہ داری کو برقرار نہ رکھ سکی اس کا سبب یہ ہے کہ ڈاکٹر وکیس مین کو لیبوریٹری کی ابتدائی جانچ اتنی امید افزا معلوم ہوئی کہ انھوں نے مرک کمپنی کو اس امر کی ترغیب دی کہ وہ سب لوگوں کے لیے اس نئی دوا کی تیاری کا دروازہ کھول دے اس لیے مرک کمپنی اپنے مخصوص حق سے دست بردار ہوگئی، لیکن اس نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ اتنی تیزی سے اسٹرپٹو مائی سین تیار کرے گی کہ دوسری کمپنیاں اس سے پیچھے رہ جائیں گی۔ دیکھیے اس نئی مہم کا کیا حشر ہوتا ہے۔

(مینوفیکچرنگ کیمسٹ)

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱	مزاج	حکیم محمد کبیر الدین صاحب
۲	ڈاکٹری کے متعلق کچھ صاف صاف باتیں	مسٹر بر زمیک فیڈن۔ امریکا
۳	فلسطین میں پھلوں کی کاشت اور انڈسٹری	مسٹر ایرک ہارڈی
۴	کجلی بن میں گلدار اور دوسرے جانوروں کے شکار کے حالات	حکیم اقبال حسین۔ ایم اے
۵	سچائی کا سیرم	ادارہ
۶	ہیرنگ مچھلیاں پکڑنا اور فروخت کے لیے تیار کرنا	ترجمہ
۷	اپنے حافظہ کو یاد رکھنے کے کرتب سکھاتیے۔	ادارہ
۸	شکر کی صفائی	ترجمہ
۹	خوشہ چینیاں	ادارہ
۱۰	چٹکلے	ادارہ
۱۱	سوال و جواب	حکیم محمد سعید۔ دہلوی


ہمدرد
ہیئر آئل
ہمدرد کوسمیٹکس
کراچی
Hair Oil

وزارتِ صحت برطانیہ کی رپورٹ سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء

مسٹر اینورین بیون - وزیرِ صحت - برطانیہ

کچھ عرصہ ہوا برطانی پارلیمنٹ میں مسٹر اینورین بیون وزیرِ صحت برطانیہ نے برطانی پارلیمنٹ میں یکم اپریل سنہ ۱۹۴۵ء سے ۳۱-مارچ سنہ ۱۹۴۶ء تک کے سال کے لیے اہلِ برطانیہ کی صحتِ عامّہ کے حالات اور اس سلسلے میں سرکاری سرگرمیوں کی ایک رپورٹ پیش کی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اس طرح کی سالانہ رپورٹ میں چیف میڈیکل افسر کی رپورٹ بھی شامل کر دی گئی ہے۔ مسٹر بیون نے اپنی صحت عامّہ کی رپورٹ کے "پیش لفظ" میں یہ کہا ہے کہ اس جدت کا مقصد یہ ہے کہ "مختلف سرکاری مطبوعات میں ایک ہی بات کو نہ دُہرایا جائے، اور صحتِ عامّہ کی حالت اور اس سلسلے میں سرکاری پالیسی اور روزمرّہ کے کاموں کی ایک جامع اور بہتر تصویر پیش کر دی جائے" مسٹر بیون کی اس سالانہ رپورٹ کا خلاصہ ہمیں وزارتِ صحت برطانیہ کے دفتر سے موصول ہوا ہے، جس کی ابتدا ان الفاظ سے کی گئی ہے کہ اگرچہ سنہ ۱۹۴۵ جنگ کی حالت سے امن کی حالت تک پہنچنے کا ایک دُشوار عبوری دَور تھا تاہم صحتِ عامّہ کو دورانِ جنگ کے چھ سال کی طرح اتنی ہی بلند سطح پر قائم رکھا گیا۔ بہرحال چونکہ اس ہلیتھ رپورٹ سے پاکستان اور ہندُستان کے موجُودہ دَور میں بھی کافی اِستفادہ کیا جا سکتا ہے اور اس ذریعے سے بہت سے کار آمد اعداد و شمار دست یاب ہوتے ہیں، اس لیے ہم اس کا مختصر ترجمہ پیش کر رہے ہیں (ہمدرد صحت)

اختتامِ جنگ کے بعد سنہ ۱۹۴۵ء میں ایک اہم ترین مسئلہ انگلستان کی وزارتِ صحت اور سرکاری معالجین کے سامنے یہ تھا کہ کثیر تعداد میں ان سپاہیوں اور جنگی قیدیوں کی واپسی کے باعث جو بہت کم زور اور ناتواں تھے، اور ہر معلوم متعدی بیماری یا "ٹراپیکل" (منطقۂ حارّہ کے) امراض میں مبتلا ہو چکے تھے، اور خطرناک جراثیم کے حامل تھے، صحتِ عامّہ کے لیے ایک شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ چیف میڈیکل افسر، سر ولسن جیمیس فرماتے ہیں کہ "یہ مسئلہ کامیابی سے حل کر لیا گیا اور وزارتِ صحت کے شعبۂ اطلاعات اور شعبۂ امراضِ متعدی نے ایسی زبردست نگرانی کی اور ان کے ساتھ ساتھ بندرگاہوں اور مختلف اندرونی اضلاع کے میڈیکل افسروں نے ایسی ہوشیاری اور مکمل دیکھ بھال سے کام لیا کہ ٹائی فس بخار اور چیچک اور ملیریا جیسے خطرناک حملہ آوروں کو قدم جمانے اور آگے بڑھنے کا ذرا بھی موقع نہیں دیا گیا۔"

ہوائی سفر اور صحتِ عامّہ کے مسائل

ہوائی سفر "ہوائی بندرگاہوں" اور ہوائی اسٹیشنوں سے صحتِ عامّہ کے مسائل کس طرح پیدا ہو رہے ہیں اور بڑھتے جا رہے ہیں، اس کی چند مثالیں بھی اس رپورٹ میں پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ دو سپاہی جب نیپلز (اٹلی) سے ہوائی جہاز پر انگلستان آئے تو وہ چیچک میں مبتلا پائے گئے اور ان کی بیماری

نے ان کے وہاں پہنچنے کے بعد شدت اختیار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چیچک متعدی شکل میں پھیلنے لگی اور چار مزید اشخاص مبتلا ہو گئے، لیکن فوراً ہی اس کی روک تھام کی گئی اور سنہ ۱۹۴۵ء میں کوئی پانچواں شخص اس بیماری میں مبتلا نہ ہوا۔ ایک تیسرا مریض جو ۹ دسمبر کو ہندستان سے آیا تھا وہ ایک متعدی بیماری میں مبتلا تھا لیکن اس بیماری کو بھی پھیلنے نہ دیا گیا۔

جو مسافر ہوائی جہازوں سے آتے ہیں ان کی مناسب دیکھ بھال کی راہ میں بہت سی مشکلات حائل ہیں۔ اب یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ باہر سے آنے والے ہوائی مسافروں کو ایک چھپا ہوا کارڈ دے دیا جاتا ہے جس پر انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ایک نوٹس درج ہے۔ اس میں مسافروں کو یہ انتباہ دیا گیا ہے کہ باہر کے ممالک میں یہ ممکن ہے کسی متعدی بیماری سے ان کو واسطہ پڑا ہو، اور اس کا ان کو علم نہ ہو۔ اس لیے اگر اکیس روز کے اندر وہ بیمار پڑیں تو فوراً کسی ڈاکٹر سے مشورہ کریں اور یہ کارڈ اسے دکھا دیں۔

شرح اموات میں کمی کا ریکارڈ

صحت کی عام سطح اچھی ہونے کے علاوہ سنہ ۱۹۴۵ء کو ایک خاص اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ بچوں اور ماؤں کی شرح اموات میں کمی کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے۔

(۱) اطفال

لڑکوں اور لڑکیوں کی ہر عمر میں یعنی ۱ سے ۵، ۵ سے ۹، اور ۹ سے ۱۴ سال کی عمر تک بیماری کے باعث شرح اموات کی سطح بہت نیچی ہو گئی۔ سنہ ۱۹۴۴ء کے مقابلے میں یہ سطح کافی نیچی تھی اور سنہ ۱۹۳۹ء کی بہ نسبت اور بھی زیادہ نیچی ثابت ہوئی۔

لیکن شیر خوار بچوں کی شرح اموات (۴۶ فی ہزار) سنہ ۱۹۴۴ء کی شرح (۴، ۴۵ فی ہزار) کی بہ نسبت کسی قدر زیادہ تھی۔ لیکن اس سے پہلے کے ہر سال سے کم تھی۔ مُردہ بچوں کے پیدائش کی شرح (۲۸ فی ہزار) میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن پچھلے دو سال میں ۲۸ فی ہزار کی شرح ۱۹۳۵ء میں ۴۱ فی ہزار کی شرح سے بہت کم ہے۔

(۲) مائیں

زچگی کی شرح اموات جو سنہ ۱۹۴۱ء میں ۲، ۸۰ فی ہزار رہی، تمام پچھلے ریکارڈ وں میں کم سے کم ہے۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں یہ شرح اموات ۱، ۹۲ فی ہزار تھی۔ یہ اعداد زچگی کی خدمات انجام دینے والوں کے لیے بہت قابلِ تحسین ہیں، بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ زچگی کے ہسپتالوں میں پلنگ بہ مشکل دستیاب ہوتے تھے، اسٹاف بھی کم تھا اور حالات بھی مشکل پیدا کرتے تھے۔

پیدائش و اموات کی عام شرح

یہ اعداد و شمار بھی تسلی بخش رہے۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں شرح پیدائش ۷، ۱۷ فی ہزار تھی جو سنہ ۱۹۲۶ء سے اس وقت تک سب سے زیادہ سمجھی جاتی تھی، لیکن سنہ ۴۵ء میں یہ شرح ۹، ۱۵ ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کمی مارچ ۱۹۴۵ء میں زیادہ نمایاں ہوئی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ وقت وہ تھا جب کہ فوجیوں کی بہت سی تعداد کو غیر ممالک میں روانہ ہونے کے بعد ۹ ماہ کی مدت گزر چکی تھی۔

شہریوں کی شرح اموات جن میں جنگی اسباب سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد بھی شامل ہے، ۶، ۱۲ فی ہزار رہی۔ یہ پچھلے تین سال کی شرح اموات سے کسی قدر کم تھی۔ سڑکوں کے حادثات سے ۲، ۴۵ آدمی

ہلاک ہوئے۔ یہ شرح بھی پہلے کی بہ نسبت کم تھی۔

انفلوئنزا اور دیگر امراض ہیلتھ رپورٹ میں یہ تذکرہ خاص طور پر کیا گیا ہے کہ پچھلے دنوں پندرہ سال سے کم عمر لڑکوں میں خسرہ اور لال بخار سے اموات بہت کم ہوئیں اور یہ ایک بڑی خوش نصیبی تھی کہ دورانِ جنگ میں انفلوئنزا کے حملے زیادہ وسیع نہ ہوئے متعدی اور معائی بخاروں کی روک تھام بھی کی گئی۔ ذیابطیس اور نمونیا کے باعث شرح اموات میں کمی ہوئی اور دق وسل کے حملوں میں بھی پہلے کی بہ نسبت کمی پائی گئی۔ انفلوئنزا سے پورے سال کے اندر صرف ۲۹۸۶ اموات ہوئیں۔ گزشتہ تیس سال کے اندر یہ ریکارڈ کم ہے۔ خناق کے ۱۸۵۹۶ حملوں اور اس کے باعث ۷۲۲ اموات کی اطلاع ملی۔

امراض خبیثہ یعنی جنسی یا تناسلی امراض میں کسی قدر اضافہ ہوا لیکن کلینکوں میں آکر معائنہ کرانے والوں کی کثیر تعداد (۴۵۹۵۴۸) سے معلوم ہوا کہ لوگ طبی امداد اور علاج کا فائدہ جلد از جلد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اگر آبادی کی مختلف جماعتوں کی حالت تغذیہ کے متعلق کلینکی دیکھ بھال اور اسکولوں کے طلبا کے جسمانی وزن کو قابلِ اعتبار علامتیں سمجھا جائے تو انگلستان کی حالتِ تغذیہ کو بھی مجموعی طور پر اچھا سمجھا جاسکتا ہے۔ رپورٹ کہتی ہے "اسکول کے لڑکوں کے نشوونما میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۰ میں یا زمانۂ قبل از جنگ کی بہ نسبت سنہ ۱۹۴۵ء کے لڑکے بہتر جسمانی طاقت و صحت کے مالک تھے۔

رپورٹ میں دائیوں اور نرسوں کی کمی کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مارچ ۱۹۴۶ء کے آخر میں نرسوں کی ۵۰۰ ۳۴ جگہیں انگلستان اور ویلز میں خالی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہسپتالوں کے بہت سے وارڈ بند کر دیئے گئے تھے اور مریضوں کو داخلہ کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ مزید ہسپتالوں میں کام کرنے والے ملازمین کی بھی ۵۰۰ ،۱۷ جگہیں خالی تھیں۔

رپورٹ کا دوسرا حصہ رپورٹ کے دوسرے حصے میں وزارتِ صحت کے عام کاموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ امراض کے اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں اور دوسرے متعلقہ حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بعض اہم معلومات کا خلاصہ مندرجۂ ذیل ہے:۔

متعدی امراض چیچک سے صرف ۴ اموات ہوئیں۔ سنہ ۴۰ء کے اواخر میں مرض خناق سے عوام کا تحفظ کرنے کے لیے سرگرمیاں شروع کی گئی تھیں جو بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ اموات کی تعداد میں جو کمی واقع ہوئی وہ سنہ ۱۹۴۱ء سے اور اس کے بعد کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔

سنہ ۱۹۴۱ء:- ۲۶۴۱ سنہ ۱۹۴۲ء:- ۱۸۲۷ سنہ ۱۹۴۳ء:- ۱۳۷۱ سنہ ۱۹۴۴ء:- ۹۳۴
سنہ ۱۹۴۵ء:- ۷۲۲۔

مرض خناق کے باعث ۱۵ سال سے کم عمر والے بچوں کی شرح اموات جو سنہ ۱۹۴۱ء میں ۲۸

سنہ ۱۹۴۴ء میں ۹،۲ تھی، کم ہو کر سنہ ۱۹۴۵ء میں ۷،۶ فی لاکھ ہو گئی۔ اندازہ کیا گیا ہے سنہ ۱۹۴۵ء کے آخر میں ۰۰۰،۸۰،۷۰۹ بچوں کو اس بیماری سے "محفوظ" کر دیا گیا ہے۔ لال بخار (سکارلیٹ فیور) سے صرف ۸۴ اموات ہوئیں۔ خسرہ کے حملے بڑی کثیر تعداد میں یعنے ۴۶۶،۷۹۶ ہوئے، لیکن شرح اموات بہت کم یعنے صرف ۰،۱۶ رہی۔ کالی کھانسی کے ۶۲،۶۹۱ حملوں کی اطلاع ملی اور اس مرض سے ۶۹۸ اموات ہوئیں۔ انفلوئنزا کے متعلق اوپر کہا جا چکا ہے کہ اس کے حملوں کا ریکارڈ خاص طور پر کم رہا۔ اس سلسلے میں آسٹریلیا، کناڈا اور جنوبی افریقہ سے "وایرس۔ لے۔ ویکسین" کی پانچ لاکھ "خوراکیں" آئی تھیں۔ مگر چونکہ انفلوئنزا متعدی صورت میں پھیلا ہوا نہیں تھا، اس لیے اس ٹیکہ کے اثرات کو جانچنے کا موقع نہیں ملا۔ "گردن توڑ بخار" اور ٹائی فائڈ کے حملوں میں بھی کمی ہوتی گئی۔ مگر بچپش میں ۱۹،۲۷۸ آدمیوں کے مبتلا ہونے کی اطلاع ملی۔ ملیریا بخار میں سات آدمی مبتلا ہوئے۔ دق دسل کے حملوں میں کمی رہی اور جنسی امراض مثلاً سوزاک اور آتشک کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۴۵ میں ایسے امراض کے علاج کے لیے "پنیسلین" بھی دست یاب ہونے لگی۔

امراض کے سلسلے میں ایک اہم اطّلاع یہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۵ء میں مرض سرطان کی شدت اور حملوں کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا۔ فوجیوں کو چھوڑ کر صرف شہریوں میں ۷۲،۵۳ آدمی اس بیماری سے ہلاک ہوئے۔ یہ تعداد سنہ ۱۹۴۴ کی بہ نسبت ۲۰۶۵ زیادہ تھی۔ کہنہ وجع المفاصل کے مریضوں کے لیے بہتر تشخیص اور علاج کی ایک سکیم وزارت صحت کی "میڈیکل ایڈوائزری کونسل" نے تیار کی اور مختلف علاقوں کے میڈیکل افسروں کو ہدایت کی گئی کہ ہسپتالوں کے ذمہ دار افسروں کا تعاون حاصل کر کے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔

زچگی اور بہبودِ اطفال سنہ ۱۹۴۵ء میں "اموات زچگی" کی شرح صرف ۱،۸۰ فی ہزار رہی، اور بچے کی پیدائش کے وقت سمیّت کے پھیلنے سے اموات کی شرح اور بھی کم یعنے ۰،۴۴ تھی۔ لیکن ایک سال سے کم عمر والے بچوں کی شرح اموات میں اضافہ ہوا۔ یہ شرح ۱۹۴۴ء میں ۴۵،۴ فی ہزار تھی جو سنہ ۱۹۴۵ء میں ۴۶،۰۰ فی ہزار ہو گئی۔ اس اضافے کو جنگ کے آخری اثرات پر محمول کیا جاتا ہے۔

وزارتِ غذا نے حاملہ عورتوں اور پانچ سال سے کم عمر والے بچوں کے تغذیہ کے لیے جو سکیم بنائی تھی اس کا ایک جزو یہ تھا کہ ان کو دودھ اور انڈوں کی سپلائی میں ترجیح کا حق دیا جائے۔ یہ اسکیم سنہ ۱۹۴۵ء میں بھی جاری رہی۔ مزید برآں اُن کے لیے سنترہ کا مرکز افشردہ، روغن جگر ماہی اور حیاتینوں کی ٹکیاں بھی مہیا رکھی گئی تھیں۔ لیکن موخر الذکر کی مانگ بہت زیادہ ہوئی یعنے روغن جگر ماہی کی سپلائی کی مقدار سے ۲۵ فی صدی اور سنترے کا افشردہ ۴۴ فی صدی اور حیاتین الف، و دکی ٹکیاں ۴۷ فی صدی طلب کی گئیں۔ زچگی کے لیے ہسپتالوں میں مزید گنجائش کا مطالبہ بڑھتا گیا۔ اور بعض ہسپتالوں کے "جنرل وارڈ" کو "زچگی وارڈ" میں مبدّل کیا گیا۔ لیکن دائیوں اور نرسوں کی کمی اس شعبے کی ترقی کی راہ میں حائل رہی اور اب بھی حائل ہے۔

عام غذا اور تغذیہ آبادی کی مختلف جماعتوں میں حالت تغذیہ کی کلینکی جانچوں سے یہ معلوم ہوا

کہ ان ۸۰۳۹۵ آدمیوں میں جن کا معائنہ کیا گیا ۹۴ فی صد کی حالت "اچھی" تھی۔ ۵.۷ کی حالت "خاصی" تھی، اور ۰.۳ کی حالت "ناقص" تھی۔ غذائی اشیاء کی کمی کے باعث لوگوں کو وسیع پیمانے پر "حیاتینیں" کھلانے کے سلسلے میں جو تجربات کیے گئے، ان سے ظاہر ہوا کہ زمانہ جنگ کی مختلف قسم کی کم زور گھریلو غذاؤں پر حیاتینوں کا اضافہ بنیادی تغذیہ کے لیے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔

ہسپتالوں کے نقائص دس مخصوص علاقوں کو منتخب کرکے مختلف ہسپتالوں کے حالات کی اچھی طرح جو چھان بین کی گئی، ان کا خلاصہ بھی اس رپورٹ میں شامل ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ "قوم کے لیے ابھی بڑے بڑے کاموں کی انجام دہی باقی ہے اور ہسپتالوں کے سسٹم میں بہت سے ایسے نقائص موجود ہیں جن کا علم ہمیں جنگ سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ ان میں چند اہم نقائص یہ ہیں کہ مریضوں کے لیے پلنگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہسپتالوں کی موجودہ عمارتیں دقیانوسی اور قابلِ ترک قسم کی ہیں، شہروں اور قصبوں کے ایسے علاقوں میں ہسپتال واقع ہیں جہاں شور و غل ہوتا ہے۔ ان کا رقبہ بھی ناکافی ہے اور ان میں بھیڑ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نرسوں اور داخلی اسٹاف کے لیے قیام گاہیں ناکافی اور خراب ہیں اور ان رقبوں میں ہسپتال اور اس کی عمارتوں کو وسیع کرنے کی جگہ باقی نہیں ہے۔ اس رپورٹ میں مخصوص ماہرانہ علاج اور متعدی امراض کے ہسپتالوں پر بحث کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ "جانچ کرنے والے اشخاص موجودہ حالتوں کو ناتشفی بخش سمجھتے ہیں۔" مزید برآں یہ اہم بحث بھی پیش کی گئی ہے کہ میڈیکل طالب علموں کو زیادہ تر "شدید امراض" کے علاج کی تعلیم دی جاتی ہے اور "کہنہ امراض" کی طرف کافی توجہ نہیں دی جاتی۔

"بحالی" کی اسکیم اور "نقل خون" کی سروس معذور اشخاص کے لیے روزگار مہیا کرنے کا جو قانون سنہ ۱۹۴۴ء میں پاس ہوا تھا اس کے نفاذ میں یہ ضرورت پڑی کہ ہسپتالوں میں "بحالی" (REHABILITION) کے شعبے کافی تعداد میں کھولے جائیں۔ اس ترقی کی راہ میں مکانی گنجائش اور تعلیم یافتہ اسٹاف کی کمی سنہ ۱۹۴۵ء میں ایک رکاوٹ بنی رہی۔ وزارتِ صحت نے یہ سفارش کی کہ ہر ہسپتال میں داخلی مریضوں کی "بحالی صحت" کے لیے کافی آسانیاں بہم پہنچائی ہیں اور خارجی مریضوں کے لیے بحالی صحت کے مرکز ہر شہر اور ہر قصبہ میں پورے طبی اسٹاف کے ساتھ قائم کیے جائیں اور مقامی ہسپتالوں سے انھیں وابستہ رکھا جائے اور ہر بڑے ہسپتال کے رقبے میں ایک مرکز بحالی ایسا ہو جس میں دیر تک زیر علاج رہنے والے مریض قیام کرسکیں اور اس کے علاوہ مخصوص قسم کی معذوری کے سلسلے میں مریضوں کی بحالی صحت کے خاص انتظامات کیے جائیں۔

"نقل خون"، کی اسکیم کے سلسلے میں وزیر صحت کی خواہش یہ تھی کہ وسیع پیمانے پر "نقل خون" کی ایک قومی سروس" قائم کی جائے۔ اس کام میں "خون کی سپلائی کے فوجی ڈپو" واقع برسٹل سے ان کے ذخیروں کا چارج لینے اور لندن کے "خون کے بنکوں" کو از سرِ نو ترتیب دینے میں سخت تنظیمی قابلیتوں کی ضرورت ہوئی لیکن ایک خاص مشکل یہ آپڑی ہے کہ چونکہ زمانۂ جنگ کا جذباتی جوش ختم ہوچکا ہے، اس لیے خون دینے والوں کی تعداد میں بڑی کمی ہوتی جارہی ہے۔

اعداد و شمار اور ماہانہ ریکارڈ۔ بیماریوں کے جو اعداد و شمار سرکاری اطلاعات کے ذریعہ آتے

ہیں وہ کافی نہیں ہوتے۔ اس لیے اس خلا کو پُر کرنے کی ایسی ترکیب نکالی گئی کہ تمام ہسپتال اپنے داخلی مریضوں کے ریکارڈ کا خلاصہ ایک خاص شکل میں معین فارموں پر درج کر کے ایک مرکزی دفتر اعداد و شمار کے پاس بھیج دیا کریں۔ اس کے علاوہ ان بیماریوں کی ماہانہ رپورٹوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا گیا۔ اس ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوری اور فروری میں مریضوں کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔

اس سال انگلستان اور ویلز میں عام بارش ۳۲٫۳ انچ تھی۔ یہ سنہ ۱۸۸۱ سے سنہ ۱۹۱۵ تک کے دس سالہ اوسط سے ۹ فی صدی کم ہے۔ نومبر کا مہینہ سب سے زیادہ خشک تھا۔ بلکہ گزشتہ دو سو برس میں یعنی ۱۷۲۷ء سے سنہ ۱۹۴۵ء تک ماہ نومبر میں فقدانِ باراں کا ایسا کوئی ریکارڈ نہیں پایا جاتا۔ اس لیے پانی کی سپلائی کی اسکیموں پر بھی اثر پڑا ہے۔ مگر یہ تجربہ آیندہ کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

"آؤٹ ڈور" یعنے خارجی مریضوں کی طبی امداد پر ۱۰۰۸۶۰،۳۱۷ پونڈ خرچ ہوئے یہ رقم ۱۹۴۴ء کی رقم سے ۸۰۵،۲۰۷ پونڈز زیادہ تھی۔ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء میں اس طرح کی طبی امداد حاصل کرنے والوں کی تعداد ۲۳۰،۷۸۹ تھی۔

زیر نظر رپورٹ میں عوام کی سکونت اور مکانات کی فراہمی پر بھی کافی بحث کی گئی ہے۔ مگر ہم اس مضمون کو زیادہ طویل بنانا نہیں چاہتے +



بھئی کیا کہنے ہیں! شاباش کمال کر دیا! لو دوسرے ہاتھ سے بھی کرو۔

دُنیا کے لیے تیل اور چربی کی فراہمی !!

لیور برادرز لمیٹڈ انگلستان کی ایک مشہور صابن ساز اور روغن فروش کمپنی ہے جس نے اپنی پیداوار کی عالم گیر فروخت کے باعث ایک طرح کا "صنعتی امپائر" قائم کرلیا ہے جس شخص نے "سن لائٹ" صابن دیکھا ہوگا اس نے "لیور برادرز" کا نام بھی ضرور سنا ہوگا۔ دنیا کے تمام ممالک میں اس کمپنی کی شاخ، بلکہ "شاخ در شاخ" قائم ہے۔ مسٹر جیفری ہیورتھ اس "صنعتی امپائر" کے چیرمین ہیں، اس لیے دنیا کے ایک اہم ترین وقتی مسئلہ پر اپنی کمپنی کے سالانہ جلسہ میں جو کچھ کہا ہے اُسا کو بڑی وقعت اور اہمیت حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ تیل اور چربی کی سپلائی کے بغیر جدید دنیا کا کوئی کام نہیں چل سکتا اور نہ کسی طرح کی مشین کام کرسکتی ہے +

مسٹر ہیورتھ نے اس عالم گیر مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے سب سے پہلے اپنا یہ اندازہ پیش کیا کہ اس سال (سنہ ۱۹۴۶ء) دنیا میں ۴،۰۰۰،۰۰۰ ٹن تیل اور چربی کی کمی ہوگی۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے انھوں نے چند اہم اعداد و شمار سے کام لیا۔ گزشتہ جنگ سے پہلے دنیا میں تیل اور چربی کی پیداوار ۲۰،۰۰۰،۰۰۰ ٹن تھی۔ اب اس میں ۲،۵۰۰،۰۰۰ ٹن کی کمی ہوگئی ہے۔ دوسری طرف زمانۂ قبل از جنگ کے مقابلے میں اب دنیا کی آبادی ۸ فی صدی بڑھ گئی ہے اس لیے ۱،۵۰۰،۰۰۰ ٹن مزید تیل اور چربی کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے پیداوار کی موجودہ کمی اور متوقع مزید مانگ کی مقداروں کو جوڑنے سے ۴،۰۰۰،۰۰۰ ٹن کی کمی ظاہر ہوتی ہے۔

اس صورتِ حال کا پس منظر یہ ہے کہ دورانِ جنگ میں چونکہ جرمنی نے یورپین ممالک پر قبضہ کرلیا تھا، اور دنیا کے بازار سے ایک بڑا حصہ جو ۲،۰۰۰،۰۰۰ ٹن سالانہ تیل اور چربی خرچ کرتا تھا منقطع ہوگیا، اس لیے تیل اور چربی کی ایک عارضی بہتات رونما ہوگئی تھی۔ لیکن دوسری طرف یہ اثر تیزی سے اس لیے زائل ہوگیا کہ جاپان نے مشرقِ بعید کے ممالک پر قبضہ کرلیا جو بین الاقوامی تجارت میں داخل ہونے والے ۵،۵۰۰،۰۰۰ ٹن میں سے ۱،۷۵۰،۰۰۰ مہیا کرتے تھے۔ مزید برآں فرانسیسی مغربی افریقہ میں تیل کی پیداوار کم ہوگئی تھی، اور ایندھن نہ ہونے کے باعث ارجنٹائنا میں لوگ السی اور دوسرے روغن دار اناج جلانے لگے تھے، اور ویل مچھلی کے شکار کا کاروبار بھی جس سے دنیا کو ۵۰۰،۰۰۰ ٹن ویل آئل سالانہ ملا کرتا تھا، قطعاً بند ہوگیا تھا۔ اس لیے اگر دورانِ جنگ کے نقشے میں اگر کوئی امید افزا چیز تھی تو صرف یہ تھی کہ سنہ ۱۹۴۳ اور ۱۹۴۴ء میں ولایاتِ متحدہ امریکا کی حوصلہ افزائی اور بڑی قیمت پیش کرنے کے باعث اُس ملک میں تیل کی پیداوار ۱۰،۰۰۰،۰۰۰ یا اس سے کچھ زیادہ مقدار میں بڑھ گئی تھی۔

جنگ کے ختم ہونے پر امید کی جاتی تھی کہ جب مشرقِ بعید کے آزاد شدہ ممالک پھر تیلوں کی برآمدی تجارت شروع کریں گے تو پیداوار تیزی سے بڑھ جائے گی۔ لیکن یہ اُمید خاک میں مل گئی۔ جزیرہ سماٹرہ کی

سیاسی ہلچل نے ہر چیز کی برآمد کو روک دیا۔ ملایا کا یہ حال ہو گیا کہ سنہ ۱۹۳۸ء کے ۱۳۰،۰۰۰ ٹن کے مقابلے میں وہ صرف ۵۰،۰۰۰ ٹن برآمد کرنے لگا۔ منچوریا جو پہلے ۵۰۰،۰۰۰ ٹن تیل برآمد کرتا تھا اب صرف چند ہزار ٹن سویابین بھیجتا ہے جس سے روغن کی کم مقدار نکلتی ہے۔ ڈچ جزائر شرق الہند جنگ سے پہلے ۳۶۰،۰۰۰ ٹن برآمد کرتے تھے، اب صرف ۱۰۰،۰۰۰ ٹن سپلائی کرتے ہیں۔ متحدہ ہندوستان سے تیل اور روغنی اجزا کی برآمد جنگ سے پہلے ۴۰۰،۰۰۰ ٹن تھی، اب صرف ۱۴۰،۰۰۰ ٹن ہے اور یہ مقدار بھی ملکی اور مقامی ضرورتوں میں اضافے کے باعث گھٹتی جائے گی، یہاں تک کہ متحدہ ہندوستان سے تیل کی برآمد بالکل ختم اور ناپید ہو جائے گی۔ اب صرف جزائر فلپائنز سے کچھ بہتر امید ہے۔ یعنی قبل از جنگ کی شرح برآمد ۳۷۵،۰۰۰ ٹن سالانہ کے مقابلے میں اس سال وہ ۶۰۰،۰۰۰ ٹن برآمد کرنے والے ہیں۔

جنگ سے پہلے مغربی یورپ کی روغنی پیداوار صرف حیوانی چربیوں کی شکل ہوتی تھی۔ چوں کہ وہاں غذائی چیزوں کی کمی ہے اس لیے قبل از جنگ کی برآمدی مقدار تک پہنچنے میں بہت دیر لگے گی اور بین الاقوامی معاہدے کے مطابق وہیل مچھلیوں کے تیل کی بھی ۵۰۰،۰۰۰ ٹن سے زیادہ مقدار حاصل نہیں کی جا سکتی۔

مسٹر ہیورتھ نے اس کے بعد یہ بتایا کہ پیداوار کی کمی کی طرح قیمت کی زیادتی اور کرنسی کی کمی بھی روغن اور چربی کی سپلائی کی راہ میں حائل ہے۔ مثلاً ولایاتِ متحدہ امریکا میں اگر چربی کی قیمت ۷۰ پونڈ فی ٹن ہے تو ارجنٹائنا ۱۲۰ پونڈ فی ٹن طلب کرتا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اگر یہ چیز پوری مقدار میں دست یاب بھی ہو، جب بھی مغربی یورپ اپنی ضرورت بھر نہیں خرید سکتا۔

قیمتوں میں غیر معمولی اضافے کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ حکومتیں اپنے لیے تیل کی فراہمی میں ذرا بھی کمی کرنا نہیں چاہتیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سپلائی کی مقدار جب آخری حد کے قریب پہنچتی ہے تو اپنی معینہ مقدار کو کسی طرح پورا کر لینے کے لیے حکومتیں بہت بڑھی ہوئی قیمتیں بھی ادا کرنے سے دریغ نہیں کرتیں۔ مثلاً برطانیہ اپنے مطلوبہ روغنوں اور چربیوں کی آخری دس فی صدی مقدار کی خریداری کے لیے جو قیمت ادا کرتا ہے وہ باقی نوے فی صدی مقدار کی قیمت سے تین گنی ہوتی ہے۔ غالباً سیاسی اعتبار سے مطلوبہ مقدار میں کمی کی بھی نہیں جا سکتی۔ لوگوں کو اس امر سے آگاہ کرنے کا کہ ملک کو کس طرح تاوان ادا کرنا پڑ رہا ہے، ایک طریقہ یہ ہے کہ غذائی فراہمی کے لیے ۴۵،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ کی جو سالانہ امدادی رقم ان دنوں حکومت کی طرف سے ادا کی جاتی ہے وہ بند کر دی جائے۔ بہرحال امریکا اور جزائر فلپائنز اپنے تیلوں کی کچھ زیادہ مقدار برآمد کے لیے پیش کریں تو معینہ مقدار کے آخری حصے کی فراہمی کے لیے جو غیر معمولی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس کی تخفیف میں بڑی مدد ملے گی۔

فراہمی کے براہِ راست طریقوں پر بحث کرتے ہوئے مسٹر ہیورتھ نے پہلے وہیل مچھلی کے تیل کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر وہیل مچھلیوں کے شکار پر عائد کردہ پابندیاں دو تین سال کے لیے اٹھا دی جائیں تو ۱۰۰،۰۰۰ ٹن زیادہ تیل حاصل کیا جا سکتا ہے، اس سے مغربی یورپ کے لیے مالی آسانیاں پیدا ہوں گی۔ اس کے علاوہ اگر معدنی تیلوں سے بلا صابن والے مصفی اجزا پیدا کیے جائیں تو اس سے بھی بڑی مدد مل سکتی ہے۔

امریکا میں "صاف کرنے والے اجزا" (DETERGENT) کی تقریباً دس فی صدی مقدار بے صابن والی ہوتی ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ سب کے سب معدنی تیلوں سے تیار ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس سے ۸۰۰۰۰ ٹن چربی کی سالانہ بچت ہو سکتی ہے۔ خود "لیور برادرز" کے پاس اس قسم کی چند پیداواریں بازاروں کے لیے موجود ہیں اور اگر بعض کیمیائی اشیا اور پیک کرنے کا سامان مزید مقدار میں حاصل ہو سکے تو ان چیزوں کی تیاری میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ہالینڈ میں بھی یہ کام جاری کیا گیا ہے جس سے آئندہ سال یورپ کو ۵۰۰۰۰ ٹن تیلوں اور چربیوں کی بچت ہوگی۔ اگرچہ یہ مقداریں بھی اہمیت رکھتی ہیں، مگر ہمیں ان کو دنیا میں صابن کی مجموعی پیداوار کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ جنگ سے پہلے تمام ممالک کی صابن سازی کی مجموعی پیداوار ۶۰۰۰۰۰۰ ٹن سالانہ تھی، جس میں تیلوں اور چربیوں کی ۳۰۰۰۰۰۰ ٹن مقدار صرف ہوتی تھی۔

نئے ذرائع کی ترقی مشرقِ بعید کے ممالک میں تیلوں کی سپلائی بڑھانے کی ضرورت پر (جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے) روشنی ڈالنے کے بعد مسٹر ہیور تھ نے یورپ میں نئے ذرائع پیدا کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ دو طریقوں سے یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ مونگ پھلی، سورج مکھی، سرسوں، سویابین اور السی وغیرہ کی سالانہ کاشت بڑھائی جائے۔ دوسرے یہ کہ تاڑ، ناریل اور روغنی پھلوں والے دوسرے درخت لگائے جائیں۔ مشرقی یورپ میں صرف السی اور سرسوں کی کاشت ہو سکتی ہے۔ برطانیہ میں السی کی کاشت میں اضافہ کیا جا رہا ہے تاکہ سنہ ۱۹۵۱ء تک ۶۰۰۰۰ ٹن تیل حاصل کیا جا سکے۔

لیکن مسٹر ہیور تھ کے خیال میں بنیادی اسکیمیں یہ ہونی چاہییں کہ غیر آباد زمینوں کو قابلِ کاشت بنا کر ان سے روغنی بیجوں کی فصلیں حاصل کی جائیں۔ ان دنوں دنیا کی قومیں تیل حاصل کرنے کے لیے کس درجہ بے چین ہیں، یہ امر اسی سے ظاہر ہے کہ برطانی حکومت نے مشرقی افریقہ میں مونگ پھلی کی کاشت کی ایک وسیع اسکیم جاری کی ہے جس کے ذریعے ۳٫۲۵۰۰۰۰ ایکڑ زمین سے ۸۰۰۰۰ ٹن تیل حاصل کیا جائے گا۔ ایک دوسرا برطانی مشن اسی مقصد کے لیے جلد ہی گولڈ کوسٹ اور نجیریا کو اور ایک ڈچ مشن مشرقی انڈونیشیا کو جانے والا ہے۔ ایک فرانسیسی کمیشن بھی فرانسیسی افریقہ میں حالات کا معائنہ کر رہا ہے اور سینیگل میں مونگ پھلی کی کاشت کو وسیع ترقی دینے کی اسکیم اس کے زیرِ غور ہے۔ تاڑ اور ناریل وغیرہ کے درختوں سے تیل حاصل کرنے میں سات سال سے لے کر دس سال تک کی مدت صرف ہوتی ہے، مگر نتیجے کے فائدہ بخش ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

اپنی پیش کردہ تجویزوں کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے مسٹر ہیور تھ نے دنیا میں تیل اور چربی کی فراہمی کے لیے مندرجۂ ذیل نکتے مختصر الفاظ میں پیش کیے:-

(۱) اگرچہ مغربی یورپ میں کنٹرول سسٹم ابھی منسوخ نہیں کیا جا سکتا، تاہم اس کو اس طرح کام میں لایا جا سکتا ہے کہ خام اشیا کی خریداری میں مدد ملے اور تیار شدہ مال کے لیے امدادی رقمیں بند کر دی جائیں۔

(۲) یورپ میں تیل اور روغن کی مقامی پیداواروں کو بڑھانا چاہیے۔

(۳) ان سمندر پار والے مشرقی ممالک میں جو جنگ سے پہلے تیل برآمد کرتے تھے پیداوار اچھی طرح بڑھائی جائے۔

(۴) غیر آباد زمینوں کو قابلِ زراعت بنا کر ان سے روغن دار بیجوں کی بڑی بڑی فصلیں حاصل کی جائیں۔

(۵) "مصفّی اجزا" کو معدنی تیلوں سے حاصل کیا جائے۔

(باقی بر صفحہ ۳۴)


AKHLAQ 40.

لیجیے ہم اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ
آئندہ کیا ہوگا؟

یہ دنیا بہت سے "دوروں" سے گزر چکی ہے۔ ابتدائی زندگی کے بعد جب انسان ضرورتوں سے مجبور ہوکر تمدن کی پہلی ارتقائی منزل میں داخل ہوا تو اس نے پتھر اور چقماق کے حربے اور اوزار بنانے شروع کیے، اسی لیے اس کو "دورِ حجریہ" (STONE AGE) کہا جاتا ہے۔ پھر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا لوہے اور فولاد اور کوئلے کے دور آئے۔ مشین چلانے کے لیے تیل کی کثیر مقداروں کی ضرورت ہوئی اور دنیا میں ہر طرف تیل کے چشموں کی جستجو ہونے لگی اس طرح ایک "تیل کا دور" بھی آیا، اور اسی کے پیچھے پیچھے ایک دور "سرعتِ رفتار" کا آیا، جب کہ دنیا میں فاصلے کا تخیل ختم ہونے لگا۔ اب جو جدید دور گزر رہا ہے اس کو "جوہری دور" (ATEMIC AGE) کہتے ہیں۔ اس کا سبب آپ کو معلوم ہے یعنی اس زمانے میں "ایٹم" کی بے پناہ اور غیر محدود طاقت دریافت کی گئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ دنیا کی ارتقائی منزلیں ابھی ختم نہیں ہوتی ہیں۔ جوں جوں یہ منزلیں طے ہوتی ہیں آج کی ہر بڑی اور حیرت انگیز چیز کل چھوٹی اور معمولی دکھائی دینے لگتی ہے۔ جوہری انرجی کی دریافت نے آج دنیا کو مبہوت کر دیا ہے۔ مگر شاید بہت دن نہیں گزریں گے کہ دوسری دریافتیں آپ کی حیرت اور استعجاب کے لیے اس سے بھی بڑا ذخیرہ پیش کریں گی۔

اس مضمون میں آپ جو کچھ بھی پڑھیں گے آپ کے لیے ایک نئی سی بات معلوم ہوگی۔ بعض کو آپ ایچ۔ جی۔ ویلز کی مشہور خیالی باتوں سے بھی زیادہ "خیالی" سمجھیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ شائع کیا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے متعلق ماہرینِ سائنس کی تحقیقی سرگرمیاں اس وقت جاری نہ ہوں۔ آپ جس دنیا میں داخل ہو رہے ہیں اس کے لیے یہ ایک نشانِ راہ کا کام دے گا۔ اور آپ کو معلوم ہوگا کہ زندگی و حیات کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا نئے سامان مہیا ہونے والے ہیں۔ (ہمدرد صحت)

اگر پچھلی عالمگیر جنگ سے پہلے آپ نے سائنس کی رفتارِ ترقی پر نگاہ ڈالی ہوگی تو آپ نے اُن تجربات کے متعلق بھی کچھ پڑھا ہوگا جو "یورینیم" کے ذرّات کے شق ہونے کا باعث ہوئے تھے۔ سمجھنے والے اُسی وقت یہ سمجھے ہوں گے کہ "ایٹم بم" کا بنانا بھی ایک "امکان" کی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ "ایٹم بم" درحقیقت کبھی بنایا بھی جا سکے گا۔ لیکن ایک دولت مند قوم نے جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لیے "ایٹم بم" کی ایسی شدید ضرورت محسوس کی کہ اس نے کثیر دولت اور انسانی طاقت کو اسی مقصد پر لگا دیا اور ایٹم بم تیار کر لیا۔

اس سلسلے میں "شدید ضرورت" کے فقرے کو ہمیشہ یاد رکھیے۔ عقلمندوں کا قول ہے کہ "ضرورت ایجاد

کی ماں ہے"۔ ہم اس مضمون میں جن سائنٹی فک ترقیوں کا تذکرہ کریں گے وہ سب کی سب "امکانات" میں داخل ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ اُسی وقت حقیقی وجود کا جامہ پہنیں گی جب انسانی سوسائٹی کو ان کی ایسی ہی شدید ضرورت محسوس ہوگی کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گی۔

مثلاً اس وقت دنیا میں ایندھن کی اور مشینوں کو چلانے کے لیے "طاقت" کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ کرہ ارض میں کوئلہ اور تیل کا ذخیرہ محدود ہے اور وہ آہستہ آہستہ خرچ ہو کر ختم ہو رہا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ افریقہ، وسطی ایشیا، اور بحرِ منجمد جنوبی کے علاقوں میں کوئلے کی کانی مقدار اب بھی پوشیدہ ہے۔ مگر یہ بھی کب تک؟ اور پھر کوئلے کی بڑی بڑی مقداروں کو منتقل کرتے رہنا بھی آسان نہیں ہے اور اس کے ٹرانسپورٹ میں بڑی رقمیں خرچ ہوتی ہیں۔ دوسری طرف تیل کو لیجیے تو یہ "سیاسی" اعتبار سے بہت گراں پڑتا ہے اور لڑائیوں کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اس کمی پورا کرنے کی پانچ صورتیں ممکن معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئلہ اور تیل کی جگہ "جوہری انرجی" کام میں لائی جائے، لیکن اس سلسلے میں ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ کوئلے اور تیل کی طرح "یورینیم" کو خرچ کرنا بھی گویا "سرمایہ" ہی کو خرچ کرنا ہے۔ دنیا میں یورینیم کی مقدار بھی محدود ہونے کے باعث جلد ختم ہو جائے گی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ "جوہری انرجی" کے لیے کسی دوسری چیز پر نگاہ ڈالی جائے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ آفتاب کی وہ انرجی جو کروڑوں سال تک اس کو ایک ہی درجۂ حرارت پر مشتعل رکھتی ہے، ذرات ہی کے انشقاق سے پیدا ہوتی ہے، لیکن ہمارے ایٹم بم کی طرح یہ "یورینیم" کے ذرات نہیں ہوتے، بلکہ آفتاب میں انتہائی حدت اور دباؤ کے باعث ہائڈروجن اور کاربن اور دوسرے معمولی ذرات بھی بے انتہا جوہری انرجی پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے جب ہم اس کا راز معلوم کر لیں گے اور اس جوہری طاقت سے کام لینے کے لائق ہو جائیں گے تو وہ ایٹم بم جو پہلے پہل ہیروشیما پر پھینکا گیا تھا ایک معمولی کھلونا دکھائی دے گا۔ اگرچہ ابھی ہم اس دریافت سے بہت دُور ہیں لیکن جب ہم یہ سنتے ہیں کہ روسی سائنس داں "کاکیشس" (قاف) کے پہاڑوں میں "کائناتی COZMIC شعاعوں کے مطالعے میں مصروف ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دُوسری دریافتوں میں شاید اس کی بھی رہ کھل جائے کہ آفتاب سے پیدا ہونے والی جوہری انرجی کی طرح اس دنیا کی جوہری انرجی بھی "یورینیم" کے علاوہ دوسرے معمولی اور دست یاب ذرات سے پیدا کی جا سکے۔

تیسرا امکان یہ ہے کہ جس طرح سبز پودے آفتابی شعاعوں کو اپنے لیے کاربنی اور آکسیجنی اور ہائڈروجنی نسیجوں میں مبدّل کر لیتے ہیں اور پودوں کا سبز مادہ مُفرد عناصر سے کیمیائی مرکبات تیار کر لیتا ہے اسی طرح ہم بھی اس راز کو معلوم کر کے انرجی پیدا کرنے لگیں۔

چوتھی سائنٹی فک ترقی یہ ہو سکتی ہے کہ ہم بجلی کا ذخیرہ جمع کرنے اور منتقل کرنے کا کوئی طریقہ ایجاد کریں اور پانچواں اُمید افزا میدانِ تحقیقات یہ ہے کہ مصنوعی ایندھن تیار کیا جائے۔ جنگ کے زمانے میں جب سوئیڈن میں پٹرول کا فقدان ہو گیا اور دوسری طرف کاغذ کی برآمد بند ہونے کے باعث لکڑی کا مادہ (PULP) بڑی مقدار میں بے کار ہو گیا تو اس نے اس سے ایندھن کے لیے الکحل نکالنا شروع کیا۔ یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا اور آج بھی سوئیڈن میں تمام موٹریں اسی ایندھن سے چلتی ہیں۔

غذا:۔ اس وقت ساری دنیا میں غذائی اشیاء کی کمی ہے اور بہت سی قومیں قحط کی سی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اس لیے سائنٹیفک تحقیقات کا یہ میدان انسانی صحت و زندگی کے اعتبار سے سب سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مگر ماہرین سائنس کو غذا کے مستقبل کے سلسلے میں ہمیشہ ماضی کا بھی خیال رکھنا چاہیے یعنی یہ کہ جنگ سے پہلے بھی انسانی آبادی کے تین افراد میں سے دو افراد "نیم تغذیہ" یا بہ الفاظِ دگر نیم۔فاقہ کشی" کا شکار رہتے تھے۔ اس لیے یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ اگر ہم قبل از جنگ کی غذاؤں کی طرف لوٹ آئیں گے تو ہمارا کام پورا ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں بھی سائنس پانچ طریقوں سے بہتر غذائی معیار دنیا کے لیے پیش کر سکتا ہے۔

(۱) غذا اور غذائی ذرائع کی بربادی و تضییع کو قطعاً روک دیا جائے۔ جن قوموں کو متمدن کہا جاتا ہے وہ قدرتی ذرائع کو بہت دنوں سے تباہ و برباد کر رہی ہیں۔ زراعت کے غلط طریقوں کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکا۔ ایشیا اور آسٹریلیا کی بہترین زرخیز زمینوں کے لاکھوں مربع میل رقبے کی اوپری زراعتی مٹی بارش کے پانی سے دھل کر سمندروں میں چلی جاتی ہے اور زمین کی نچلی بنجر اور پتھریلی تہ اوپر آجاتی ہے۔ جنگلوں کو اسی طرح کاٹا اور برباد کیا جاتا ہے کہ بہترین زرخیز وادیاں بنجر اور غیر آباد ہو جاتی ہیں۔ روئی اور تمباکو کی کاشت اس طرح کی جاتی ہے کہ اراضی کی زرخیزی ختم ہو جاتی ہے۔ بدررو اور نالوں کے ذریعے "نائٹریٹ" اور دوسری کھاد کی بہت سی مقدار ہم دریا اور سمندر میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ سائنس کا فرض یہ ہے کہ کرۂ ارض کی مزروعہ سطح کے بڑے حصے کو جسے ہم صدیوں سے تباہ کر رہے ہیں پھر اچھی زرخیز حالت پر واپس لائے۔

(۲) سائنس اس طرح کی نئی غذائی چیزیں بھی دریافت کر سکتا ہے جو اس وقت غیر آباد زمینوں پر پیدا کی جائیں ہماری غفلتوں کی صرف ایک مثال "آلو" کی شکل میں موجود ہے۔ ہر آلو جو ان دنوں غذا کے لیے بویا جاتا ہے ایک خاص نسل سے تعلق رکھتا ہے جو پہلے پہلے جنوبی امریکا میں پائی گئی تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان ہی علاقوں میں بیسیوں مختلف نسلوں کے "آلو" جنگلی پیداوار کی حیثیت سے پیدا ہوتے اور ضائع ہو جاتے ہیں اور ان کی طرف سائنس نے اب تک توجہ نہیں کی ہے۔ پچھلے دنوں برطانوی اور روسی مہمات نے ان کے کچھ نمونے حاصل کیے ہیں۔ اور تجربوں سے معلوم ہوا ہے کہ یہ نہ صرف اچھی غذائی قدریں رکھتے ہیں، بلکہ ان پر بیماریوں کا حملہ نہیں ہوتا اور یہ سائبیریا اور کناڈا کی آب و ہوا میں بہ آسانی پیدا کیے جا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ غذائی اناجوں، سبزیوں اور پھلوں کی ایسی "نسلیں" پیدا کی جائیں جو نباتاتی امراض سے پاک ہوں۔

(۳) سائنس کا تیسرا فرض یہ ہے کہ وہ درحقیقت نئے غذائی پودے "ایجاد" کرے۔ ہمیں ایک طریقہ ایسا معلوم ہو گیا ہے کہ دو قسم کے یا دو نسلوں کے پودوں کی آمیزش یا پیوند سے ایک نئی قسم کی اولاد پیدا کر لیں۔ مثلاً ہمیں گندم کے پودوں کی ایک قسم ایسی مل سکتی ہے جو امراض کے حملوں سے متأثر نہ ہوئی ہو، اور ایک دوسری قسم ایسی دستیاب ہو سکتی ہے جس کے خوشے جلد پک جاتے ہوں، اس لیے اگر ہم دونوں قسم میں پیوند لگا کر ایک ایسا پودا وجود میں لا سکتے ہیں جس میں دونوں اوصاف موجود ہوں، تو غذائی مسئلہ کو حل کرنے میں آسانی ہوگی۔ اس مقصد کے لیے ہمیں تخمی پودوں پر کچھ کیمیائی "تدبیر" عمل میں لانی پڑتی ہے یا "ایکس ریز"

سے کام لینا ہوتا ہے۔

(۴) نئی غذاؤں کی دریافت اور ایجاد بھی سائنس کا ایک اہم فریضہ ہے۔ اس کے لیے یا تو ان خوردنی چیزوں کی فصلیں پیدا کی جا سکتی ہیں جو اب تک خوراک کے لیے استعمال نہیں کی گئی ہیں، یا کیمیائی ترکیب و ساخت کے ذریعے بالکل نئی غذائیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ اول الذکر کی ایک مثال "غذائی خمیر" ہے۔ ہم اپنے لیے پروٹینی اجزا کا زیادہ تر حصہ صرف گوشت سے حاصل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ چوپاؤں کے لیے بہت سی جگہ درکار ہوتی ہے۔ دوسرے وہ بہت دنوں میں نشوونما پا کر تیار ہوتے ہیں۔ مزید برآں گوشت کی بہت بڑی بڑی مقداروں سے بہت تھوڑی سی پروٹین حاصل کی جاتی ہے لیکن صرف نصف ٹن خمیر سے ۲۴ گھنٹوں میں ۲۴۶ ٹن پروٹین پیدا کی جا سکتی ہے، قیمتوں کو دیکھیے تو گوشت کے پروٹین کے مقابلے میں خمیر کی پروٹین کہیں زیادہ سستی پڑتی ہے۔ غذائی جانوروں کی پرورش کے لیے ان کو بہت سا کھانا دینا پڑتا ہے۔ خمیر کی "غذا" کے لیے شکر سازی کا رخانوں اور دوسرے صنعتی کارخانوں کی ردی چیزیں کافی ہوتی ہیں۔ جنگ کے زمانے میں غذائی خمیر بنانے والے جو کارخانے جاری کیے گئے تھے اگر ان کے ساتھ وہی ترجیحی سلوک کیا جاتا جو "پنسلین" کے ساتھ کیا گیا تو آج پوری مغربی دنیا میں کافی پروٹینی غذا موجود ہوتی۔

"کیمیائی ترکیبی غذائیں" اب بھی "امکانات" میں داخل ہو چکی ہیں۔ جرمنوں نے کوئلے سے ایک قسم کا مکھن بنایا تھا۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے کیوں کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں وہ تقریباً سب کی سب چند قسم کے عناصر یا اجزا کے کیمیائی مرکبات ہیں یہی صورت ہماری غذاؤں کی بھی ہے۔ کیمیا داں کا کام یہ ہے کہ وہ ان کیمیائی اجزا کو الٹ پھیر کر اپنی ضرورت کے مطابق نئی نئی چیزیں بناتا رہے۔ ہمارے اردگرد جتنی کارآمد چیزیں ہیں ان کی ترکیب کاربن، آکسیجن، ہائڈروجن، نائٹروجن اور بعض دوسرے اجزا کی مختلف مقداروں سے ہوتی ہے۔ کوئلے کے مکھن سے کہیں زیادہ اہم ضرورت اس چیز کی ہے کہ ہم کیمیائی ترکیب کے ذریعے شکر اور نشاستے کی کبھی نہ ختم ہونے والی مقدار حاصل کریں۔ اس وقت شکر کی فراہمی کا انحصار نباتی دنیا پر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں سبز پودے آفتاب کی (ترچی کاربن، آکسیجن اور ہائڈروجن میں مبدل کرنے تین اہم مرکبات تیار کر لیتے ہیں۔ یعنی شکر، نشاستہ، اور "سیلولوز"۔ سیلولوز ہی پر پودوں کی نسیجوں کا زیادہ تر حصہ مشتمل ہوتا ہے۔ اور یہ چیز درحقیقت شکر کے سالمات" کی ایک لمبی لڑی ہوتی ہے۔ اگر ہمیں ان لڑیوں کو توڑ کر شکر بنانے کا طریقہ معلوم ہو جائے تو شکر کے لیے خاص طور پر گنّوں اور چقندروں کی کاشت درکار نہ ہوگی، پھر تو ہم لکڑی کے مادے (PULP) اور بھوسے اور خشک گھاس سے بھی شکر نکال سکیں گے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اس طرح کی شکر "سیکرین" کی طرح صرف ایک بدل کا کام دے گی۔ بلکہ وہ حقیقت میں ویسی ہی شکر ہوگی جیسی کہ آج ہم چائے میں ڈالتے ہیں۔

(۵) موجودہ غذائی مسئلے کو حل کرنے میں سائنس ایک آخری مدد اس طرح کر سکتا ہے کہ غذائی چیزوں کو محفوظ کرنے، بہت دنوں تک اصلی حالت میں برقرار رکھنے اور بوسیدگی سے بچانے کے لیے نئے نئے طریقے دریافت کرے۔ غذائی اشیاء کو عنصر آبی سے پاک کر کے خشک کر لینے DEHYDRATION اور محفوظ کر دینے کا طریقہ ایجاد ہو چکا ہے مگر اس میں ابھی بڑی اصلاح و ترقی کی گنجائش باقی ہے۔ لیکن ایک اس سے بھی زیادہ اہم طریقہ اب نگاہوں کے سامنے ہے اس کو یہ (QUICK FREEZING) یعنی "تیزی سے منجمد" کر دینے کا عمل کہتے

ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ "تبرید" (REFRIGERATION) اس سے جُداگانہ عمل ہے۔ اس کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اپنے ایک بکرے کا گوشت اس طرح محفوظ کرلے کہ کئی ماہ تک اس کے ٹکڑوں کو حسبِ ضرورت استعمال میں لاسکے، تو اسے اپنا بکرا ایک مذبح میں لے جانا ہوگا جو "منجمد کرنے والے ڈبیہ" کا کام بھی انجام دیتا ہوگا، وہیں اس کا بکرا ذبح کیا جائے گا، انتہائی تیزی سے اس کے ٹکڑے کیے جائیں گے اور ان ٹکڑوں کو فوراً ہی سردی کے نقطۂ انجماد میں پہنچا کر جما دیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک خاص قسم کے "بارد بکس" میں جو اسی ڈگری کو قائم رکھ سکے گا۔ ان ٹکڑوں کو بند کرکے اس شخص کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ کئی ماہ تک جب چاہے گا کوئی ٹکڑا نکال کر اپنے کام میں لاسکے گا۔ اور ایک سال کے بعد بھی اس کی لذت اور تازگی اور تغذیہ میں کوئی فرق نہیں آنے گا۔ اسی طرح "تیزی سے منجمد کیے ہوئے" نازک سے نازک پھل بھی کئی فصلوں تک کام دے سکیں گے۔

کپڑا انسانی صحت و زندگی کے لیے کھانے کے بعد کپڑے کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اس میدان میں بھی سائنس ایک انقلاب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ "ریون" (RAYON) اور مصنوعی ریشم کی ایجاد کے کیا معنی ہیں؟ یہی کہ ہم رفتہ رفتہ ریشم کے کیڑوں کے احسانات سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ ریشم کے کیڑے نے شہرت اس لیے حاصل کی کہ اس کا معدہ ایک کیمیائی حیثیت رکھتا ہے۔ شہتوت کے پتے جب آفتابی شعاعوں کو کاربن، آکسیجن اور ہائڈروجن میں مبدّل کرکے سیلولوز تعمیر کرتے ہیں تو اسے وہ اپنے معدے میں حل کرکے اس میں نائٹروجن ملا دیتا ہے اور اسی مرکب کو ایک خوب صورت دھاگے کی صورت میں خارج کرتا ہے۔ مصنوعی سلک کی تیاری میں بھی بالکل یہی عمل اختیار کیا جاتا ہے، گو وہ زیادہ بڑے پیمانے پر ہوتا ہے اور اس کا کارخانہ ریشم کے کیڑے کے پیٹ سے کہیں بڑا ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگرچہ اس طریق کار میں ریشم کے کیڑے کا وجود خارج کر دیا گیا ہے پھر بھی خام شے یعنی سیلولوز کو حاصل کرنے کے لیے نباتی دنیا سے رشتہ منقطع نہیں ہوا ہے۔

لیکن اب سائنس نے اس سے بھی آگے ایک قدم بڑھایا ہے یعنی یہ کوشش کی ہے کہ نباتاتی دنیا سے اس سلسلے میں علیحدگی اختیار کرلی جائے۔ اس لیے "ریون" (مصنوعی ریشم) کے بعد ایک چیز "نائلون" (NYLON) تیار کی گئی ہے۔ اس کی تیاری کی ابتدا "سیلولوز" سے نہیں کی جاتی ہے، بلکہ خود اُنھی اجزا سے کی جاتی ہے جنھیں نباتی دنیا "سیلولوز" میں مبدّل کرتی ہے یعنی کاربن، آکسیجن، ہائڈروجن وغیرہ۔ عام الفاظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ "نائلون" کوئلہ، پانی اور ہوا سے تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کسی قدر گمراہ کن ہے، اگرچہ مطلوبہ کاربن، آکسیجن، ہائڈروجن اور نائٹروجن بھی تین وسیع ترین ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے، تاہم اس سے قبل کہ وہ مل جل کر "نائلون" کے سالمات تیار کریں ان کو بہت سی پیچیدہ منزلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ نائلون سے کپڑے وغیرہ بننے کی تمام ضرورتیں اس طرح پوری ہو جاتی ہیں جیسے کہ آج تک کسی نباتی یا ریشمی ریشوں اور دھاگوں سے پوری نہیں ہوئی ہیں۔ لیکن اب امید کی جاتی ہے کہ آئندہ "پلاسٹک" کے کپڑے تیار ہونے لگیں گے، اس صورت میں نائلون کے دھاگوں کو بُننے کی بھی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر ایسا دن آیا تو صنعتِ پارچہ بافی پر گویا ایٹم بم گر پڑے گا۔

دوسری چیزیں

ان کے علاوہ بہت سی دوسری چیزیں بھی وجود میں آرہی ہیں اور آنے والی ہیں جن کی مختصر فہرست پیش کی جاتی ہے:-

(۱) "الکٹرو مائکروسکوپ" یعنی برقی ذرات سے کام لینے والی خوردبین ۔ معمولی خوردبین کے مقابلے میں زیر نظر چیزوں کو دس گنی جسامت عطا کر دیتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیماریوں کے وہ بہت ہی چھوٹے جراثیم جو اب تک معمولی خوردبین سے دیکھے نہیں جا سکتے تھے اس برقی خوردبین سے دیکھے جانے لگے ہیں ہم اس کے ذریعے سرطان اور جذام اور دوسری مہلک بیماریوں کے جراثیم کو اچھی طرح دیکھ سکیں گے ظاہر ہے اگر اسی طرح کوئی ایسی خوردبین ایجاد کی گئی جو موجودہ خوردبین سے پچیس یا تیس گنی زیادہ طاقت ور ہو تو ہم دنیا کے کتنے حیرت انگیز عجائب دیکھ سکیں گے اور طبی و معالجاتی ترقی کے لیے کتنی راہیں کھل جائیں گی !

(۲) دوسری چیز "کیتھوڈ" شعاعوں کی نلکی ہے جو کسی شے سے گزر کر اس کے دوسرے رخ کو بھی نمایاں کر دیتی ہے اور اسی سلسلے کی چیز ایک "برقی دماغ" ہے جو ریاضی کے بڑے بڑے حسابوں کا جواب آن کی آن میں دے دیتا ہے۔

(۳) ایک نیا سائنٹی فک آلہ جو برقی تختی خلا یا کو استعمال کر کے ایسے ستاروں کے ریڈیائی اشعاع کو اخذ کر لیتا ہے جو بے حد دور ہیں اور طاقت ور سے طاقت ور دُوربین کی فوٹو پلیٹ پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

(۴) بعض آلات کے ذریعے ہم آفتاب کی شعاعوں کو اپنے کمروں کے تاریک سے تاریک گوشوں تک پہنچا سکیں گے۔

(۵) ہم اپنے کمروں کی حرارت کو اس طرح اعتدال پر رکھ سکیں گے کہ جسمانی حرارت کے علاوہ ہمیں اور کسی خارجی حرارت کی ضرورت نہ ہوگی۔

(۶) ایک ٹیلی فون ایسا ایجاد ہوگا جو "خیال" کی خدمت بھی انجام دے گا یعنی جب ہم باہر ہوں گے تو پیغام لے کر ہم تک پہنچا دیا کرے گا۔

(۷) اگر ہم جوہری انرجی سے ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کا ارادہ ترک کر دیں گے تو اس سے ایک اہم ترین خدمت یہ لی جا سکے گی کہ موسموں میں ضرورت کے مطابق تبدیلی پیدا کر لی جائے گی ۔ مثلاً ہم خطۂ منجمد شمالی کے تودہ ہائے برف کو اڑا کر کناڈا، شمالی یورپ، اور ایشیا کی آب و ہوا کو کچھ دنوں کے لیے بدل سکیں گے۔ یا ہم سمندر کی لہروں کو افریقہ کے صحرائے اعظم تک پہنچا سکیں گے ۔ مگر ان خیالی منزلوں سے آگے بڑھنے کی سردست ضرورت نہیں ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۶

(۹) وھیل مچھلی کے شکار پر سے پابندیاں کچھ دنوں کے لیے اٹھالی جائیں۔

(۷) مغربی یورپ کے ممالک تیل اور چربی کی پیداوار کے تمام کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں تاکہ اس کی راہ میں جو اقتصادی رکاوٹیں ہیں وہ دُور ہو جائیں + (ادارہ)

ایک مہینے کی رخصت

مسٹر جی۔ای۔جی۔پلانٹ
فیلو آف رائل جیاگرافیکل سوسائٹی

اگر آپ کو اپنے دفتری کاموں سے یا پیشہ یا کاروبار کی مصروفیتوں سے ایک ماہ کی رخصت مل جائے اور آپ تفریح کی اس مدت کو حصول مسرت کے ساتھ ساتھ ترقی صحت کی کوشش میں گزارنا چاہیں تو آپ کیا کریں گے ؟ اکثر حضرات ایسا کرتے ہیں کہ اپنی طویل چھٹیوں کو لیٹے لیٹے گزار دیتے ہیں اور تاش یا شطرنج کھیل کر دن کاٹ دیتے ہیں۔ لیکن جو قومیں صحت و تن درستی کی متلاشی ہوتی ہیں ان کے افراد اپنی رخصت کا ایک مقصد اور ایک پروگرام مرتب کر لیتے ہیں، اور سیر و شکار یا پہاڑوں پر چڑھائی (Hiking) یا جغرافیائی سفر یا آثار قدیمہ کی تلاش یا نئے نئے مقامات کا کھوج لگانے میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں اس طریقہ کو افزائش صحت و مسرت کا بہترین ذریعہ سمجھا گیا ہے۔

اس اشاعت میں جو مضمون پیش کیا جا رہا ہے اس کا مطالعہ دل چسپ اور مفید ثابت ہوگا۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی ایک ماہ کی رخصت سے کیا فائدہ اٹھایا اور اور اس وقفہ تفریح کو کیسی دل چسپ مہمات میں صرف کیا۔ یہ مضمون دل چسپ واقعات سے پُر ہے۔ اس کے مصنف نے پہاڑوں پر چڑھائی کی، جنگلوں کو چھانا، زمانہ قبل از تاریخ کے ایک "گم شدہ شہر" کا پتہ لگایا، جنگلی بھینسے اور گینڈے اور دریائی گھوڑے اور ہاتھی کا شکار کیا۔ ایک ایسی جھیل تک پہنچا جس میں پانی کے بجائے صرف سوڈا تھا اور ایک کوہ آتش فشاں پر چڑھائی کی۔ ایک دل چسپ سلسلۂ واقعات کو خود مصنف کی زبانی سنیے۔ جس نے اپنی ایک ماہ کی رخصت ایسی صحت افزا اور حوصلہ طلب مہمات میں گزاری۔

(ہمدرد صحت)

برطانوی امپائر کے بعض حصوں کی جغرافیائی پیمائش کے محکمہ میں ایک افسر ہونے کے باعث میری زندگی زیادہ تر پہاڑوں اور جنگلوں میں گزری تھی اور میں اس زندگی کو بہت پسند کرنے لگا تھا۔ اس لیے مجھے بہت رنج و ملال ہوا جب ہٹلر اور مسولینی کی ریشہ دوانیوں کے باعث لڑائی چھڑ گئی اور مجھے جزیرہ مومباسا (مشرقی افریقہ) کے آباد اور گنجان شہر میں طرح طرح کے انسانوں کے جم غفیر میں قیام کرنا پڑا۔ مجھے جو فرائض جنگ کے سلسلے میں سپرد کیے گئے تھے اس کی انجام دہی کے لیے میں یہاں رہنے پر مجبور تھا۔

لیکن دنیا میں ہر چیز ختم ہو جاتی ہے، اس لیے میری یہ بے لطف شہری زندگی بھی ختم ہوئی اور اگست سنہ ۴۴ء میں مجھے ایک ماہ کی وہ رخصت عطا کی گئی جس کا میں پُرشوق طریقے پر منتظر تھا۔ میں نے تھوڑے سے ابتدائی انتظامات کر لینے کے بعد اپنی موٹر سائیکل کو مومباسا کی تپتی ہوئی اور گرمی سے تُلستی ہوئی بودا گلیوں سے باہر نکالا اور کچھ دور جا کر ناریل کے درختوں کے پُر فضا باغات میں دم لیا۔ اب میرے سیر و تفریح کی راہ میرے سامنے تھی۔

اس مقام سے آگے بڑھ کر مجھے ٹواپا کے آب درہ کو خود اپنے ہاتھوں سے ایک کشتی چلا کر عبور کرنا پڑا۔ یہ میری مہم کی پہلی دل چسپی تھی۔ اس کے تھوڑی دور بعد پھر مجھے ایک سنسان اور چٹیل ریگستان سے گزر کر دوسری شاخ دریا سے مسافر کشتی پر پار اترنا پڑا، جس کے دوسرے ساحل پر قدم رکھتے ہی کلیفی کے پرفضا مناظر نے میرا خیر مقدم کیا۔ یہ ایک چھوٹی سی نوآبادی ہے جہاں کی مرجانی کلیاں بے حد دل کش ہیں اور چھوٹے خوبصورت مکانات درختوں کے ہرے ہرے جھنڈ میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہاں کے سبزہ زاروں کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد ایک پرشوکت ریتلا سمندری ساحل ہے جس کے پہلو میں بحر ہند اپنی پوری شان و عظمت اور نیلگوں رنگت کے ساتھ افق پر موجیں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

کلیفی سے باہر نکلنے والی سڑک پھر جنگلوں میں داخل ہو جاتی ہے اور ان میں پیچ و خم کھاتی ہوئی کچھ فاصلے پر ایک قدیم عربی قصبہ ملندی تک پہنچتی ہے اور اس کے بعد ایک یورپین نوآبادی کے سامنے آجاتی ہے۔ رات کو میں نے اسی نوآبادی میں قیام کیا اور دوسرے روز مقامی باشندوں سے کچھ جغرافیائی حالات دریافت کرنے کے بعد قدیم اور فراموش کردہ شہر گیڈی کو تلاش کرنے کے لیے نکلا جس کے متعلق بہت سی عجیب و غریب روایات میں نے پہلے سنی تھیں۔ یہ شہر جو دنیا کے آثار قدیمہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے بہت سے ماہرین تاریخ اور ماہرین آثار کے لیے ایک "دردِ سر" بنا ہوا ہے، اس لیے اس کی اصل اور ابتدا اب تک ان کے لیے ایک پراسرار معمہ بنی ہوئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے کھنڈر بھاری اور گرم جنگلوں میں پوشیدہ ہیں اور اس کے افسانے بہت انوکھے، پُراسرار اور ہیبت ناک ہیں۔ متعدد بڑے محراب، جنگلی درختوں کی الجھی ہوئی تل جھاڑیوں سے سر نکالے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تین فیٹ موٹی دیواریں برگ و بار کی کثیر پیداواروں سے جھانکتی ہیں اور کھنڈروں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی شان دار عمارتیں زمانہ قبل از تاریخ میں یہاں موجود تھیں اور بعد کو اس سرزمین کے اندر دفن ہو گئیں۔ لیکن ان کا کھوج نکالنے والے کے لیے اس ہول ناک جنگل میں راستہ بھول کر ہمیشہ کے لیے کھو جانے اور لاپتہ ہو جانے کا خطرہ ہے اور تفتیشی سرگرمیوں کی ایک دوسری خطرناک نوعیت یہ ہے کہ اس گم شدہ شہر میں بڑے بڑے اندھے کنویں جنگلی جھاڑیوں سے اس طرح چھپے ہوئے ہیں کہ ان کی موجودگی کا کبھی شبہ نہیں ہوتا۔ اس خیال سے انسان لرزہ براندام ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کنویں میں گر جائے تو اس کا کیا حشر ہوگا۔

میں نے اس "کھوئے شہر" کے متعلق جو کچھ دیکھا اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر تقریباً پانچ مربع میل کے رقبہ میں آباد تھا، لیکن اب اس سے زیادہ تر کھنڈر صرف روڑے اور کنکر کے اونچے اونچے ڈھیروں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اس شہر کا ایک حصہ ایک بڑی دیوار یا فصیل سے گھرا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اسی کے اندر بعض ایسی عمارتیں دکھائی دیتی ہیں جو اب تک کسی قدر اچھی حالت میں کہی جا سکتی ہیں لیکن ایک حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اس تمام علاقے میں کوئی ایسے نقوش یا کتبے یا کندہ پتھر نہیں ملے جن سے یہ معلوم ہو کہ کن لوگوں نے اس شہر کی بنا ڈالی تھی وہ کہاں سے یہاں آئے تھے اور کہاں چلے گئے۔

تین روز قیام کرنے کے بعد میں ملندی سے آگے بڑھ گیا اور شمال کی طرف چل کر خشک اور خاردار صحرائے تارو میں داخل ہوا۔ اس خشک اور بنجر علاقے میں جو کچھ بھی ہے وہ بے کیف اور مایوس کن ہے لیکن بعض مقامات پر سرخ اور چمکیلے پھولوں سے لدے ہوئے جو درخت ملتے ہیں وہ ان تکلیفوں کی کافی تلافی کر دیتے ہیں جب میں اس صحرا میں سفر کر رہا تھا تو کچھ دور پر مانگو اور دارا پہاڑوں کے مناظر بہت دلکش دکھائی دیتے تھے۔ اسی صحرائے تارو سے غلاموں کی تجارت کی ایک قدیم شاہ راہ بھی تھی۔

بالآخر میں توآرا کے کوہستانی سلسلے تک پہنچ گیا۔ اب میری منزل مقصود دریائے ساودو اور دریائے آتھی کا مقام اتصال تھا۔ جہاں میرے ایک دوست نے "گریفائٹ" پتھر یعنے پنسل کے سرمہ کی کانکنی کا کام جاری کیا تھا۔ اس جگہ تک پہنچنے سے پہلے مجھے پانچ میل تک پہاڑی نالے طے کرنے پڑے جن کے پہلوؤں میں چٹانیں اور تہ میں نرم ریت تھی اور دونوں طرف سے خاردار جھاڑیاں مجھ پر جھکی پڑی تھیں۔

جب میں اپنے دوست کے پاس پہنچا تو مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ وہ شام اور رات میرے لیے بہت دلچسپ اور خوش گوار تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے ستارے جگمگا رہے تھے اور ہوا سے ناریل کے درخت ہلتے تھے تو ان کے بڑے بڑے پتوں کے درمیان یہ ستارے مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ آس پاس بلند پہاڑوں کی چوٹیاں فضائے آسمانی میں سر اٹھائے ہوئے تھیں۔ جھینگروں اور دوسرے کیڑوں کی مختلف آوازوں کے ساز چھڑے ہوئے تھے اور ان کے درمیان کبھی کبھی دور سے شیر اور تیندوے کے گرجنے کی صدائیں آ رہی تھیں۔



کھانے کے وقت میرے دوست نے مجھے بتایا تھا کہ قرب و جوار کی پہاڑی ندیوں اور جھیلوں میں دریائی گھوڑے (Hippopotamus) بھی پائے جاتے ہیں۔ مجھے جنگلی جانوروں کے شکار کا بہت شوق تھا۔ صبح ہوتے ہی میں اپنی ۳۰۰ قطر والی ایکپیرس رائفل لے کر نکل گیا۔ میرے دوست نے مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ ان پہاڑوں اور جنگلوں میں چند قسموں کے خوف ناک درندے

بھی ہیں اور کہا نہیں جا سکتا کہ یکایک کس خون خوار جانور کا کس وقت مقابلہ کرنا پڑے گا۔ یہ بات سچی ثابت ہوئی جب کہ کچھ دور جانے کے بعد ایک ٹیلے کی گھنی جھاڑیوں میں حرکت اور کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی اور فوراً ہی کسی جانور کے خرخرانے کی بھیانک آواز سنائی دی۔ میں ابھی چوکنا ہوا ہی تھا کہ دفعتاً ایک بڑا اور خوفناک جنگلی بھینسا اس جھاڑی سے نکلا۔ صرف ایک سکنڈ سے بھی کم وقفہ تک اس نے ایک مخالفانہ انداز سے مجھے دیکھا اور پھر فوراً ہی اپنے سینگوں اور تھوتھنے سے میری طرف اشارہ کر کے پوری طاقت اور انتہائی تیزی کے ساتھ میری طرف دوڑا۔ اس کی وحشیانہ شکل اور حملہ کی شدت ناقابلِ بیان ہے۔ میں نے جھٹ اپنی بندوق سنبھالی اور چشم زدن میں متواتر اس پر تین گولیاں چلا دیں۔ پھر اس کی تیز رفتاری سے بچنے کے لیے مجھے بھاگ کر اس کے پہلو میں چلا جانا پڑا۔ اور میری چوتھی گولی نے اس کا خاتمہ کر دیا۔



اسی روز سہ پہر کو میں نے ایک دریائی گھوڑا بھی دیکھا جس کے جسم کا نچلا حصہ پانی میں تھا اور اوپری حصہ ساحلی جھاڑیوں میں کسی قدر چھپا ہوا تھا۔ اور اس کی سیاہ کھال کا تقریباً دو تین فیٹ رقبہ مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دریائی گھوڑے کا شکار زیادہ خطرناک نہیں ہوتا، مگر جوں ہی میں نے اس پر گولی چلائی وہ درندہ اپنا بڑا ہیبت ناک منھ کھولے ہوئے اور غصے میں منھ سے جھاگ نکالتے ہوئے میری طرف آیا۔ اگرچہ اس کا جسم بھاری بھرکم تھا مگر اس نے چشم زدن میں اس چشمۂ آب کو عبور کر لیا۔ جونہی اس نے مجھ پر حملہ کرنا چاہا میں نے اس کے کھلے ہوئے منھ میں نشانہ کر کے دوسری گولی چلا دی اور وہ فوراً ہی پانی میں تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

شام ہونے سے پہلے میں پھر اپنی قیام گاہ کو واپس ہو گیا۔ دوسرے روز دو جنگلی ساتھیوں کے ہمراہ جو

شکار کا کھوج لگانے میں ماہر تھے، میں ہاتھی کی تلاش میں نکلا، اور میری خوش قسمتی سے مجھے ایک ایسا ہاتھی ملا جس کے بڑے بڑے دانتوں کا وزن ۷۰ پونڈ تھا۔ اس ہاتھی کے شکار کے لیے مجھے ایک بڑی اونچی چٹان پر چڑھنا پڑا تھا ورنہ وہ منٹوں میں چیر پھاڑ کر میرا قیمہ بنا دیتا۔

اس کے بعد چند روز تک میں نے قریب کے پاٹا پلیٹو (سطح مرتفع) اور اس سرزمین کی حیرت انگیز ساخت کی دیکھ بھال میں گزارا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پہلے اس میں سے "لاوا" (پگھلا ہوا سیّال مادّہ) نکلا تھا جس کے نیچے کی وادی کی طرف بہ کر اور منجمد ہو کر دریائے آتھی کو دو شاخوں میں منقسم کر دیا تھا۔ یہ سطح مرتفع چھ سو فیٹ بلند ہے اور یہاں سے آس پاس علاقوں کے دل کش مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔ علم طبقات الارض کے ماہرین ان علاقوں کو دنیا کے قدیم ترین علاقوں میں سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلے یہ عظیم ترین پہاڑ تھا، جو برِاعظم افریقہ کی ریڑھ کی ہڈی بنا ہوا تھا۔ بعد کو ٹوٹ پھوٹ کر یہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور وادیوں میں تقسیم ہو گیا۔ یہیں سے بڑے فاصلے پر اور کہر نما دھند لکے میں مشہور پہاڑ کیلی منجارو کی برف آلود چوٹیاں بھی دھوپ میں چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور سطح مرتفع کے کناروں سے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ نیچے کی وادیوں میں ہاتھی، جنگلی بھینسے، دریائی گھوڑے اور دوسرے درندے اور بڑے بڑے اژدہے اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ وحشی جانوروں کے شکار کے لیے غالباً اس سے بہتر کوئی علاقہ نہ ہوگا۔ سیاحوں کے دل میں یہاں بہت سی مہمات سر کرنے کا جوش خود بہ خود پیدا ہو جاتا ہے۔

اگرچہ اس جگہ سے جانے کو ابھی میرا دل نہیں چاہتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ مجھے اپنی باقی سیر و تفریح ایک ماہ کی مدت کے اندر ختم کرنی تھی۔ میں آخر کار اپنے مہمان نواز دوست سے رخصت ہو کر جلد ہی چل کھڑا ہوا اور میری موٹر سائیکل مومباسا اور نیروبی کی درمیانی شاہ راہ پر گرم رفتار ہو گئی۔ میل پر میل طے ہو رہے تھے اور سرخ رنگ کی گرد مجھ پر اور میری موٹر سائیکل پر جمتی چلی جا رہی تھی۔

یہ طویل ریگستانی سفر طے کرنے کے بعد مجھے مکنڈو کا نخلستان ملا۔ یہاں میں نے پٹرول کی کچھ مقدار حاصل کر لی۔ یہاں کے باشندوں نے بھی خاصی مہمان نوازی کی، اس کے بعد میں دریائے کاپتی اور آتھی کی وسیع اور دور تک پھیلی ہوئی وادیوں کی طرف روانہ ہوا۔ ان وادیوں اور کوہستانی علاقوں کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہوئے میں نے بہت سے جنگلی جانور دیکھے۔ کہیں زرافے اپنی لمبی گردنوں کی نمائش کرتے ہوئے اچھل اچھل کر چل رہے تھے، کہیں گورخر دوڑ رہے تھے، کہیں شتر مرغ اپنے بڑے بڑے بازوؤں کو پھیلا کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کہیں لمبے سینگوں والے "کودو" (بڑے ہرن) چوکڑیاں بھر رہے تھے۔ اور ان کے علاوہ چند مخصوص قسم کے دوسرے افریقی جانور بھی تھے جن کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

نیروبی پہنچ کر میں ایک مختصر مدت تک وہاں مقیم رہا اور وہ بھی صرف اس غرض سے کہ اپنی موٹر سائیکل کے لیے کافی پٹرول اور تیل لے لوں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اب مجھے دو ہزار فیٹ نیچے اتر کر کیڈوگٹ پہنچنا تھا جو "گریٹ رفٹ" وادی میں واقع ہے جغرافیائی نقطۂ نگاہ سے کرۂ ارض کا یہ سب سے بڑا شگاف ہے جو دنیا کے ۱/۶ حصے میں فلسطین سے نیٹال تک پھیلا ہوا ہے۔

کیڈوگٹ تک میرا لمبا سفر پہاڑوں سے "اترائی" کا ایک خطرناک سلسلہ تھا، مگر مناظر کی دل کشی نے

میری تکلیفوں کا بار ہلکا کر دیا تھا۔ کنڈونگ سے نکلنے کے بعد مجھے نئی ورشا کی خوب صورت اور نیل گوں جھیل ملی جو ہرے بھرے جنگلوں اور بالخصوص "پیپرس" (Papyrus) کے شان دار درختوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہاں کا سب سے حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ نئی ورشا کے قریب ایک قدیم پُراسرار اور تاریک غار ہے۔ مقامی باشندے اس سے بے حد خوف زدہ رہتے ہیں اور اس کے پاس کبھی نہیں جاتے۔ اس کے اندر سے ایک ہولناک اور عجیب قسم کی گونجتی ہوئی آواز آتی ہے اور جب کوئی شخص اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ آواز اور بھی زیادہ تیز و تند ہو جاتی ہے جیسے اس کے غیظ و غضب میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں نے اس عجیب و غریب آواز کو "خدا کی آواز" کا نام دے رکھا ہے۔

میں نے اس پُراسرار غار کی بھی تفتیش کی، اور اس کے اندر داخل ہوا۔ اس واقعہ کی مختصر سی تفصیلی داستان الف لیلہ سے زیادہ دلچسپ ہو گی۔ اس بھیانک غار کا منہ مجھے بمشکل ملا۔ کیوں کہ اس کے اندر جانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا، جسے میں نے ایک سوراخ سے زیادہ بڑا نہ پایا اور یہ سوراخ بھی جنگلی روئیدگی سے تقریباً چھپا ہوا تھا۔ میں چوں کہ ماہرِ جغرافیہ تھا اس لیے اس کی شکل دیکھتے ہی اس کی نوعیت سے واقف ہو گیا۔ صاف طور پر یہ نئی ورشا جھیل کی پانی کی نکاسی کے لیے ایک قدیم زمین دوز اور نہایت گہرا راستہ تھا اور قدرتی طور پر اس وقت بن گیا تھا جب کہ جھیل کی سطح اس سے بہت زیادہ بلند تھی۔ اب اس کا اوپری حصہ اس میں داخل ہونے کے راستے سے دو سو گز کے فاصلے تک نیچے گر گیا تھا جس سے آگے بڑھنے کی راہ بند سی معلوم ہوتی تھی لیکن حقیقت میں بند نہ تھی۔ میں نے یہ رُکاوٹ آسانی سے دور کر لی اور اندرونی حصے میں داخل ہوا۔ تھوڑی دُور جا کر خود کو میں نے ایک بڑے کھوہ کے اندر پایا جو تین سو فیٹ لمبا اور تین سو فیٹ اونچا تھا۔ آگے بڑھتے بڑھتے یہ بلندی بھی کم ہوتی گئی اور یہ کھوہ تنگ و تاریک ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ کھڑے ہو کر اس کے اندر چلنا مشکل ہو گیا۔

یہاں پر مجھے ایک ڈھلواں اور خطرناک چٹانی راستے سے بہت نیچے کی طرف اُترنا پڑا یہی وہ تنگ و تاریک راستہ تھا جس سے اترتے ہوئے وہ دہ خوف ناک "آواز" سنائی دیتی ہے۔ یہ ایک گرج دار گونج یا غرغراہٹ جو دب دب کر پوری شدّت سے بلند ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ بہت زیادہ پُرزور اور ہولناک ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس تربتی اور بھیانک مقام پر آ کر بڑی خوف زدگی طاری ہو جاتی ہے۔ بہت سے اوہام دل میں سما کر آدمی کو لرزہ براندام کر دیتے ہیں اور آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ یہاں تاریکی ایسی تھی کہ میرا برقی ٹارچ بھی کافی روشنی پیدا نہیں کر رہا تھا۔ یکایک یہ "آواز" ایک بڑے متحرک تودے میں مبدّل ہو کر مجھ پر حملہ آور ہوتی ہوئی معلوم ہوئی اور آناً فاناً میرے برقی ٹارچ کی شعاعوں میں ہزاروں چمگادڑوں کے پر چمکنے لگے۔ مجھ پر چاروں طرف سے ان کے گروہوں نے حملہ کرنا شروع کیا اور میں انتہائی پریشانی کے ساتھ تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے آگے چلا۔ یہاں تک کہ مجھے ایک ایسا مقام ملا جو ایک دوسرا اور کہیں زیادہ بڑا کھوہ تھا اور اس سے دو راستے آگے کو جاتے تھے مگر اندرونی چٹانوں کے گر جانے کے باعث یہ دونوں راستے قطعاً بند ہو گئے تھے اور مجھے یہاں سے واپس چلا آنا پڑا۔

اس غار کا راز معلوم کرنے کے بعد میں جو رووا کی مشہور گھاٹی کی طرف روانہ ہوا جس کے قریب "لاوا"

کی ایک بلند چٹان پر موجود ہے اور خود اس گھاٹی کے چاروں طرف بھی لاوا کی چھوٹی چھوٹی چٹانیں ہیں۔ اس راستے میں میں نے قدرت کا ایک عجیب کرشمہ دیکھا۔ ایسی ٹڈیوں کا ایک بہت بڑا دل جو ابھی قابلِ پرواز نہ تھیں بلکہ پھدکنے یا جست کرنے کی ارتقائی منزل طے کر رہی ہیں۔ دُور دُور تک پہاڑوں اور میدانوں پر چھایا ہوا تھا اور ایک فوجی انبوہ کی شکل میں باقاعدہ طور پر آگے بڑھ رہا تھا۔ افریقہ کے صحرائی اور کوہستانی علاقوں کے باشندے ایسے مناظر سے خوب واقف ہیں۔ خود اس جو ردوا گھاٹی کے اندر میں نے سیاہ شیشے کی ایک پوری چٹان دیکھی۔ اس شیشے کو "اوریڈیم"* (Oridium) کہتے ہیں، جو کوہ آتش فشاں کی حیرت انگیز کیمیائی سرگرمیوں کی پیداوار ہوتا ہے۔



میری دوسری منزل اس سے بھی بلند تر کوہ آتش فشاں لونگونوٹ پر چڑھائی کی مہم تھی۔ ابتدائی منزلوں میں اس پہاڑ پر چڑھائی زیادہ دشوار نہیں ہے مگر اوپر پہنچنے کے بعد بہت ڈھلوان اور خطرناک چٹانوں پر چڑھنا پڑتا تھا، جن میں بعض ایسی ہیں جو دیوار کی طرح تقریباً سیدھی کھڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور بعض کی پشت چاقو کی دھار کی طرح ہے۔ اس چڑھائی میں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری پیٹھ کی ہڈیاں ٹوٹی جا رہی ہیں۔ جب میں اس تقریباً بجھے ہوئے جوالامکھی کے دہانے کے قریب پہنچا تو ایک ناقابلِ فراموش اور دم بخود کر دینے والا میرے سامنے یہ دہانہ مجھ سے صرف

دو تین فیٹ کے فاصلے پر تھا اس کے اندر دھواں دھار اور بہت ہیبت ناک تاریکی دیکھتے ہی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس خلا کی گہرائی کی کوئی تھاہ اور کوئی انتہا نہیں ہو۔ یہ چاروں طرف "لاوا" کی اونچی چٹانوں سے گھرا ہوا تھا۔ بیرونی اور اندرونی سطحوں کے درمیان دہانے کا" کنارا اتنا پتلا تھا کہ ایک شخص اس پر بیٹھ کر اور ایک پیر اندر اور ایک پیر باہر لٹکا کر کافی دُور تک اس پر کھسکتا ہوا چلا جا سکتا تھا۔ اس منظر کی شوکت و عظمت دُور تک پھیلے ہوئے چٹانوں کی ہیبت ناکی، چاروں طرف ایک بھیانک خاموشی، فضا کی غیر محدود وسعت، اور میری تنہائی رُوح کی گہرائی تک اثر انداز ہو رہی تھی۔ میں خیال کر رہا تھا کہ جب اس پہاڑ کی آتش فشانی اپنے پورے شباب پر ہو گی تو کس ہولناک طریقے پر آگ کے شعلے اور دھواں، اور راکھ اور پگھلتی ہوئی دھات اور جلتی ہوئی بڑی بڑی چٹانیں تیزی کے ساتھ اس کے اندر سے پھینکی جا رہی ہوں گی۔ اب تک اس کے دہانے سے جو بھاپ نکلتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دیو مردہ نہیں ہے بلکہ سویا ہوا ہے، اور شاید پھر کسی دن جاگ اُٹھے۔



میں ان چٹانوں کے کناروں کو بمشکل طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ کہیں کہیں مجھے ایسی تیز و تند آندھیوں کا مقابلہ کرنا پڑا جو میرے جسم کے توازن کو خطرے میں ڈال دیتی تھیں۔ چڑھائی کے دوران میں میرے ہاتھ اور پیر کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی تھی اور میں اس خیال سے کانپ جاتا تھا کہ اگر کہیں میں جوالا مکھی کے اتھاہ دہانے کے اندر گر پڑا تو کیا انجام ہو گا۔ لیکن ہمت و استقلال سے آگے بڑھتا گیا۔ ایک جگہ مجھے ایسی چوٹی ملی جو سطح سمندر سے ۹۱۱۱ فیٹ بلند تھی۔ اس پر چڑھائی انتہائی خطرناک تھی۔ اس کے ایک پہلو میں ایک نکیلی سر بہ فلک چٹان تھی اور دوسرے پہلو میں دہانے کا مہیب غار مُنہ کھولے ہوئے تھا اور تیز ہوا کے تھپیڑے مجھ پر حملہ کر رہے تھے۔ بعض جگہ پر چٹانوں کا کنارہ اتنا پتلا تھا کہ اس کی چوڑائی ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھی،

بہرحال میں اسی طرح سفر کرتا ہوا آخر اس چوٹی پر پہنچ گیا۔ اور وہاں سے جو شاندار قدرتی مناظر مجھے دکھائی دیے ان کا بیان ممکن نہیں ہے۔ میں ان کو کبھی بھول نہ سکوں گا۔ اس کے بعد اس مقام سے اترائی کے لیے میں نے اس پہاڑ کے دوسرے پہلو میں ایک آسان راستہ تلاش کیا۔ اور بڑی کے بعد ہانپتا کانپتا ہوا ہموار میدانوں تک پہنچا۔

نیزوَبی میں ایک رات آرام کرنے کے بعد میں نے اپنی سیر و سیاحت کا راستہ بدل دیا۔ اب مجھے اس حیرت انگیز اور انوکھی جھیل کی طرف جانا تھا جس کا نام مکادی ہے اور جو گونگ پہاڑ کی وادی میں واقع ہے۔ یہ پہاڑ بھی ایک قدیم جوالا مکھی ہے جو غالباً صدیوں پہلے اپنا جوش شباب ختم کر چکا تھا مگر جس کی حدت و حرارت کم ہونے پر بھی کافی مقدار میں باقی ہے۔ دوسرے روز میں اس مہم پر روانہ ہوا اور تقریباً پچاس میل کا پہاڑی سفر طے کر کے اس جھیل تک پہنچا جو سطح سمندر سے ۲۰۹۰ فیٹ بلند ہے۔ اس کی وادی چاروں طرف چٹانوں اور خاردار جھاڑیوں اور "لاوا" سے بھرے ہوئے پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہاں کی شدید گرمی نے مجھے بہت پریشان کر دیا کیوں کہ آفتاب کی شعاعیں پہاڑوں کے پہلوؤں سے منعکس ہو کر اس جھیل پر پڑتی ہیں اور اس کے آس پاس کہیں سایہ دکھائی نہیں دیتا جس میں پناہ لی جا سکے۔

اور خود یہ جھیل کیسی ہے؟ اس کی تعریف سن کر آپ کو حیرت ہوگی! یہ پوری جھیل منجمد کاربونیٹ آف سوڈا کا ایک لامتناہی ذخیرہ ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر جا کر چند مکانات اور آفس ملے جو ایک تجارتی کمپنی سے متعلق تھے۔ یہ کمپنی اس جھیل میں سے نمک اور سوڈا نکالتی ہے۔ جھیل کی لمبائی چودہ میل اور چوڑائی تین میل ہے۔ کہیں کہیں اوپر کی منجمد سطح ٹوٹ گئی ہے اور بعض سوراخوں میں سرخ رنگ کا پانی جو انتہائی ترکرو تسکینی اثر رکھتا ہے۔ دکھائی دیتا ہے۔ یہ پوری فضا ایک خاص قسم کی "قلوی" بو سے معمور ہے۔

اس جھیل کی ٹھوس سوڈائی سطح نشیب و فراز سے بھری ہوئی ہے، مگر شمال کی طرف یہ منجمد سوڈیم کاربونیٹ آب آمیز ہو کر سیال ہو گیا ہے اور اس کے گرم پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ملتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاندار مخلوق حیرت انگیز طور پر خواہ گرم ہو یا سرد، موافقت پیدا کر لیتی ہے۔

رفتہ رفتہ میری رخصت کا مہینہ ختم ہونے پر آیا اور میں نیروَبی میں ایک دو روز قیام کرنے کے بعد پھر اپنا دلچسپ اور صحت بخش سفر طے کرتا ہوا مومباسا کی طرف لوٹ گیا۔

آپ بیتی

رسیدہ بُود بلائے ولے بخیر گزشت

از: سیّد غلام علی شاہ ۔ فیروز پوری

کوئی پندرہ برس کی بات ہے کہ میرا تمام جسم پھوڑوں اور پھنسیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ بازوؤں، ہاتھوں پر جگہ جگہ پھنسیاں نمودار تھیں اور پنڈلیوں پر خاصی بہار آ رہی تھی۔ اس وقت یہ پھنسیاں معمولی قسم کی عام پھنسیوں جیسی تھیں۔ گرمیوں گرمیوں ان کا خاصا زور رہتا اور سردیوں میں غائب ہو جاتیں۔

موسم گرما ویسے تو سب کو بڑا لگتا ہے، مگر میرے لیے تو عذاب سے کم نہ تھا پھوڑے پھنسیوں سے جان پر بنی رہتی۔ رات دن ان پر مرہم کے توڑے چپکاتا، نیم کی کونپل رگڑ کر لگاتا، کبھی کیلا اور مہندی کا لیپ کرتا مگر پھنسیاں تھیں کہ کسی صورت سے مندمل ہونے کو نام نہ لیتیں۔ سخت گرمیوں میں پاجامہ پہنے رہتا تھا کہ مکروہ ٹانگوں کو لوگ دیکھ کر فقرے نہ کسیں۔

سکول جاتا تو یار دوست تنگ کرتے۔ گھر آتا تو والدین ڈانٹتے "ہر وقت کھجاتا رہتا ہے زخم اچھے ہونے نہیں دیتا کوڑھی بنے گا کیا؟" میں بے بس تھا یہاں بقول غالب یہ حالت تھی ع: زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟ خارش زور کرتی اور میں تمام زخم کھجا ڈالتا۔

والدین نے حکیموں کو دکھایا، ڈاکٹروں سے مشورہ کیا، نیم پیا اور چرائتہ بھی، گندھک نگلی، سارسپریلا زہر مار کیا جس نے جو کچھ بتایا وہی کھایا، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، ٹانگوں کی یہ حالت تھی کہ ہسپتال والے دیکھ کر گھبراتے۔ فقرے کستے، طعنوں کے نشتر چلاتے۔ علاج جاری رہا، میں دل ہی دل میں اپنی بے بسی پر کڑھتا اور چپ رہتا۔ علاج جاری رہا، مصفی خون ادویہ برابر استعمال کرتا رہا اور زندگی کی کئی بہاریں مکھیاں ہٹاتے اور زخم چھیلتے آئیں اور گزر گئیں۔ لڑکپن بیتا، جوانی آئی، نظام جسمانی نے کروٹ بدلی، خون میں جوش آیا اور بیماری نے بھی نیا روپ بھرا۔ پھنسیوں کا خالق فاسد مادہ جسم کے زیریں حصے میں اترنا شروع ہوا۔ پھنسیوں نے بھی بازوؤں سے کوچ کیا اور پنڈلیوں پر ڈیرے ڈال دیے۔

دواؤں کا اثر کہیے یا جوانی کا، پھنسیوں کی حیثیت بدل گئی۔ پہلے معمولی پھنسیوں کی طرح ان میں خون اور پیپ ہوتی مگر اب یہ دونوں غائب، ایک سفید سے آتشی سیال سے یہ چشمے پُر تھے۔ ٹانگوں میں ہر وقت ٹس ٹس ہوتی رہتی۔ اگر پھوڑوں کو پھوڑتا تو چند منٹ بعد پھر بھر جاتے۔ کسی بیرونی مطلق متاثر نہیں ہوتے تھے۔ مرہم بے کار ہو جاتے تھے، حتیٰ کہ نمک اور مرچ چھڑکنے سے بھی مطلق جلن نہ ہوتی تھی۔

اب نئی مصیبت آئی۔ جن ناسوروں کو اب تک چھپائے ہوئے تھا ان کو جلوۂ عام پر لانا ہی پڑا۔ قدرت رسوائی پر تلی تھی۔ پھنسیوں سے یہ "آتشیں لاوا" بہنے لگا۔ اگر پاجامہ یا پتلون پہنتا تو یہ اس میں لگ جاتا اور سوکھ کر

ایک بدنما داغِ جدائی" چھوڑتا اور دیکھنے والوں کو زبانِ حال سے کہتا "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" گرمیوں بھر یہ سوتے رِستے رہتے ہیں اور سردیوں میں خشک ہو جاتے ہیں۔ علاج جاری رہا مرض بڑھتا رہا مگر اس کی ہیئت بدل گئی پھنسیاں دن بہ دن کم ہو رہی تھیں مگر تکلیف زیادہ، سفید آتشیں مادہ زور پکڑ رہا تھا ویسے تو میرے خیال میں تمام جسم میں اس کا اثر تھا مگر ٹانگوں پر زیادہ زور تھا اور بائیں ٹانگ پر خاص کر۔ میں دیر تک کھڑا نہ رہ سکتا تھا جہاں دو چار گھنٹے کھڑا رہ کر کام کرتا یا دو چار میل پیدل چلتا بائیں ٹانگ متورم ہو جاتی اور بائیں ران میں چڈھے کے قریب ایک گلٹی نمودار ہو جاتی جس سے چلنا پھرنا دشوار ہو جاتا۔ گلٹی میں درد ہوتا اور ٹانگ میں حرارت سرایت کرتی ہوئی معلوم ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا گویا ٹانگ کو ۱۰۴ درجے کا بخار ہے۔ باقی جسم کی حرارت حسبِ معمول رہتی۔ اس سے چھٹکارے کی ایک ہی صورت تھی۔ گلٹی پر گرم اینٹ سے ٹکور کرتا اور ٹانگ پر سرد پانی کی پٹیاں بھگو کر لپیٹتا۔ دو چار گھنٹے میں کچھ آرام کرنے سے اور کچھ اس علاج سے طبیعت معمول پر آ جاتی۔

کچھ مدت یوں ہی گزر گئی، پھنسیاں دن بہ دن کم ہو رہی تھیں اور بائیں ٹانگ کی سوزش بڑھتی جا رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مادہ اس میں بھر رہا ہے ٹخنوں پر ورم زیادہ تھا۔ اگر انگوٹھے سے دباتا تو اس میں گڑھا پڑ جاتا یعنی وہاں سے دباؤ کی وجہ سے مادہ ہٹ کر اطراف میں چلا جاتا اور چند منٹ بعد یہ گڑھا بھر لوپر ہو جاتا۔ فاسد مادہ تمام جسم میں پھیل رہا تھا۔ صحت دن بہ دن گر رہی تھی۔ دیکھنے میں تو اچھا خاصا موٹا تازہ تھا۔ اور بہ ظاہر کوئی کمزوری بھی معلوم نہ ہوتی تھی۔ مگر میری حالت دگرگوں تھی۔ ہر وقت سر چکراتا۔ خودکشی کے خیالات دماغ پر مسلط رہتے۔ جی چاہتا کہیں کود کر جان دے دوں۔ فی الحقیقت میں گھن کھائے درخت کی مانند تھا۔

سنہ ۴۶ء کا موسمِ بہار تھا۔ بائیں ٹانگ میں فاسد مادے کا زور تھا۔ سوزش پورے جوبن پر تھی۔ چند پھنسیاں پھوٹی ہوئی تھیں جن سے یہ "لاوا" رِس رہا تھا۔ چلنے پھرنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ اب سوزش مستقل صورت اختیار کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کیوں کہ آرام کرنے سے بھی اس میں معمولی سا فرق پڑتا تھا، ورنہ جوں کی توں قائم رہتی تھی۔ تمام ٹانگ میں ٹس ٹس ہوتی تھی۔ بخار کے دورے پڑنے لگے۔ دوسرے تیسرے دن بخار آد باتا جو کسی دوا سے اتارے نہ اترتا۔ پہلے چند دورے سردی لگ کر پڑے جس سے ڈاکٹروں کو حسبِ معمول ملیریا کا احتمال ہوا چناں چہ ملیریا کا "مستند علاج" یعنے کونین کے ڈوز دیے جانے لگے۔ مگر آہ خاک اثر نہ ہوا بخار آتا اور خوب زور سے آتا۔ سردی لگتی، ٹانگ میں درد ہوتا۔ ہاتھ پیر سو جاتے۔ ٹمپریچر بڑھتے بڑھتے ۱۰۴، ۱۰۵ ہو جاتا سر درد سے پھٹنے لگتا اور نیم بے ہوشی سی طاری ہو جاتی۔ پانچ چھ گھنٹے بعد الٹیاں شروع ہوتیں، پیلے پیلے کڑوے کسیلے پت نکلتے اور طبیعت کو سکون ہونے لگتا اور تقریباً دس بارہ گھنٹے بعد حالت معمول پر آ جاتی۔

"ملیریا سخت قسم کا ہے" ڈاکٹر نے سوچتے ہوئے کہا "کونین کے انجکشن دینے پڑیں گے" چنانچہ انجکشن دیے جانے لگے۔ صبح انجکشن، شام کو بخار، دو ہفتے گزر گئے اسپرین ملیریا کا "شرطیہ علاج" ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے زور دیتے ہوئے فرمایا اور والدہ زبردستی دو گولیاں اسپرین کی مجھے نگلوانے لگیں۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ گولیاں نگلتا رہا۔ بھوک ختم، قبض قائم، سر بھاری، چلنے کی سکت نہیں۔ یہ میرا حال تھا۔ علاج "مستند" تھا مگر بخار نہیں اترا۔

"ذرا قمیض اور بنیان اتار دیجیے" لیڈی ڈاکٹر نے نرمی سے کہا "مجھے آپ کے پھیپھڑوں کا معائنہ کرنا

ہو۔ ڈھب ڈھب۔ ڈھب۔ ڈھب۔ لیڈی ڈاکٹر نے میری پسلیاں بجائیں۔" آپ ایک تھرما میٹر خرید لیجیے۔ اور دن میں تین بار صبح، دوپہر اور شام ٹمپریچر لے کر مجھے روز دکھائیے۔ مجھے ڈر ہے مرض بڑھ جائے۔"

میں نے تھرما میٹر خرید لیا۔ روزانہ تین وقت ٹمپریچر نوٹ کرتا اور ڈاکٹر کے حضور میں گزارتا۔ بخار کبھی ہوتا۔ کبھی نہ ہوتا۔ مگر مجھے یقین ہو رہا تھا کہ تپِ دق کا فتویٰ ملنے والا ہے۔ پندرہ روز بعد ڈاکٹر صاحبہ نے" عام کمزوری" تشخیص فرمائی، اور ایک امریکن پیٹنٹ ٹانک پینے کا مشورہ دیا۔ میں نے سوچا چلو اسے بھی آزما دیکھو۔ ٹانک پینا شروع کر دی۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ بخار جو دوسرے تیسرے آدبوچتا تھا۔ اب پانچویں چھٹے آنے لگا۔ بات اتنی تھی کہ ٹانک نے جسم میں قوتِ مدافعت کو تقویت دے کر بخار کو کچھ دیر دور رکھنے کے قابل بنا دیا تھا۔ چنانچہ ٹانک ختم کرنے کے بعد چند روز بعد حسبِ معمول بخار کے دورے پڑنے لگے۔

اب میں ڈاکٹر اور حکیموں سے ناامید ہو چکا تھا۔ البتہ حکیموں سے بیزاری اس قدر نہ تھی جتنی کہ ڈاکٹروں سے۔ تھوڑی بیزاری کی وجہ یہ تھی کہ میرے خیال میں یہ لوگ دقیانوسی طریقِ علاج کے حامل اور فنِ دواسازی سے ناواقف تھے۔

دنیا امید پر قائم ہے۔ میں بے آس نہ ہوا۔ دل نے کہا۔ ہومیوپیتھک علاج بھی آزما کر دیکھ لو۔ میں نے سنا اور پڑھا تھا کہ اس طریقِ علاج میں پھوڑے پھنسیوں کا علاج بلا نشتر و مرہم محض کھانے کی دواؤں سے کامیابی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شہر کے سب سے بڑے سند یافتہ ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے خوب دیکھ بھال کر کے سب سے پہلا سوال مجھ سے یہ کیا "کہیے آپ کے کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" میں یہ سوال سن کر کچھ بھونچکا سا ہوا، اور بالکل نہ سمجھا کہ آخر چوٹ کا کیا موقع ہے۔ یہ سمجھ کر کہ شاید کچھ اور کہا ہو اور میں نہ سمجھا ہوں، میں نے ڈاکٹر صاحب سے جواب میں کہا "معاف کیجیے ڈاکٹر صاحب میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"، ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ اسی سوال کو دہرایا "میرا مطلب یہ ہے کہ کہیں آپ نے چوٹ یا ضرب تو نہیں آئی؟" میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے ذرا اصرار کیا اور فرمایا کہ "دیکھیے۔ یاد کر لیجیے کوئی مضائقہ کی بات نہیں" میں نے کہا جناب میرے ہوش میں تو کبھی کوئی ایسی چوٹ نہیں آئی جو قابلِ ذکر ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "کیا ڈر ہے اپنی والدہ وغیرہ سے پوچھ لیجیے گا۔ ممکن ہے کبھی آپ ان کی گود سے یا پنگوڑے سے گرے ہوں" میں نے کہا "ہاں صاحب اس کی میں کہتا نہیں۔ باقی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ چوٹ پر اس قدر زور کیوں دے رہے ہیں۔ کیا ہومیوپیتھک علاج کرنے سے پہلے چوٹ کی علامت پیدا کرنا ضروری ہے؟"

اس پر ڈاکٹر صاحب کچھ شرما سے گئے، کہنے لگے "جی نہیں، ویسے ہی پوچھتا تھا۔ اصل میں اگر آپ لوگ صحیح صحیح باتیں شروع ہی میں بتا دیں تو علاج صحیح ہوتا ہے ورنہ ہوتا یہ ہے کہ مریض بعد میں ہم کو بتاتا ہے کہ وہ کبھی گرا تھا یا اس کے چوٹ آئی تھی۔ اس سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ شروع کا علاج تقریباً بےکار سا ہوتا ہے" خدا خدا کر کے میں ان سوالوں کی بوچھاڑ سے فارغ ہوا اور دوا شروع ہوئی سلفر سے شروع کیا اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو پندرہ بیس دن میں کوئی دس بارہ دواؤں کی الٹ پلٹ کر ڈالی، مگر کچھ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

مجھے انھوں نے جواب تو نہیں دیا، ان کے غیر متعلق جوابات سے کچھ میں ہی گھبرا کر چلا آیا۔ مثلاً اس کے بعد انھوں نے خارش کے متعلق پوچھا، اتفاق سے اس وقت تک خارش ہمارے ہاں کسی کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں

نے اس کا بھی جواب نفی میں دیا۔ اس پر وہ کچھ اس انداز سے پیش آنے لگے جیسے میں ان سے اب تک جھوٹ بولتا رہا تھا۔ غرض آخر میں نوبت یہ ہوئی کہ کچھ میں ان سے گھبرایا اور کچھ وہ مجھ سے مایوس ہوئے اور علاج بند کر دیا گیا۔

ماہ جولائی سنہ ۴۳ء میں میں نے ہر قسم کے علاج کو چھوڑ دیا اور خدا کے آسرے پر پڑ رہا۔ دل نے کہا کہ زندگی ہوگی تو صحت کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔ تقدیر کے آگے تدبیریں بے بس ہوتی جاتی ہیں۔ چارپائی پر پڑے پڑے کتب بینی میں مشغول رہتا۔ والدین متفکر تھے اور میں مایوس۔ فیل پا بڑھتا چلا جاتا تھا۔

ایک دن ایک پرانی وضع کے دوست عیادت کو تشریف لائے۔ ٹانگ کی حالت دیکھی۔ علاج معالجے کی تفصیلات دریافت کیں۔ میں نے شہر کے تمام ڈاکٹروں اور حکیموں کے نام گنوا دیے اور وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"ارے بھئی حکیم تلک رام سے بھی مشورہ کر لیتے۔" وہ یکایک بولے۔ "وہ کون ہیں؟" میں نے تعجب سے کہا اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے انھیں نہ دیکھا تھا اور نہ ان کے متعلق اپنے ملنے جلنے والوں سے کچھ سنا ہی تھا۔

"ارے وہی بڈھے سے ذرا بھاری جسم کے ہیں، کوچہ نمبر ۲ میں ان کی دکان ہے۔"

"ابھی رہنے بھی دو، ہوں گے کوئی دقیانوسی غیر معروف سے عطائی۔ اگر قابل ہوتے تو کچھ تو مشہور ہوتے" میں نے جواب دیا۔

بہت رد و کد کے بعد میرے دوست نے اس بات پر رضامند کر لیا کہ حکیم تلک رام سے علاج کے لیے رجوع کروں۔ اسی شام کو میں بتائے ہوئے پتہ کے مطابق حکیم صاحب کی دکان پر جا پہنچا۔

دو دروازوں کا ایک مختصر سا کمرہ تھا، اس میں وہ مطب کرتے تھے۔ وہ خود بھی پرانی وضع قطع کے آدمی تھے۔ اور کمرے میں فرش اور آرائش سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ ان کا مذاق خالص مشرقی ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک مرد پیر ریش بائیں صاف ستھرا انگرکھا، آزار پاجامہ اور دو پلڑی ٹوپی پہنے نہایت باوقار انداز سے بیٹھا مطب کر رہا ہے۔ جس وقت میں مطب میں پہنچا تو آٹھ دس مریض باقی رہ گئے تھے۔ وہ ہر ایک کی نبض پر دو منٹ تک ہاتھ رکھ کر دیکھتے، اور اس دوران میں تھوڑی دیر کے لیے اس طرح آنکھیں بند کر لیتے جیسے کوئی مراقبہ میں چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد مریض پر سر سے پاؤں تک نظر ڈالتے اور پیٹ اور زبان وغیرہ کا معائنہ فرمانے کے بعد دریافت فرماتے "کہیے آج کل آپ کو کیا خاص شکایتیں ہیں؟" اور مریض کا پورا حال سننے کے بعد نسخہ تجویز فرماتے۔ حکیم صاحب کے مطب کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی مگر نہایت معقول دوکان تھی۔ اس پر سے مریض اپنے نسخے بندھوا رہے تھے۔ اس دکان پر ہر چیز نہایت قرینے سے لگی تھی۔ اور نسخے باندھنے والا بھی مریضوں کے ساتھ نہایت اچھی طرح پیش آ رہا تھا۔

تیس منٹ کے انتظار کے بعد میرا نمبر آیا۔ حکیم صاحب نے میرا بھی اسی طرح معائنہ کیا۔ میں نے حال کہنے سے پہلے اپنی ٹانگ دکھا دی۔ حکیم صاحب نے اسے دیکھنے اور میری پوری ہسٹری سننے کے بعد کہا "یہ اگست کا تیسرا ہفتہ ہے، میں آپ کا باقاعدہ علاج ستمبر کے پہلے ہفتہ سے شروع کروں گا۔ اس وقت میرے پاس تشریف لائیے اس دوران میں کسی خاص دوائی علاج کی ضرورت نہیں ہے۔" انھوں نے مجھے کچھ ضروری غذائی پرہیز بتا دیا اور وعدہ کیا کہ ستمبر سے میرا علاج شروع کر دیا جائے گا۔

اس پر میں قدرے حیران ہوا کہ عجیب حکیم ہے کہ علاج سے گریز کر رہا ہے۔ میں تو تکلیف سے بے حال ہوں اور کہتا ہے ستمبر کے پہلے ہفتہ سے علاج شروع کروں گا۔ ابھی موسم نہیں ہے۔ گویا جب مریض مر جائے گا جب اس شخص کے

نزدیک موسم آنے لگا۔ خیر علاج چوں کہ کرانا تھا ان ہی سے اس لیے تہرِ درویش بر جانِ درویش اس وقت تک حسب ہدایت غذائی پرہیز کیا جو خاصا سخت تھا۔

ستمبر کے پہلے ہفتہ میں حاضر ہوا۔ حکیم صاحب نے جگر اور معدے میں خرابی کے ساتھ ساتھ جسم میں فاسد مادوں کی زیادتی تشخیص کی چنانچہ ان کا پہلا دوائی نسخہ سفوف سورنجان، حب کبد نوشادری اور معجون عشبہ وغیرہ ادویہ پر مشتمل تھا۔ دو ہفتہ تک میں ان ہی دواؤں کو استعمال کرتا رہا۔ اس کے بعد انھوں نے دو بڑے بڑے جلاب دیئے اور پھر وہی دوائیں شروع کرا دیں۔ کچھ عرصے بعد پھر دو جلاب دیے اور پھر یہی دوائیں دینا شروع کر دیں۔ ہر چند میں کچھ تھوڑا سا گھبرا گیا تھا مگر چوں کہ میرے مرض کو اس قدر فائدہ ہوا تھا کہ میں ہر قسم کی تکلیف کو اس کے آرام کے مقابلے میں ہیچ سمجھتا تھا۔ میرا بخار غائب تھا، قبض ختم ہو چکا تھا، بھوک باقاعدہ لگنے لگی اور ٹانگ کی موٹائی نصف سے کم رہ گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ حکیم صاحب کی "دقیانوسی ادویہ" نے وہ کام کیا جو ماڈرن ڈاکٹروں کی "سائنٹی فک" طریق سے تیار شدہ دوائیں نہ کر سکیں۔

ابھی علاج جاری تھا کہ میری تبدیلی ہو گئی۔ حکیم صاحب نے علاج جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ میں نے بخوشی منظور کیا اور کچھ یونانی دوائیں ساتھ لے کر کلکتہ چلا آیا مگر یہ کافی ثابت نہ ہوئیں اور علاج زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔

حکیم کہاں، مریض کہاں۔ اتنے فاصلے پر رہ کر علاج باقاعدہ طور پر جاری رکھنا مشکل تھا۔ مرض ابھی ۲۰ فی صدی باقی تھا اور کبھی کبھی ٹانگ کی شورش بڑھ جاتی تھی۔ لیکن اب مجھے چنداں پروا نہ تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تمام فساد کی جڑ جگر اور معدے کی خرابی تھی اور فی الواقع ایسا ہی تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب تک میرے معدے میں کوئی گڑبڑ نہ ہوا اور قبض نہ ہو جائے ٹانگ کی حالت خراب نہ ہوتی تھی، مگر جوں ہی قبض ہوتا اور نظام ہضم و دفع میں نقص آتا، ٹانگ کی حالت پر اس کے اثرات ظاہر ہونے لگتے۔ اس لیے میں قبض اور ہاضمے کا خاص خیال رکھتا اور دوسرے تیسرے ایک آدھ حب کبد استعمال کر لیتا اور معاملہ ٹھیک ہو جاتا۔

اگست سنہ ۴۴ء کا ذکر ہے میں اپنے صندوق کی تلاشی لے رہا تھا کہ "ہمدرد صحت" کی ایک پرانی کاپی ملی اور میں نے وقت گزاری کے لیے اسے پڑھنا شروع کیا۔ اس میں قدرتی علاج پر بہت زور دیا گیا تھا۔ میں مضامین سے بہت متاثر ہوا۔ دل میں سوچا چلو سینما کا ایک شو نہ سہی۔ اس کے چندہ کا ایک روپیہ ارسال کر دیا گیا۔

ہمدرد صحت میں پیش کردہ لٹریچر سے میں کافی متاثر ہوا اور ارادہ کر لیا کہ باقی ماندہ مرض سے چھٹکارا قدرتی علاج سے کروں گا۔ چناں چہ میں نے ادویہ کا استعمال بالکل بند کر دیا۔ اپنی روزانہ خوراک میں زبردست تبدیلیاں کیں، روزانہ گوشت کھانا ترک کر کے سبزیاں کھانا شروع کر دیں۔ اس کے علاوہ چوکر ملی روٹی اور موسمی پھلوں کا استعمال کثرت سے کیا جن میں انناس میرے لیے خاص طور پر مفید ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں کبھی کبھی فاقہ بھی کر لیتا۔ ورزش کے سلسلے میں صرف چہل قدمی پر اکتفا کیا۔ کبھی کبھار آسن والی ورزشیں بھی شروع کر دیا کرتا تھا۔ قصہ کوتاہ۔ قدرتی علاج نے مجھے دواؤں سے بالکل بے نیاز کر دیا ہے اور اب نہ صرف میری بائیں ٹانگ بالکل اور مستقل طور پر تن درست ہے، بلکہ عام جسمانی و دماغی حالت پہلے سے بدرجہا بہتر ہے۔ بھوک کھل کر لگتی ہے، قبض ختم ہے، چلنے پھرنے کا تو ذکر ہی کیا، اب تو دو چار میل آسانی سے دوڑ سکتا ہوں۔ البتہ اتنا کہوں گا کہ حکیم صاحب کے منضج و مسہل استعمال نہ کرتا تو شفا مشکل تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسی خطرناک بیماری سے نجات پائی۔ ؎

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

صحت و قوّت

قائم رکھنے والے عناصر

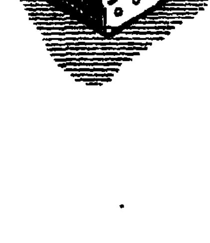


غدہ نخامیہ، تھائرائڈ گلینڈ، دل، گردے اور انثیین، وہ
اعضا ہیں جن کے صحیح فعل پر صحت و قوت
اور شباب کا انحصار ہے۔ ان میں سے کسی
ایک فعل کی خرابی سب کی خرابی
بن سکتی ہے۔

حبّ مبہی خاص

ایسے اجزا سے مرکب ہے جو ان اعضا کی افعال کو صحیح رکھتے
ہیں، یہی وجہ ہے کہ حب مبہی خاص استعمال کرنے والے
صحت و قوت اور شباب سے ہمکنار رہتے ہیں۔

(اسے صرف مرد ہی استعمال کرسکتے ہیں)



حبّ مبہی خاص

قیمت فی شیشی (بیس دن کے لیے) دس رُپے

ہمدرد دواخانہ، دہلی

بچے کی پیدائش

"مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ شاید قدرت کا یہ منشا بھی نہ تھا کہ تکلیف ہو"

میں زچگی اور دایہ گری کی لائن میں پریکٹس کرنے والی ایک ڈاکٹر ہوں۔ میری فنی قابلیتوں نے خاصی مقبولیت بھی حاصل کر لی ہے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ ایک عورت کے بچہ پیدا ہونے والا تھا اور اس سلسلے میں میری طلبی تھی۔ دو اور تین بجے شب کے درمیان میں اپنی بائیسکل پر چلی جا رہی تھی۔ بارش ہو رہی تھی اور راستے میں پانی اور کیچڑ کا مقابلہ میرے لیے پریشان کن تھا مگر فرض کی ادائیگی بھی ضروری تھی۔

جب میں چند تاریک گلیاں طے کر کے اس مکان پر پہنچی جہاں مجھے بلایا گیا تھا تو مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کمرے کی حالت دیکھتے ہی مجھے اس کے مکین کی حالت کا اندازہ ہو گیا۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا، بارش کی بوچھاڑیں ہوا کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اندر آجاتی تھیں۔ مریضہ جس پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اس کا بستر جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ مریضہ کے جسم پر صرف ایک کالی چادر تھی، اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس پر کپڑے کے چند بڑے بڑے تھیلے ڈال دیے گئے تھے۔ کمرے کے ایک گوشے سے ٹمٹماتی ہوئی موم بتی کی ناکافی روشنی آرہی تھی۔ ایک پڑوسی نے کچھ پانی اور ایک بڑا آبی ظرف مہیا کر دیا تھا۔ تولیا اور صابن مجھے اپنے پاس سے استعمال کرنا تھا اگرچہ یہ ماحول حوصلہ افزا نہ تھا، مگر جلد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ مکین اچھے ہیں اور اس غریبانہ فضا میں شرافت اور شفقت کے عناصر بڑی مقدار میں موجود ہیں۔

بہرحال میں نے ابتدائی کاموں کی طرف جلد توجہ کی۔ مریضہ دردِ زہ میں مبتلا تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد بچہ پیدا ہوا۔ مریضہ نے وضع حمل کے وقت ذرا بھی شور و غل سے کام نہیں لیا تھا اور نہ اس سے کوئی اضطراری حرکتیں ظاہر ہوئی تھیں میں نے بچے کی پیدائش سے پہلے مریضہ کو ترغیب دی تھی کہ وہ مجھے تھوڑا سا کلوروفارم دینے کی اجازت دے لیکن اس نے متانت اور شفقت کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ بچہ کی پیدائش کے جب میں نے اس سے اس کا سبب پوچھا، تو اس نے فوراً جواب نہیں دیا اور اس بوڑھی دایہ کی طرف سے جو میری مددگار کی حیثیت سے کام کر رہی تھی نگاہیں پھیر کر کھڑکی کی طرف دیکھا، جہاں صبح کی پہلی ہلکی روشنی نمودار ہونی شروع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے میری طرف رخ کیا اور کسی قدر شرمیلے لہجے میں کہا: "مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ شاید قدرت کا یہ منشا نہ تھا کہ تکلیف ہو۔ کیوں؟

اس زچہ نے کلوروفارم جیسے مخدر کے استعمال سے پرہیز کرنے کا جو سبب بتایا، اس میں ایک بڑی حقیقت پنہاں تھی۔ یہ میرے لیے ایک اہم دعوتِ غور و فکر بن گئی۔ اس کے بہت دنوں بعد تک جب بھی میں اپنے پیشے کے سلسلے میں کبھی ایسی حاملہ عورت کے روبرو ہوتی جس کے وضع حمل کا زمانہ قریب ہوتا اور وہ بچے کی پیدائش کے خیال سے خوف زدہ

اور مبتلائے اذیت ہوتی تو مذکورہ بالا واقعہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا اور یہ فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگتا "مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ شاید قدرت کا یہ منشا بھی نہ تھا کہ تکلیف ہو۔ کیوں؟"

آخرکار رفتہ رفتہ مجھ پر یہ منکشف ہونے لگا بلکہ یوں کہیے کہ میرا قدامت پسند دماغ بھی یہ محسوس کرنے لگا کہ صحت کی معمولی اور معتدل حالت میں کوئی ایسا عضوی فعل نہیں ہے جس سے انسان کو درد یا تکلیف ہوتی ہو اور چونکہ بچے کی پیدائش بھی عورت کے لیے ایک ابتدائی اور حیاتیات کی رو سے نشوونما کے اوّلین دَور کا عضوی فعل ہے، اس لیے قدرت کا حقیقی منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ وضع حمل میں تکلیف کا عنصر موجود نہ ہو۔

اب میرے سامنے ایک اہم سوال تھا۔ اس کا کیا سبب ہے کہ بعض عورتیں دردِزہ کی شدید اور ناقابلِ برداشت تکلیف میں مبتلا ہوتی اور بعض کو بظاہر کوئی تکلیف نہیں ہوتی؟ اسی سے دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عورت کی وقتی جذباتی حالت کی ذمہ داری دردِزہ پر ہے یا عورت کے سخت و شدید دردِزہ کی ذمہ داری اس کی جذباتی حالت پر ہے۔

گزشتہ سترہ سال سے میں یہی کوشش کر رہا ہوں کہ متمدن دنیا کی عورتوں کے دردِزہ کے اسباب کی تشریح پیش کروں اور یہ ثابت کروں کہ جو سخت و شدید تکلیف پیدائش اولاد کے وقت ہوتی ہے اس میں کافی حد تک کمی کی جا سکتی ہے، یہ تو صحیح ہے کہ جو خیال میں نے پیش کیا ہے وہ صرف معتدل اور غیر پیچیدہ قسم کے وضع حمل پر صادق آتا ہے لیکن چونکہ بچے کی ولادت کے واقعات تقریباً ۹۵ فی صدی معتدل اور غیر پیچیدہ ہی ہوتے ہیں اس لیے دردِزہ کے اثرات میں تخفیف کی جا سکتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو قومیں جس قدر زیادہ متمدن ہوگئی ہیں اسی قدر انھوں نے بچے کی پیدائش کے فعل کو تکلیف دہ اور خطرناک کہنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ عمر کے ابتدائی زمانہ ہی سے لڑکیوں کو اس خوف ناک گھڑی سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ یہ خوف زدگی اور اندیشہ ان کے دماغ میں، پھر ان کے جسم کے عضلات میں ایک قسم کا مخالفانہ یا "تحقیقاتی" تناؤ پیدا کر دیتا ہے۔

وضع حمل کے وقت عضلات کے تین جوڑ یا مجموعی رحم کی حرکتوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ایک مجموعۂ عضلات جس کی پہلی کھچاوٹیں یا اینٹھنیں عورت کو آگاہ کرتی ہیں کہ دردِزہ شروع ہوگیا ہے، آہستہ آہستہ بچے کو رحم مادر سے باہر کی طرف نچوڑتا یا کھینچتا ہے۔ دوسرا مجموعہ جو رحم سے بچے کے نکلنے کی نگرانی کرتا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ معتدل اور فطری وضع حمل کی حالت میں ڈھیلا ہو جائے اور ان عضلات میں تناؤ باقی نہ رہے۔ اگر بچہ جننے والی عورت کا دماغ پہلے ہی سے ادھر اُدھر کی باتوں اور دوسری عورتوں کی افسانہ طرازیوں یا جھوٹی کہانیوں سے متاثر ہونے کے باعث پہلی ہی "کھنچاوٹوں" سے پیدا ہونے والے نئے احساسات کی تعبیر "درد" سے کرے گا تو اس خیالی اور متوقع "درد" کا نتیجہ خوف و دہشت کی صورت میں نمودار ہوگا۔ پھر یہ خوف عضلاتی تناؤ پیدا کرے گا اور اس سے حقیقی درد اور سچی تکلیف محسوس ہونے لگے گی جس سے کہ "دردِزہ" کی مدت میں اضافہ اور بعض دوسری پیچیدگیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں، اور کلوروفارم کی نوبت آسکتی ہے۔

اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خوف، درد، تناؤ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جو وضع حمل کے لیے "قدرتی منشا" یا "قدرتی نظم و ترتیب" میں شامل نہیں ہیں بلکہ تمدن کے ارتقا کے ساتھ داخل ہوئی ہیں۔ اگر خوف، درد، تناؤ میں چولی دامن کا ساتھ ہے تو یقیناً یہ ممکن ہے کہ خوف کو کم کرکے اور تناؤ کو دور کرکے وضع حمل سے درد و کرب کے عنصر کو نکالا جائے

—

یا بڑی حد تک اس میں تخفیف کی جائے۔

ہر ماہر معالجات کو معلوم ہے کہ نفسیاتی اشارے یا ترغیب سے تکلیف پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر وضع حمل کے وقت عورت سے یہ کہا جائے کہ "درد تو ہوتا ہی ہے، درد لازمی ہے گھبراؤ نہیں، آنکھوں کو بند کرو۔ دانتوں کو دباؤ" تو یہ اشارات اس کے دماغ پر اثر کر کے مزید درد و کرب پیدا کریں گے۔ بچہ جننے والی عورت کی بوڑھی ماں جب یہ کہتی ہے کہ "بیٹی درد پھر درد ہے۔ پوری ہمت سے کام لینا گھبرانا نہیں تو یقین کیجیے کہ درد پیدا کرنے والا اس سے بہتر "نسخہ" کوئی نہیں ہے۔

بعض لیڈی ڈاکٹر بھی اپنے خیال میں عورت کا دل بڑھاتے ہوئے اور پورے خلوص کے ساتھ اس کو تسکین دیتے ہوئے بار بار دردِ زہ کی شدت کی "تصدیق" کرتی جاتی ہیں اور کہتی ہیں "ابھی گھبرانے کی کیا بات ہے اگر تکلیف حد سے زیادہ ہوگی تو کلوروفارم دے کر کم کر دی جائے گی۔ ابھی تم ہمت نہ ہارو۔ جب تک ہو سکے برداشت کرو۔"

ان تمام مہمل باتوں کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ خوف دل و دماغ پر طاری ہو کر درد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہی وہ جڑواں بھائی ہیں جو بچے کی پیدائش کے قدرتی نقشے میں خلل انداز ہوتے ہیں۔

نوجوان لڑکیاں اپنی ساتھیوں، سہیلیوں اور ایسی عورتوں سے جو بچہ پیدا کر چکی ہیں وضع حمل کی تکلیفوں کے واقعات اور مبالغہ آمیز بیانات سنتی ہیں اور ہر عورت یہی ظاہر کرتی ہے کہ اسے بچہ جننے کے وقت شدید تکلیفوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ کوئی کہتی ہے "میرا تو دم لبوں پر آگیا تھا۔ کوئی کہتی ہے "میں مرتے مرتے بچ گئی"۔ کوئی کہتی ہے "میں تو خدا کے گھر سے واپس آئی"۔

اسی طرح کتابیں، اخبارات سینما وغیرہ عورت کی آنکھوں کے سامنے خوف پیدا کرنے والی تصویریں پیش کرتے رہتے ہیں ایسی حالت میں کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم صحیح تعلیم کے ذریعے یہ بتائیں کہ ماں بننے میں کتنی سچی اور فطری مسرتیں پنہاں ہیں اور بچہ جننے کے عمل سے ماں کو کبھی خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح وہ دماغ اور جسم کی نہایت پُرامن حالتوں میں ایام زچگی کا انتظار کرے گی، اور آنے والی گھڑی کو تکلیف دہ کے بجائے مسرت انگیز سمجھنے لگے گی۔

یہی صورت حال "دردِ زہ" کے وقت کی بھی ہے۔ بچہ جننے کے عمل کے لیے "درد" کا لفظ صحیح نہیں ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ معتدل استقرارِ حمل اور وضع حمل کی حالتوں میں ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو کسی عورت کو تکلیف پہنچا سکے یا اس کی صحت کو خراب کرے یا اس کے لیے مسرت بخش ہونے کے سوا کوئی کام بھی ایسا کرے جس میں اس کی جسمانی قوت و استحکام میں کوئی نقص واقع ہو جائے۔ اگر خوف کا عنصر اس سے نکال دیا جائے تو "درد و کرب" کا عنصر غالب ہو جائے گا۔ گزشتہ دس پندرہ سال میں کچھ ایسے ذرائع پیدا کیے گئے ہیں جو خوف کے عنصر کو دور کر سکیں اور ان سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ درد کا عنصر بھی کم ہو جاتا ہے میں یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ مستقبل قریب میں درد کو وضع حمل کا لازمہ قرار نہیں دیا جائیگا اور درد و کرب کے ساتھ بچے کی پیدائش زمانۂ ماضی کی ایک کہانی بن جائے گا۔

اگر عورتیں حقیقت سے ناواقف ہوں تو وضع حمل کے خوف سے ان کا بچاؤ ممکن نہیں ہے۔ ہم حقیقتوں سے نہیں ڈرتے بلکہ مشکوک و مشتبہ حالات سے ڈرتے ہیں۔ عورتوں کو بچہ جننے کے متعلق ابتدائی معلومات بھی نہیں پہنچائی جاتیں جب ابتدائی انسان کا دماغ دہشت پیدا کرنے والے ماحول سے بری تھا تو ایسی معلومات کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ازمنہ وسطیٰ میں جو پروپیگنڈا کیا گیا اس کی تردید کی اب تک کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اجداد کے نسل کی حیرت انگیز دل چسپیوں کو عورت سے چھپایا جاتا ہے۔

اس سلسلے کی معمولی سے معمولی باتوں سے بھی بعض عورتیں ناواقف ہوتی ہیں۔ میں ایسی متعدد شادی شدہ عورتوں کو جانتی ہوں جو ایامِ حمل کی بہت آگے بڑھی ہوئی منزلوں میں تھیں اور پھر بھی یہ عقیدہ رکھتی تھیں کہ ان کا بچہ ناف کی راہ سے پیدا ہوگا۔ اس لیے میں نے یہ کوشش کی کہ عورتوں کو ضروری باتیں بتائی جائیں اور حقیقتوں کی تعلیم دی جائے۔ میں یہ کرتی ہوں کہ جوں جوں حمل کے مہینے گزرتے جاتے ہیں میں حاملہ عورت سے ایامِ حمل اور وضعِ حمل کا فسانہ کہتی جاتی ہوں اور ارتقائی منزلوں کے متعلق عام اور صحیح معلومات بہم پہنچاتی جاتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں حرکت کرنے لگے، ماں کو یہ بتا دینا چاہیے کہ پہلی ہلکی ہلکی ارتعاشی حرکتیں جب محسوس ہونے لگیں تو سمجھنا چاہیے کہ بچے نے اپنے عضلات کو کام میں لانا شروع کیا ہے۔ میں حاملہ عورت کو ایک آلہ "سینہ بین" (اسٹیتھوسکوپ) بھی دے دیتی ہوں تاکہ وہ اپنے بچے کے قلب کی حرکتوں کو "سننے" لگے۔

میری یہ کوشش بہت حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ بہت سی عورتیں خود بہ خود حقیقتوں کو محسوس کرنے لگیں بلکہ اس امر کا یقین کرنے لگیں کہ بچے کی پیدائش میں درد و کرب کوئی لازمی چیز نہیں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ صرف اتنا ہی کافی نہ تھا بلکہ کوئی ایسا طریقہ معلوم کرنا تھا جس سے دشمن کے اصلی حربے یعنی "تناؤ" پر فتح حاصل کی جا سکے۔ اس لیے جسمانی سکون و آرام کا عمل بھی اس میں داخل کیا گیا۔ اگر جسم کامل طور پر ڈھیلا کر کے آرام کیا جائے تو جذبۂ خوف کا باقی رہنا ممکن نہیں ہوتا۔

یہ عمل یعنے ہر طرح کی حرکتوں سے بے تعلق ہو کر کامل سکون کے ساتھ تمام اعضا کو ڈھیلا کر کے پلنگ پر کچھ دیر لیٹے رہا جائے۔ پہلے ہاتھوں سے شروع کیا جاتا ہے، اور پھر باقی سب اعضا کو رفتہ رفتہ اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس حصولِ سکون کو قدرتی وضعِ حمل کا ایک ضروری جزو سمجھنا چاہیے۔ بچے کی پیدائش کے وقت عورت کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے رحم کی وقتی حرکتوں میں کوئی گہری اور عملی دلچسپی نہ لے۔ میں نے دردِ زہ کی حالت میں اکثر عورتوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ "تم اپنی کوئی کوشش نہ کرو۔ اپنے رحم کو اس کا موقع دو کہ وہ تمہاری مدد اور تمہاری سرگرمیوں کے بغیر اپنا قدرتی فعل انجام دے۔ اگر تم اس کے کاموں میں مداخلت کرو گی تو اس میں آزردگی و مخالفت پیدا ہوگی اور یہی چیز تمہارے لیے درد و تکلیف کا باعث بن جائے گی۔ تم اس کام میں جلدی کرنے کا خیال نہ کرو۔ قدرت خود دروازہ کھولے گی۔" میں نے دیکھا کہ اس طرح کا مشورہ تقریباً ہمیشہ مفید ہوتا ہے، اور جب بھی اس پر عمل کیا گیا تکلیف میں کمی ہوگئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کے لیے یہ امتحان کا وقت ہوتا ہے اور اس موقع پر وہ کبھی دوسروں کی مدد کی طالب بھی ہوتی ہے لیکن یہ امتحان ایسا ہے جس میں عورت کا اصلی روپ ظاہر ہوتا ہے۔ صابر اور بے صبر، مطمئن اور غیر مطمئن، باہمت اور بزدل، بعض اس ذہنیت والی کہ "میں کر سکتی ہوں اور کروں گی" بعض اتنی مایوس کہ "مجھ سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔" الغرض مختلف قسم کی عورتوں سے وضعِ حمل کے وقت مختلف قسم کا سلوک کرنا پڑتا ہے۔ پھر بھی یہ ضروری ہے کہ وضعِ حمل کے وقت وہ اپنے رہنما کی امدادی سرگرمیوں سے سکون حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اگر رہنما اچھا ہے اور اسے مناسب ہدایتوں کے ذریعے ہمت دلائے تو عورت خاصی دلیر اور متحمل ہو جاتی ہے۔

میں نے دو سال میں اس کا بڑا تجربہ کیا ہے کہ سکونِ اعضا اور تلقینِ صبر و تحمل اور خوف کا عنصر نکال دینے سے بہت اچھے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ عورت کے رویے میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور تکلیف کے متعلق اس کا نظریہ بالکل

بدل جاتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ بہت سی عورتوں نے اپنے ہاتھ میں آلۂ تخدیر لے کر اس کے استعمال سے واقف ہوتے ہوئے بھی مخدر لینے سے انکار کر دیا۔

میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ کسی عورت کو اتنی تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہیے جو اس کی حد برداشت سے زیادہ ہو اور سائنس نے جتنے طریقے دریافت کیے ہیں ان کو کام میں لا نا قابل برداشت اور خطرناک تکلیف کو ضرور کم کرنا چاہیے مگر معمولی اور معتدل وضع حمل کی حالتوں میں عورتوں کی بہت بڑی تعداد مخدر سے پرہیز کرنا چاہتی ہے۔

میں پُر زور طریقے پر اس نئی تحریک کی مخالف ہوں کہ "تمام عورتوں کو دردِ زہ میں مخدر دینا چاہیئے" آج کل کثیر ماہرین دایہ گری اس پر عمل کرنے لگی ہیں۔ میرے خیال میں یہ ایک جرم ہے کہ جو ماں معتدل حالات میں یہ چاہتی ہو کہ وضع حمل کی محنت کے بعد اپنے آخری انعام سے مسرت یاب ہو، اس کے احساس و شعور کو مخدر کے ذریعے مردہ بنا دیا جائے۔ مزید برآں اب تک کوئی ایسا مخدر دریافت نہیں ہوا ہے جو تمام بچہ جننے والی عورتوں کے حالات کے موافق ہو بعض مخدر تو ایسے ہیں کہ وضع حمل کے قدرتی عمل اور قدرتی طاقتوں ہی کو بگاڑ دیتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو زچہ اور بچہ دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

فن دایہ گری اور زچگی کے تمام ماہرین Obstetricians کو تعلیم کے ذریعے سے اس بات کا یقین دلا دیا گیا ہے کہ عورت کو وضع حمل میں درد اور تکلیف کا ہونا لازمی ہے۔ اس لیے انھوں نے یہ عام طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہر عورت کو چاہیے اس کا وضع حمل معتدل ہو یا نہ ہو اس کو کچھ مخدر ضرور دے دیتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ اگر کوئی عورت یہ کہتی ہو کہ اسے تکلیف نہیں ہے تو اس کی بات کا یقین نہیں کیا جاتا۔

میرے سامنے ایسے ڈاکٹروں کی تصویریں پھر رہی ہیں جو بڑے بڑے سفید کوٹ پہنے ہوئے ایک ایسے حربہ کی تلاش میں ہیں جس کے ذریعہ تمام عورتوں کو ایسے خیالی دشمن سے بچایا جائے جس کا پچانوے فی صدی حالتوں میں وجود ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ اس ذریعہ سے شہرت اور دولت کے متلاشی ہیں اب تو انھوں نے گیس، ایتھر اور کلوروفارم کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اب پیٹ میں، رگوں میں، عضلات کی گہرائیوں میں، ریڑھ کی ہڈی میں، بیرزد کے اعصاب میں، جلد کے نیچے، الغرض ان تمام جگہوں میں جہاں انسانی جسم کے اندر کوئی چیز پہنچائی جا سکتی ہے۔ زہریلی اور مخدر دواؤں کا انجکشن دیتے رہتے ہیں۔ ان دواؤں کا میدانِ عمل جتنا وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر ان کے عجیب وغریب ناموں کی طوالت بڑھتی جاتی ہے۔ "پنٹوتھل" اور "بھیوکینیل" کو چھوڑیے اب اس طرح کے نام رکھے گئے ہیں جیسے "سوڈیم۔ پرونی ٹیقل۔ کارنبل۔ بار بٹیو یٹ۔ اسکو پولامین"۔

کہا نہیں جا سکتا کہ یہ حماقتیں کب تک جاری رہیں گی۔ ان "بڑے دماغوں" میں کچھ لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ وضع حمل میں شدتِ درد و کرب کی تکلیف کو روکنے اور کم کرنے کے لیے کوئی بے ضرر طریقہ ایجاد کریں۔ کیا ماہرین سائنس کے دماغ اس لائق نہیں رہے کہ وہ زہریلی دواؤں اور مخدرات سے آگے کچھ دیکھ سکیں؟ ہم جانتے ہیں کہ ان چیزوں کے استعمال سے اکثر موت واقع ہو جاتی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر موت واقع نہیں ہوتی تو ماں اور اس کے بچے کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم لکیر کے فقیر بنے رہیں اور خطرناک زہریلی اور غیر قدرتی دوائیں ایجاد کرتے رہیں۔ اسی سلسلے میں ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر ماں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے دردِ زہ کی تکلیف کو مخدر کے ذریعے کم کر دینے سے اس کا بچہ تنفسی امراض میں مبتلا

ہو جائے گا تو وہ اپنی تکلیف کی کتنی مقدار خوشی خوشی برداشت کرے گی؟

اس میں ذرا بھی شک نہیں ہو سکتا کہ ایک خطرناک دوا کے بدلے یہ ہزار درجہ محفوظ ہو گا کہ عورت کے لیے کوئی دماغی عمل تجویز کیا جائے۔ سب سے بہتر اور سب سے محفوظ "مخدر" وہی دماغ ہے جو کنٹرول میں رکھا گیا ہو۔ اور تربیت یافتہ ہو۔ اس کے بعد ذہنی "اشارات" کے ساتھ ایک بہت ہی ہلکے مخدر کا نمبر آتا ہے۔ جہاں تک ذہنی اور نفسیاتی اشارات کا تعلق ہے شکاگو میڈیکل اسکول کے ڈاکٹر جارف لی کہتے ہیں کہ "میں نے اس طرح کے اشارات سے بہت فائدے اٹھائے ہیں اور جب یہ دیکھتا ہوں کہ میرے پیشے کی ساکھ اس سب سے ضرر اور قوی الاثر دوا سے فائدہ نہیں اٹھاتی تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔"

جب میں نے پہلے پہل زچگی کے کیس میں "نفسیاتی اشارات" سے کام لیا تھا تو مجھے اپنی کامیابی پر حیرت ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عورت کی خوف زدگی دور کر دی جائے اور اسے وضع حمل کے متعلق معلومات بہم پہنچا دی جائیں تو اس کو کسی دوا یا مخدر کی ضرورت نہیں ہو گی۔ لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر کیس میں صرف عضوی سکون اور "اشارات" کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں اور نہ یہ ہے کہ وضع حمل کا سارا راز صرف انھیں دو چیزوں میں ہے۔ بلکہ یہ کہیے کہ عورت کے لیے بچے کی پیدائش ایک قدرتی اور معمولی کام ہے۔ اس کا انعام ان قربانیوں سے بھی زیادہ ہے۔ قدرت کے قانون نے احیائے نسل کے لیے ایک مکمل نقشہ بنا دیا ہے۔ بعض عورتوں کا بیان ہے کہ انھوں نے وضع حمل کے وقت ایک روحانی بلندی محسوس کی۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ "تکمیل محبت" کے اس انتہائی موقع پر قدرت خود عورت سے قریب تر ہو جاتی ہے؟ جب بھی میں اس سوال پر غور کرتی ہوں، مجھے یہی قول یاد آجاتا ہے کہ "تکلیف دینا قدرت کا منشا نہیں ہے۔"

آلو کھائیے ـــــ آپ موٹے نہیں ہوں گے

آلو کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کو کھانے سے آدمی موٹا ہو جاتا ہے۔ لیکن جدید تحقیقات نے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ کورنل یونیورسٹی کالج کے شعبہ تغذیہ کی معلمہ مس مرٹل ایرکسن لکھتی ہیں کہ چوں کہ ایک اوسط سائز کے آلو میں سو سے زیادہ حرارے نہیں ہوتے اس لیے یہ موٹاپے کو بڑھانے کا باعث نہیں ہوتا۔ ہاں اگر آپ آلو کے ساتھ بہت سا شوربا اور مکھن اور گھی وغیرہ ملا لیں گے تو ضرور ہے کہ اس کی حراری قدر بہت بڑھ جائے گی اور جسم کے وزن کے اضافہ میں اس سے بہت مدد ملے گی لیکن اس الزام کو آلو کے سر تھوپنا غلط ہو گا۔ مناسب مقدار میں آلو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ مس موصوفہ نے آلو کی "حراری قدر" کا مقابلہ دوسری غذاؤں سے کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے:۔

آلو	۱۰۰ حرارے
چاکلیٹ کی ٹکیہ	۲۴۰ "
اخروٹ	۱۷۵ "
سیب کی چائے	۴۰۰ حرارے
ایک کپ آئس کریم	۲۵۰ "

YOUR PITUITARY GLAND

آپ کا غدہ نخامیہ



اسے قدرت نے بھیجے کے درمیان ہڈیوں کے ایک نہایت مختصر گہوارے میں محفوظ رکھا ہے جدید تحقیق کے مطابق اس سے ۱۶ مختلف قسم کے کیمیائی اجزا کی تراوش ہوتی ہے، اسی لیے اسے شاہ غدد کہتے ہیں۔ یہ کیمیاوی جوہر جسم انسانی میں مختلف کام کرتے ہیں ایک ہڈیوں کی بالیدگی پر نظر رکھتا ہے اگر اس میں جوہر کی تراوش بند ہو جائے تو انسان بونا رہ جاتا ہے اور توالد وتناسل کی قوت باقی نہیں رہتی دوسرا جوہر انسانی غدد (سیکسوئل گلینڈ) پر کنٹرول رکھتا ہے، اور مردانہ قوت کو قائم رکھتا ہے، دوسرے جوہر خون کے دباؤ درست رکھتے ہیں،



معجون شباب آور

MAJUN - SHABAB-AWAR

غدہ نخامیہ کے ان افعال کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے خاص قسم کی دواؤں اور جوہروں سے اس میں وہ تاثیر پیدا کی گئی ہے کہ یہ اس غدد کے افعال کو منظم رکھتا ہے اسی لیے شباب آور تن درستی برقرار رکھتا ہے جسم کا نشوونما کرتا ہے، مردانہ قوت پیدا کر کے اسے بحال رکھتا ہے، بہادر اور شجاع بناتا ہے کمزور نہیں ہونے دیتا۔ جنرل ٹانک ہے۔ ذراسی سستی اور تھکن اس کا اشارہ ہے۔ کہ آپ کے جسم اور اعصاب کو شباب آور کی ضرورت ہے۔ اس کا ہمیشہ خیال رکھیے۔ قیمت فی شیشی پانچ روپے

Hamdard　　ہمدرد دواخانہ لیباریٹریز دہلی

غریبوں کے ارمان

(جناب ایم۔ اسلم صاحب۔ لاہور)

جنوری کی چاندنی رات اور خوش گوار فضا — جوانی، گرمجوشی لگی ہوئی —— قیمتی پوشاک زیبِ تن کیے دولھا میاں دُور قالینوں کے فرش پر گاؤتکیہ لگائے ناک پر ریشمی رومال رکھے، پھولوں سے لدے ہوئے، شرمائے شرمائے نظریں نیچی کیے بیٹھے ہیں —— اُن کے ارمان!

ماحول حسین وجمیل، براتی امیر وکبیر، عورت اور مرد سب ایک جگہ موجود، ان کے لباس بے نظیر، ہاں خوشبوؤں سے معطر —— گلاب، چنبیلی، موتیا، حنا —— وہ سامنے دولھا میاں کے ڈیڈی اور ممی کھڑے ہیں — اُن کے ارمان ——!

ڈائننگ ہال —— پُرتکلف کھانے قسم قسم کے —— برتن بے مثل کھلانے کے لیے بیسیوں ملازم موجود —— کھانے والے کھا رہے ہیں اور پی رہے ہیں۔ کوکو بھی ہے، ہاٹ کافی بھی ہے، شراب بھی، ڈرائی جن بھی ہے —— ہر ایک امیر ہے، ہر ایک خوش ہے —— ہر ایک کے ارمان ——!

اور غریب —— بے چارے غریب —— اُن کے ارمان —— غریبوں کے ارمان!

ملاحظہ فرمائیے ایم۔ اسلم کیا دکھاتے ہیں:۔ (ہمدرد صحت)

میں صبح کے وقت عموماً دریائے راوی کی طرف سیر کو جاتا ہوں۔ کبھی ڈبل بیرل ساتھ رکھتا ہوں اور کبھی ۲۲ بور رائفل، سڑک کے دونوں جانب کچھ دور دہقانوں کی کھیتیاں ساتھ دیتی ہیں، پھر جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ جنگل میں تیتر بکثرت ملتا ہے۔ دریا کے ایک طرف جنگل ہے، دوسری جانب جہانگیر کا مقبرہ ہے۔ صبح صبح مقبرے کے خوبصورت مینار دریا میں غسل کرتے نظر آتے ہیں۔ میں دریا کے کنارے کنارے عموماً دو تین میل کا چکر کاٹتا ہوں۔ سیر بھی ہو جاتی ہے اور شکار بھی۔ ایک روز میں تیتروں کا پیچھا کرتا ہوا اس جگہ جا پہنچا جہاں دریا دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ مشکل یہ ہوتی ہے کہ تیتر صبح کے وقت پچھی میں ملتے ہیں۔ اور سانپ بھی بلوں سے نکل کر پچھی کے ٹھنڈے سائے میں آ بیٹھتے ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ادھر کسی جھاڑی میں سے تیتر نکلا اُدھر سانپ کی پھنکار کی آواز آئی۔ اور نتیجہ —؟ تیتر نکل گیا اور سانپ مر گیا۔ آج صبح میں نے دو سانپ مارے تھے، تیتر کوئی ہاتھ نہیں لگا تھا۔ میں چلتے چلتے کچھ تھک گیا تھا۔ راوی کا کنارا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور پچھی کا خوبصورت سایہ! میں کنارے پر کوٹ بچھا کر لیٹ گیا۔ کبھی کبھی اِدھر اُدھر سے تیتر کی آواز بھی آنے لگتی، گویا مجھے چیلنج دیا جا رہا تھا کہ لیٹ کیوں رہے، اٹھو ذرا پیچھا تو کرو! ہم بھی دیکھیں کیسے نشانہ لگتا ہے تمہارا۔ اس وقت نو بجنے کو تھے۔ اتنے میں ایک طرف سے آواز آئی ؎

ہم غریبوں کا بھی پورا کبھی ارماں کر دے!

بڑی سوز بھری آواز تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک نوجوان گوالا کندھے پر لمبے تین گز کا لٹھ رکھے کہیں سے

آنکلا۔کیسا خوب صورت جوان تھا! چوڑا چکلا سینہ، کھلی پیشانی، سڈول اور بھرا ہوا جسم، عقابی آنکھیں، پھٹا ہوا کرتہ، پیوند لگا تہبند۔ نہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں نیش عقرب کی طرح اوپر کو بل کھاتی ہوئیں۔ بے تکلف اتنا کہ میرے نزدیک ہی آکر بیٹھ گیا، اور کہنے لگا،

"ابھی ابھی دو تیتر آپ کے آپ کے قریب سے اُڑ گئے ہیں، کوئی مارا بھی آپ نے ؟"

"ابھی تک تو کوئی ملا نہیں" میں نے جواب دیا۔

"تیتر تو بہت ہیں" گوالے نے کہا۔

"اور سانپ بھی تو بہت ہیں" میں نے جواب دیا۔

"سانپ کا کیا ہے" وہ کچھ بے پروائی سے بولا "جہاں دیکھا وہیں ڈھیر کر دیا"

"تم ہی ابھی ابھی گا رہے تھے کیا ؟" میں نے سوال کیا۔

"کیا گانا ہے جی ؟" گوالا مسکرا کر بولا "کبھی کوئی بول یاد آگیا تو زبان سے بھی نکل گیا"

"تو ہاں! میں نے بھی ہنس کر کہا "ذرا سناؤ تو پھر۔ ہم غریبوں کا بھی پورا کبھی ارمان کر دے!"

"غریبوں کے ارمان پورے ہو چکے جی!" اس نے کچھی کی ٹہنی سے ٹانگ پر مٹی اُتارتے ہوئے کہا۔

"انسان ہمت کرے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے" بلا ارادہ ہی میں نے کہہ دیا اور وہ سر ہلا کر بولا۔

"غریب ہمت بھی کرے گا تو سوکھی روٹی ہی ملے گی"

"کیا کام کرتے ہو تم ؟"

"بھینسیں چراتا ہوں"

"تنخواہ کیا ملتی ہے ؟"

"تنخواہ!" وہ ذرا مسکرا کر بولا "دو روٹیاں صبح اور دو شام۔ دو چار کٹورے لسی کے اور دس پندرہ گالیاں"

"اور نقد کچھ نہیں ؟" میں نے پوچھا۔

"چھ مہینے بعد پچاس دینے کا وعدہ، اُس نے پھر مسکرا کر کہا۔

"کیا نام ہے تمھارا" میں نے پوچھا۔

"نام تو امیروں کے ہوتے ہیں جی!" اس نے جواب دیا "غریب کو کوئی جس نام سے چاہے بلا لے"

"آخر کوئی نام تو ہوگا تمھارا ؟" میں نے پھر کہا۔

"نام تو اللہ دتا ہے جی۔ لیکن سب دتو کہتے ہیں" اس نے کہا "آپ کیا کام کرتے ہیں"

"میاں دتو!" میں نے مسکرا کر کہا "کام تو میں کچھ نہیں کرتا۔ اللہ اپنی بارگاہ سے سب کچھ دے دیتا ہے"

"سچ ہے" دتو ایک آہ بھر کر بولا "اللہ بھی صرف امیروں کا ہی ہے۔ ہم غریبوں کو تو اللہ نے بس بھلا ہی رکھا ہے"

"میاں دتو!" میں نے کہا "اللہ میاں اپنے بندوں کو کبھی نہیں بھولتا"

"جی ہاں!" دتو مسکرا کر بولا "ہماری مسجد کا ملا بھی ہمیشہ یہی کہا کرتا ہے کہ غریب اللہ میاں کو بہت پیارے ہوتے ہیں۔ اس لیے نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا ملتا ہے اور نہ پیٹ بھرنے کو روٹی۔ اور اگر کوئی خواہش ہو تو مر کر بھی پوری نہ ہو۔ قربان جاؤں اللہ میاں کے اس پیار کے!"

"بھائی دتّو!" میں نے کہا "اللہ کے پیار کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہے اللہ تو یہ کہتا ہے کہ تم محنت کرو، برکت میں دوں گا"

"لیکن آپ کو تو بلا محنت مشقّت سب کچھ مل رہا ہے" دتّو نے ہنس کر کہا "کیوں کہ آپ نے ابھی ابھی کہا تھا کہ آپ کوئی کام نہیں کرتے"

اعتراض تو اس گوالے کا معقول تھا لیکن میں حیران تھا کہ اسے یہ کیسے سمجھاؤں کہ ع

قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا!

وہی خود مسکرا کر بولا:-

"ایک بات تو ہے ہم غریب جس سکھ اور اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں، دھن دولت والوں کو یہ بات میسّر نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا خیال ہے بابوجی؟"

"ٹھیک ہے!" میں نے جواب دیا "انسان جتنے پاؤں پھیلائے اُتنے ہی دھندے زیادہ گلے پڑتے ہیں۔ لیکن تم ایک بات تو بتاؤ، تمھیں سب سے زیادہ کس چیز کی آرزو ہے؟"

"گھر آباد ہو جائے" دتّو نے بے ساختہ جواب دیا۔

"یعنی دولھا بننے کو جی چاہتا ہے" میں نے پوچھا۔

"غریب کیا دولھا بنے گا جناب!" دتّو نے ایک آہ بھر کر کہا "دکھ سکھ کا ساتھی اچھا ہی ہوتا ہے"

"شادی کے لیے کچھ روپے بھی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اللہ کا نام ہے میرے پاس تو" دتّو نے ہنس کر کہا۔ اور میں نے بھی ہنس کر ہی جواب دیا۔

"مرے یار! جب رُپیہ پلے نہیں تو شادی کیسے کروگے؟"

"پیسہ دھیلا تو واقعی میرے پلّے نہیں" دتّو بولا "لیکن جوان تو ہوں۔ میاں رانجھا کے پاس کیا رکھا تھا جو سیالوں کی ہیر اس کی دیوانی بن گئی"

"وہ تو محبّت کا سودا تھا" میں نے کہا۔

"محبّت بھی اسی لیے ہوئی نا کہ رانجھا خوب صورت جوان تھا" دتّو نے جواب دیا۔ اور میں نے کہا۔

"جوان تو ماشاء اللہ تم بھی ہو۔ چلا دو نا تیر تم بھی کہیں"

"تیر جو چلنا تھا چل چکا" دتّو نے آہ بھر کر کہا۔

"ارے!" میں نے ہنستے ہوئے کہا "پھنس گیا تمھارا دل بھی کہیں؟ مل گئی کوئی ہیر تمھیں بھی"

"ہیر تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔ رہا دل کا پھنسنا تو یہ کم بخت کسی سے پوچھ کر تھوڑا ہی پھنستا ہے۔ تقدیر کی بات ہے جناب" دتّو نے جواب دیا۔

"پھر مایوس کیوں ہو؟" میں نے پوچھا "شادی کی بھی کوئی صورت نکل آئے گی کسی دن"

"خیر! جب صورت بنے گی دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو ایک روگ لگنا تھا سو لگ گیا ہے"

دتّو نے افسردگی سے جواب دیا "ایک تسلی تو ضرور ہے نصیب میں ہے ضرور مل جائے گی دنیا میں"

"اچھا تمھاری ہیر کون ہے؟" میں نے محض اس لیے پوچھا کہ اس کی افسردگی دور ہو جائے۔

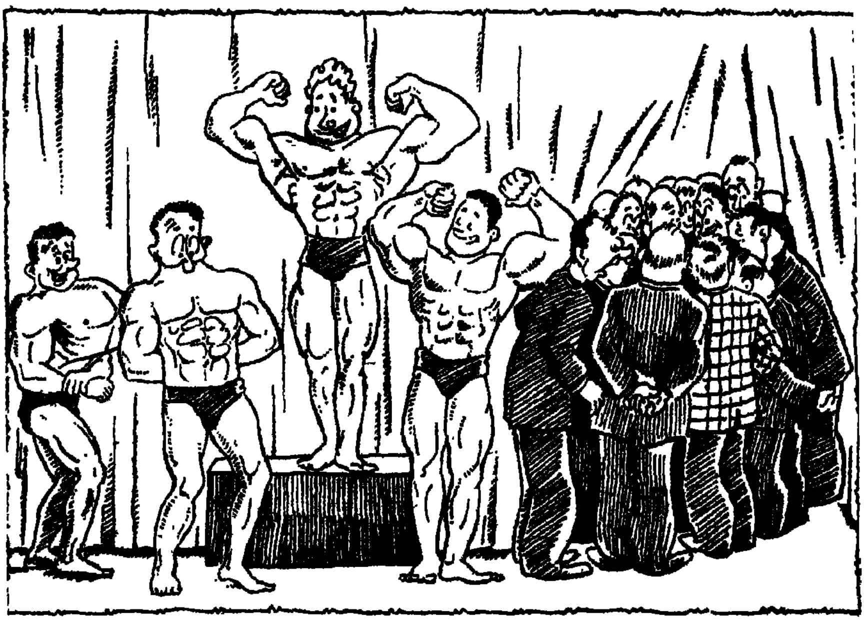
"غریب ہی ہے" دتّو نے جواب دیا۔ "ملکانی کے ہاں اُپلے تھاپنے آیا کرتی ہے۔"
"اور وہیں تمھاری بھی آنکھ لڑ گئی!" میں نے مسکرا کر پوچھا۔
اتنے میں کہیں سے آواز آئی۔
"ارے او دتّو! دتّو! مویشی کھیتوں کی طرف چلے گئے۔"
یہ آواز سنتے ہی وہ اُٹھا اور لٹھ سنبھالتا ہوا جدھر سے آواز آئی تھی اُدھر کو ہولیا۔ اس کے جاتے ہی بیساختہ میری زبان سے نکلا ؏

شوخ و بے پرواہ ہے کتنا خالقِ تقدیر بھی!

مَیں حضرت علامہ اقبال کا یہی مصرعہ ابھی گنگنا رہا تھا کہ دتّو کی پھر دہی آواز آئی:۔

ہم غریبوں کا بھی پُورا کوئی ارماں کردے!

کتنی سوز بھری آواز تھی۔ سچ ہے دل کی لگی بُری ہوتی ہے۔



فدا جسمانی تناسب و بالیدگی کے مقابلے میں کام یاب ہونے والے امریکی شوقینوں کو بھی دیکھ لیجیے۔
بائیں سے دائیں کو: بہترین سینہ، بہترین شکم، مسٹر امریکا، بہترین بازو اور مس امریکا، کے بازوؤں کی بالیدگی اور عضلاتی نشو و نما کے کہنے ہی کیا ہیں۔

شرمیلا نوجوان

مکمل تبدیلی جنس کا ایک دلچسپ اور کامیاب تجربہ

(ڈاکٹر جارج ساوا ایم۔ڈی)

سنہ ۱۹۳۱ء —— میں برلن میں پریکٹس کرتا تھا۔ ایک دن بائیس تیئس سال کا ایک خوب صورت دبلا پتلا نوجوان میرے مطب میں جس کی نشست و گفتگو کے انداز میں غیر معمولی شرمیلا پن تھا۔ وہ چند سکنڈ تک بالکل خاموش بیٹھا رہا، لیکن اس کے ہونٹوں کو بار بار ہلکی سی لرزش ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن شرم سے رک جاتا ہے۔

میں نے اس کا نام درج کرنے کے لیے فائیلنگ کیبنٹ سے ایک کارڈ نکالا، اور پوچھا۔

"آپ کا نام؟"

"جوہن ڈورن"

"عمر؟"

"تیئیس سال"

"پیشہ؟"

"مغنی"

اس کی آواز غضب کی سریلی تھی۔ میں نے دل میں کہا —— ان آرٹسٹوں کی بھی عجیب حالت ہے۔ یہ لوگ اپنے نغموں کی نزاکت اور سریلے پن کو روزمرہ کی زندگی میں بھی شامل کر لیتے ہیں۔

میں نے پوچھا: "ہر ڈورن! آپ کو کیا شکایت ہے؟"

نوجوان نے نیچی نظریں کرکے ہونٹوں پر زبان پھیری اور شرماتے ہوئے انداز میں بولا:۔

"اجازت دیجیے کہ میں اپنے بچپن کا کچھ حال بھی عرض کرسکوں۔"

"فرمائیے۔"

"میرا باپ ایک گاؤں میں پادری تھا اور اسی نے مجھے موسیقی کی ابتدائی تعلیم دی تھی، اور میں گرجا میں دعائیں گاتا تھا۔ چوں کہ میری آواز اچھی تھی اس لیے میری ماں اور اسکول ماسٹر کے اصرار پر مجھے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم کے لیے ڈریسڈن بھیج دیا گیا۔ وہاں چند سال بعد موسیقی کا کورس ختم کرکے میں نے ڈپلومہ حاصل کر لیا۔ اب میں برلن کا ایک مشہور درمیان وائلن نواز ہوں اور مجھے اپنے کام سے محبت بھی ہے ——"

آواز میں اس قدر ترنم تھا کہ مجھے بار بار محسوس ہوتا تھا کہ نوجوان اپنا حال نہیں سنا رہا بلکہ مجھے موسیقی کی تعلیم دے رہا ہے۔ میں نے قطع کلام کرکے پوچھا: "کیا آپ کو بچپن میں کوئی خاص بیماری ہوئی تھی؟"

وہ بولا "نہیں لیکن کم زور ہمیشہ رہا اور اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہو کہ میرے والد کی زندگی چوں کہ بہت ہی خشک اور مذہبی تھی اور وہ ہر قسم کے کھیل کود سے متنفر تھے اس لیے میں نے کبھی جسمانی ورزش یا کھیل میں حصہ نہیں لیا۔۔۔۔۔"

نوجوان اپنی داستان جاری رکھنا چاہتا تھا، لیکن میں اس کے سُریلے نغموں سے کب تک لُطف اندوز ہوتا رہتا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایک ضروری آپریشن کے لیے ہسپتال جانا تھا میں نے اس کی بات کاٹ کر سنجیدہ لہجے میں پوچھا کہ "آخر آپ میرے پاس کیوں تشریف لائے ہیں۔ یہ بتائیے کہ آپ کو شکایت کیا ہو؟" نوجوان کے خوب صورت چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ نظریں زمین پر گڑ گئیں اور دانتوں سے ہونٹ چبا کر بولا، "میرے دل میں عورتوں کے لیے کوئی کشش نہیں ہو۔"

"کیا آپ کا بچپن سے یہی حال ہو؟"

"جی نہیں، سخت مذہبی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود گاؤں کی لڑکیوں سے میری بہت دوستی تھی اور ان کے ساتھ کھیلنے میں مجھے مسرت محسوس ہوتی تھی۔"

"موجودہ حالت کب سے ہوئی؟"

"تین چار سال سے۔"

"کیا آپ تنہائی پسند ہیں؟"

"جی نہیں۔ میرے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع ہو۔"

"آپ کی دوستی مردوں سے بھی ہو؟"

"جی ہاں۔"

میں نے نوجوان کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ وہ اور بھی شرمایا جا رہا تھا۔

"کیا آپ کا دل کسی مرد کی جانب کھنچتا ہو؟"

ایسا معلوم ہوا کہ میں نے اس کی کسی دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ چہرے پر کچھ عجیب قسم کی بے چینی ظاہر ہوئی اور وہ خاموش رہا۔

میں نے کہا: "دیکھیے ہرڈومن، میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ آپ کو مجھ سے کوئی بات چھپانی نہیں چاہیے۔"

اس کی نظریں بدستور زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ رُک رک کر بولا: "مجھے اپنے دوست جارج سے بہت محبت ہو۔"

"محبت تو گناہ نہیں ہو؟"

"لیکن یہ محبت ایسی نہیں جیسی ایک دوست کو دوسرے دوست سے ہوتی ہو۔ میرا یہ دوست قوی ہیکل خوب صورت جوان اور ماہر موسیقی ہو۔ میرے ساتھ ذر یسٹڈن کے میوزک اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس سے میرے ہمیشہ گہرے دوستانہ تعلقات رہے۔ لیکن کچھ عرصے سے اس دوستی کی نوعیت کچھ بدل سی گئی ہو اور اس میں رشک و رقابت کا جذبہ شامل ہو گیا ہو۔ میرا دوست لڑکیوں کا بہت شائق ہو۔ اور جب مجھے وہ اپنے عشق و محبت کی داستانیں سُناتا ہو تو میرے دل میں رشک کی آگ بھڑک اٹھتی ہو۔ شروع میں میں نے جذبات پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن چند ماہ ہوئے جب میں نے اس کو ایک

خوب صورت لڑکی کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے دیکھا تو میں ضبط نہ کر سکا اور تنہائی میں آب دیدہ ہو کر اس سے کہا "مجھے تم سے بہت محبت ہے تم لڑکیوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے نہ جایا کرو۔" جارج نے میری گفتگو کا بہت مذاق اڑایا اور کہا کہ "آج تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تم میرے بہترین دوست ہو، اس کے علاوہ اور کیا چاہتے ہو؟" جارج کے ان الفاظ سے میرے دل پر بجلی سی گر پڑی۔ میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے مکان واپس چلا آیا۔ لیکن تمام رات روتا رہا اور مجھے نیند نہ آئی۔ دوسرے دن بھی میں بہت ہی مغموم اور افسردہ رہا، اور کئی بار خودکشی کا ارادہ کیا۔ لیکن بعد میں اپنے ان غیر قدرتی جذبات سے خود متوحش ہوا اور لڑکیوں سے میل جول بڑھانے کی کوشش کی لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دل میں لڑکیوں کے لیے کوئی کشش تو پہلے ہی نہ تھی اب مجھے ان سے نفرت ہو گئی اور عورتوں سے نفرت کا جذبہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ میں ہر وقت غمگین رہتا ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے سر پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور میری صحت گرتی جا رہی ہے۔"

نوجوان آب دیدہ ہو گیا۔ میں نے اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے پُر محبت لہجہ میں کہا "آپ اس قدر پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ جو محسوسات آپ نے ظاہر کیے ہیں وہ نوعیت کے لحاظ سے منفرد نہیں ہیں، بلکہ بہت سے نوجوانوں میں پائے جاتے ہیں۔ بعض میں کم بعض میں زیادہ۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان محسوسات کو قابو میں رکھا جائے۔ آپ نے اچھا کیا جو میرے پاس مشورے کے لیے آگئے۔ اب میں آپ کا طبی معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔"

میری زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ نوجوان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے بہت ہی گھبرا کر کہا "ڈاکٹر صاحب! معائنہ کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے ہمدردانہ لہجہ میں جواب دیا "میں آپ کی صحت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے صرف اعصاب کی حالت دیکھنا چاہتا ہوں۔"

معائنہ کی اصلی غرض و غایت چھپانے کے لیے میں نے عام ڈاکٹروں کے انداز میں اس کے سینے پر اسٹیتھسکوپ رکھ دیا اور اس سے کھانسنے کو بھی کہا .... حالاں کہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی ....
...... اس طرح نوجوان کو مغالطہ ہو گیا کہ میرے معائنہ کی نوعیت رسمی ہے اور اس نے کسی قسم کی جھجک ظاہر نہ کی۔ لیکن اسے کیا خبر تھی کہ میں اسی رسمی معائنہ کے دوران میں وہ خصوصیات بھی نوٹ کرتا جا رہا ہوں جو صحیح تشخیص کے لیے ضروری تھیں۔ اس کی جلد بہت نرم اور بالوں سے صاف تھی۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے یہ بھی اقبال کر لیا کہ اسے کچھ عرصے سے داڑھی مونڈنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس کے سینہ کے نشو و نما کو دیکھ کر ہوئی جو منزلِ شباب میں قدم رکھنے والی ایک دوشیزہ کے سینہ کی طرح تھی۔ معائنہ کے بعد میں اس حیرت انگیز نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کیس ان نادر کیسوں میں ہے جن پر پروفیسر ونیکر اس نے بہت قابلیت اور تفصیل سے بحث کی ہے۔ یعنی مکمل تبدیلِ جنسیت، جس کی طبی دنیا میں دس پندرہ سال کے بعد ہی کوئی مثال دستیاب ہوتی ہے۔

اصل میں اس تبدیلی کی ابتدا بچے کی پیدائش سے پیشتر جنین میں ہوتی ہے جنین میں آثارِ زندگی پیدا ہونے کے بعد چند ہفتوں تک بچے کی کوئی جنس نہیں ہوتی اور اس کے زنانہ و مردانہ دونوں اعضا ہوتے ہیں۔ بعد میں ایک خاص عضو کے سکڑ جانے یا غائب ہو جانے سے بچے کی جنس قائم ہو جاتی ہے۔ موجودہ طب کا دائرہ علم

تمام حیرت انگیز ترقیوں کے باوجود محدود ہے۔ قیامِ جنسیت کے عمل کی تشریح اب تک نہیں کی گئی ہے اور وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بطنِ مادری سے جو بچہ عالمِ وجود میں آنے والا ہے وہ لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض شعبدہ بازوں یا مکار دوا فروشوں نے عوام کی خوش عقیدگی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس قسم کے دعوے کیے ہیں کہ وہ اپنی دعاؤں یا دواؤں سے ماں کے پیٹ میں بچہ کی ایک خاص جنس قائم کر سکتے ہیں لیکن اس پُر اسرار قانونِ قدرت کو بدلنا اب تک ناممکن ثابت ہوا ہے۔ میری نوعمری میں موسیو فلپ ایک عامل اور عطائی دوا فروش رُوس کو آیا تھا۔ اس زمانے میں ملکہ رُوس حاملہ تھی۔ فلپ نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کی دوا اور دُعا سے مشکوئے شاہی میں فرزندِ نرینہ تولد ہوگا اور اُس نے زارنکولس ثانی سے لاکھوں رُوپے فیس کے وصول بھی کر لیے لیکن انجام کار اس کی دُعا بھی بے اثر رہی اور دوا بھی اور ملکہ کے بطن سے بیٹی پیدا ہوئی۔

اکثر و بیشتر حالات میں جنین کے یا تو مردانہ اعضا کلیتاً غائب ہو جاتے ہیں یا زنانہ اعضا اور بچے کا نشوونما ایک لڑکے یا لڑکی کی حیثیت سے ہوتا ہے لیکن بہت سی چیزوں کی طرح اس قاعدۂ قدرت میں بھی مستثنیات ہوتے ہیں بعض اعضا کلیتاً غائب ہونے کے بجائے سکڑ کر پوشیدہ ہو جاتے ہیں اور کم زور طریقے پر اُن کا عمل جاری رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد کی زندگی میں بغیر کسی ظاہری وجہ کے متاثر افراد کا رجحان جنسِ مخالف کے بجائے اپنی ہی جنس کی جانب ہو جاتا ہے۔ مرد غیر فطری حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں اور عورتوں میں مساحقت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جنسی جرائم میں اس قسم کے نشوونما کا نمایاں ہاتھ ہوتا ہے لیکن طبی حقائق نظر انداز کر دیے جاتے ہیں اور "مجرم" کو قدرت کی ستم ظریفی یا صاف الفاظ میں قدرت کی کوتاہیوں کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ لیکن مکمل تبدیلیِ جنس کے واقعات شاذ ہیں میری تشخیص اب بالکل قطعی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا اس نوجوان کی جنس درحقیقت تبدیل ہو رہی ہے۔ ابھی پورے وثوق کے ساتھ یہ پیشین گوئی تو دشوار تھی کہ تبدیلی مکمل ہوگی یا ادھوری لیکن یہ سوال چنداں اہم نہ تھا اور مزید معائنہ و تجربہ کے بعد پوزیشن واضح کی جا سکتی تھی۔ اس وقت میرے سامنے سب سے پہلے اہم سوال یہ تھا کہ شرمیلے نوجوان کو اس راز سے کسی طرح مطلع کیا جائے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میرا انکشاف اس کے لیے کہیں ناقابلِ برداشت نہ ثابت ہو اور وہ بالکل مایوس نہ ہو جائے۔ میں نے پورے غور و فکر کے بعد بہت ہی محتاط الفاظ اور دوستانہ لہجے میں اپنے نظریات و شبہات ظاہر کیے۔ مجھے مسرت ہے کہ نتیجہ خاطر خواہ ثابت ہوا اور نوجوان نے کوئی خاص پریشانی ظاہر کیے بغیر کہا: "آخر اس مصیبت کا کوئی علاج بھی ہے؟"۔

میں نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا: "مصیبت کیسی؟ —— آپریشن کے بعد آپ کی حالت بالکل درست ہو جائے گی۔"

میں نے محسوس کیا نوجوان اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ بولا "آپریشن میں کیا ہوگا؟" میں نے ظاہری لاپرواہی سے جواب دیا: "کچھ نہیں۔ یا تو موجودہ مردانہ اعضا کی حفاظت اور جنسی تبدیلی کو روکنے کے لیے زنانہ غدود خارج کر دیے جائیں گے یا تبدیلی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے زنانہ غدود کو قدرتی نشوونما کا موقع دے دیا جائے گا۔"

اس نے کہا: "ڈاکٹر صاحب۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں اپنے لیے کون سی بات پسند کروں؟"

میں نے جواب دیا: "آپ کی پسند کا کوئی سوال نہیں۔ آخری فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے کہ بدستور مرد رہنا آپ

کے لیے مفید ہوگا یا عورت کی زندگی اختیار کرنا۔

اس نے میری طرف متحیر نگاہوں سے دیکھا۔ یہ حقیقت اس کے سامنے بتدریج منکشف ہوتی جا رہی تھی کہ اب سوال ذاتی رائے کا نہیں بلکہ قانونِ قدرت کے سامنے سر جھکا دینے کا ہے۔

آخر کار اس نے مایوسی کے لہجے میں کہا: "آپ جو چاہیں کریں۔ آپ کو اختیار ہے لیکن مجھے دیوانگی سے نجات دلا دیجیے۔"

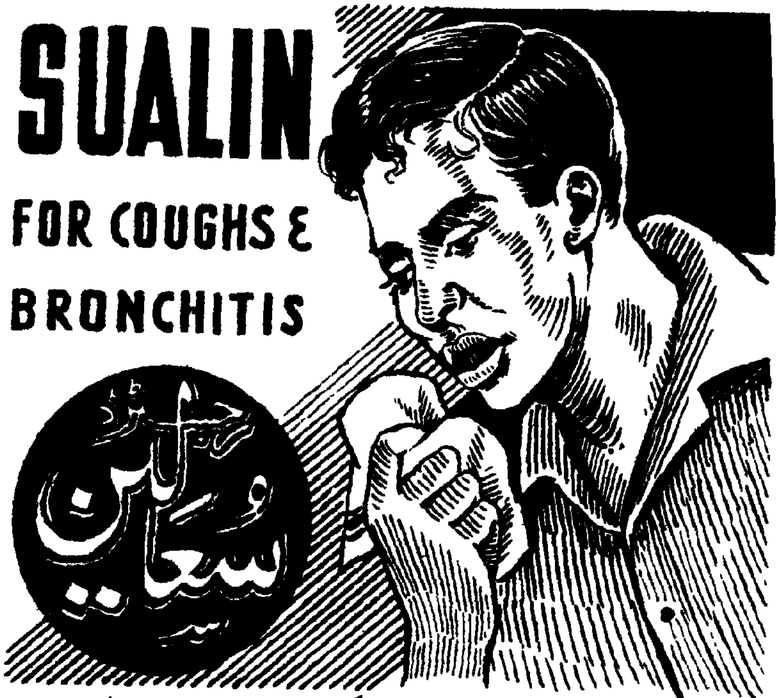
نوجوان رخصت ہوگیا۔ دوسرے دن میں نے برلن کے دو مشہور اسپیشلسٹوں کو تمام واقعات سے مطلع کیا۔ طویل بحث کے بعد ہم تینوں کی رائے یہی ہوئی کہ آخری فیصلہ کے لیے پہلے نوجوان کے شکم کو کھول دیا جائے۔

شہر کے سب سے بڑے ہسپتال میں آپریشن کا انتظام کیا گیا۔ دونوں سرجن میری مدد کے لیے موجود تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی ڈاکٹر ہمارے اس انوکھے تجربے کو دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ نوجوان کا شکم چاک کرنے پر معلوم ہوا کہ اس میں تمام زنانے اعضا ایک نابالغ کم سن لڑکیوں کی طرح موجود ہیں۔ چوں کہ زنانہ اعضا زیادہ نشو و نما یافتہ تھے اس لیے ہم تینوں سرجنوں نے طے کیا کہ جنس کی تبدیلی کو روکنے کے بجائے اب قدرت سے اشتراک کرنا اور اس تبدیلی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دینا ہی مناسب ہے۔ آدابِ پیشہ کے لحاظ سے میں اس حیرت انگیز آپریشن کی تفصیلات بیان نہیں کرسکتا۔ صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ ہم نے پانچ ماہ کی مدت میں یکے بعد دیگرے سات آپریشن کیے۔ اور جو متعلقہ اعضا کم تھے انھیں آنت سے تیار کرلیا۔ ساتویں آپریشن کے بعد جب مریض بیدار ہوا تو وہ مرد نہیں بلکہ مکمل عورت تھا! اس کامیاب آپریشن کو یورپ میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اور آخر کار سرکاری کاغذات میں ہر جوہن ڈورن کو فرالین جوہانہ ڈورن تسلیم کرلیا گیا۔

ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اب میرا تعلق اپنے مریض سے ختم ہوگیا تھا لیکن جذبۂ تجسس کو تسکین دینے کے لیے میں اس کے حالات سے باخبر رہتا تھا۔ ایک سال کے اندر فرالین جوہانہ کے نغموں کی دل کشی بڑھ گئی اور اس کی قسمت پہلے سے کہیں بہتر تھی۔ آپریشن کے دوسرے سال فرالین جوہانہ ڈورن کی شادی اس کے بچپن کے دوست جارج کے ساتھ ہوگئی اور میں بھی اس شادی میں دلی مسرت کے ساتھ شریک ہوا تھا۔

خاتون کی ازدواجی زندگی بہت ہی خوش گوار اور کامیاب تھی اور میں اکثر سوچتا تھا کہ اگر موجودہ سرجری کی مدد اس کے شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ مسرور و شادکام عورت اب تک ایک مصیبت زدہ مرد کی ناکام زندگی بسر کرتی ہوتی۔

کیا آپ منھ دھوتے وقت اس کا واقعی خیال رکھتے ہیں کہ ناک میں پانی ڈال کر اسے خوب صاف کریں؟
اگر آپ اس سوال کا جواب "ہاں" میں دیں گے تو آپ کا شمار ان ۵ فی صد آدمیوں میں ہے جو ناک کی صفائی کا بھی اسی طرح خیال رکھتے ہیں جس طرح دوسرے اعضا کا۔ اگر آپ محسوس کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ بار بار نزلہ زکام میں مبتلا نہیں ہوتے۔ برعکس اس کے جو لوگ ناک کی صفائی کو ضروری نہیں سمجھتے وہ آئے دن نزلہ زکام کا شکار رہتے ہیں۔



گلے، سینے اور پھیپھڑوں کی تکلیف کے لیے سعالین ایک مخصوص دوا ہے۔ اسے خالص دیسی دواؤں سے جدید اصول پر تیار کیا جاتا ہے۔ سعالین کی ٹکیہ زبان پر رکھتے ہی گھلنی شروع ہو جاتی ہے اور اسکے مخصوص جوہر آزاد ہونے لگتے ہیں۔ انھیں جوہروں سے سعالین مرکب ہے اور یہی جوہر امراض کو دور کرتے ہیں۔ یہ جوہر سانس کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں اور ہوائی نالیوں اور پھیپھڑوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں یہ جراثیم اور بلغمی مادوں کو اکھیڑنا شروع کر دیتے ہیں اور بہت جلد پھیپھڑوں کو مرض سے نجات دلا دیتے ہیں۔

سُعَالین گلے کو بھی صاف کرتی ہے اور ناک اور ہوائی نالیوں کے ورم کو دور کرتی ہے۔ اسے بڑے اور بچے سب استعمال کرتے ہیں۔ نزلہ، زکام، انفلوئنزا، برنکائٹس، ہر قسم کی کھانسی، کوا لٹک جانا، حلق کا درد، ورم اور زخم وغیرہ کے لیے بے نظیر ہے۔

تیار کردہ:- **ہمدرد دواخانہ، دہلی**

ترکیب استعمال:- معمولی نزلہ و زکام کی حالت میں دن میں کسی وقت اور رات کو سوتے وقت سعالین کی دو ٹکیاں منہ میں ڈالکر گھلائیں۔ حلق کی تکلیف مثلاً حلق کا درد یا ورم یا زخم میں دو ٹکیاں دن میں ۳ - ۴ بار چوسیں۔ حلق کو صاف کرنے اور اسے محفوظ رکھنے میں "سعالین" خاص اثر رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریر کرنے والے اصحاب اور گانے والے اشخاص "سعالین" استعمال میں رکھتے ہیں۔ کھانسی خواہ کسی قسم کی ہو، نمونیا کی وجہ سے ہو یا پھیپھڑوں یا ہوائی نالیوں کی کسی خرابی سے ہو، "سعالین" سے یقیناً جاتی رہتی ہے کیونکہ سُعَالین مسکن ہے اور کھانسی کے اصل سبب کو دور کرنے والی ہے۔ دن میں دو تین بار دو دو ٹکیاں چوسی جاتی ہیں۔ سوتے وقت دو ٹکیاں چوس لینے سے نیند آرام سے آتی ہے اور کھانسی پریشان نہیں کرتی۔

دمہ کے مریض **سُعَالین** سے بڑا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کالی کھانسی میں بچوں کو ایک ایک ٹکیہ دودھ یا شہد میں گھول کر صبح و شام دینی چاہیئے۔ **سُعَالین** اینٹی سیپٹک ہے، اس لیے منہ اور حلق اور پھیپھڑوں کے دانوں اور زخم کو ٹھیک کرتی ہے۔

نوٹ: شیشی کو بند اور خشک جگہ میں رکھو۔

تمباکو نوشی اور اس کے برے اثرات

(جناب سنتا سنگھ جگراؤں منڈی)

ڈارون کا یہ نظریہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ بندر انسان کا مورث اعلیٰ ہے لیکن غور کرنے سے انسان میں میمونیت کا ایک خاص عنصر موجود پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بندر کی طرح دوسروں کی حرکتوں کی نقل کرنے کی عادت تقریباً اس کی فطرت میں داخل ہے، یا بہ الفاظ دیگر یہ صورت حال بھی انسان پر صادق آتی ہے کہ اگر بھیڑوں کے پورے گلے کی ایک بھیڑ کسی تالاب یا کنوئیں میں اتر کر جان دے دے گی تو باقی تمام بھیڑیں اس کے پیچھے پیچھے پانی میں اتر جائیں گی اور اپنی حماقت سے اپنی جان دے دیں گی۔ اس کسوٹی پر اگر آپ انسان کی کسی بری عادت کو پرکھیں گے تو اسے بڑی حد تک صحیح پائیں گے۔ ایک تمباکو نوشی کی عادت ہی کو دیکھ لیجیے کہ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی انسانوں کی کتنی بڑی آبادی اس مرض میں مبتلا ہوئی ہے۔ دنیا کی مہذب سے مہذب قومیں اندھی تقلید کا اس طرح شکار ہوگئیں کہ تمام طبی انتباہ اور ریسرچ کرنے والے ماہرین سائنس کی آگاہ کن آوازوں کے باوجود "زہر نوشی" اور "دود کشی" کے اس عمل قبیح کو ترک نہیں کرتیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ تمباکو نوشی کا رواج روز بروز ترقی کر رہا ہے اور دنیا میں اربوں پونڈ کی رقمیں اس مرض آفریں اور مختلف ششی و قلبی بیماریوں کو دعوت دینے والی سرگرمی پر ضائع کی جا رہی ہیں۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ صرف برطانیہ عظمیٰ میں ہر سال تمباکو نوشی پر تقریباً ڈھائی کروڑ پونڈ خرج ہوتے ہیں۔ اسی سے دوسرے متمدن ممالک کا اندازہ کر لیجیے۔ شاید یہ مجموعی رقم آپ کے تخیل سے بھی بڑھ جائے گی۔

ہندستان میں تمباکو نوشی کی ابتدا کے متعلق مختلف روایات پائی جاتی ہیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں جب برطانی سفیر سر ٹامس رو آیا تھا تو اپنے ساتھ دوسرے تحفوں میں تمباکو بھی لایا تھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ ہندستان میں پرتگالیوں نے تمباکو رائج کیا تھا۔ بہرحال اس وقت تمباکو کی تاریخ زیر بحث نہیں ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہندستان میں غالباً سنہ ۱۶۰۵ء سے تمباکو کا رواج ہے اور اس وقت سے اب تک یعنی تقریباً سوا تین سو سال میں تمباکو نوشی نے اس درجہ فروغ پایا ہے کہ آج کل گھر گھر میں لوگ مختلف شکلوں میں تمباکو کھانے یا پینے کے عادی ہوگئے ہیں اور اب تو آپ سڑکوں پر یا گلیوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو بھی سگریٹ یا بیڑی پیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ امیروں اور رئیسوں کے گھروں میں اگر پان کے ساتھ زردہ یا قوام کا استعمال بکثرت ہے تو اس کے دوسرے بھائی یعنی حقہ، سگریٹ اور سگار وغیرہ کو بھی تفریح و تواضع کا بہترین سامان سمجھا جاتا ہے۔ متوسط اور غریب طبقوں میں تمباکو کا استعمال بہت پھیلا ہے اور مزدور پیشہ لوگ بھی سگریٹ یا بیڑی ہی کو "ذرا دم لینے" کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ الغرض یہ عادت اب "فطرتِ ثانیہ" کی صورت اختیار کر چکی ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اس مضرت رساں اور مخرب صحت شوق میں مبتلا نہ ہوں۔

اب خود تمباکو کی خاصیت و ماہیت پر ایک نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ

آیا تمباکو میں کوئی ایسا جزو موجود ہے جو انسانی زندگی و صحت کے لیے مفید ہو یا اس میں ایسے اجزا موجود ہیں جو صحت و تن درستی کو نقصان پہنچاتے ہیں؟ جن سائنس دانوں نے تحلیلی طور پر تمباکو کے دھوئیں کی جانچ کی ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس میں کاربونک ایسڈ گیس کے علاوہ ایک زہریلا تیزاب موجود ہے۔ دوسرے اس میں ایک تیل جیسا روغنی جزو ہوتا ہے جو اس قدر ہلاک ہے کہ اگر اس کا ایک قطرہ سانپ کی زبان پر رکھ دیا جائے تو وہ مرجائے گا۔ تیسری چیز ایک قسم کا کھار (القلی) ہوتا ہے جو ایک تن درست بچے کے لیے ہلاکت کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہ وہ اجزا ہیں جو تمباکو کے دھوئیں میں شامل ہیں۔

اس سلسلے میں ایک سائنٹی فک تجربہ ملاحظہ فرمایئے: مٹر کے دو چھوٹے چھوٹے پودے کام میں لائے گئے۔ یہ پودے ایک انچ کے دسویں حصے کے برابر تھے۔ ایک پودا باریک ململ کے ایک ٹکڑے پر رکھا گیا اور پھر اس ململ کے ٹکڑے کو پانی سے بھرے ہوئے مرتبان پر رکھا گیا، اس طرح کہ پودے کی باریک شاخیں اور پتے کپڑے کے اوپر تھے اور جڑیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یہ مرتبان پانی سے بھری ہوئی طشتری پر رکھا گیا اور ایک بڑا شیشے کا پیالہ جس میں ایک گیلن پانی کی گنجائش تھی، مرتبان پر اوندھا کر رکھ دیا گیا اور پانی کی ایک ہلکی سی تہ سے طشتری اور پیالہ کو ملا دیا گیا، پھر پیالے کو تھوڑا سا ٹیڑھا کرکے ایک خم دار شیشے کی نلکی سے تمباکو کے دھوئیں کے تین "گھونٹ" اس میں پہنچائے گئے۔ دوسرے پودے کو بھی اسی التزام کے ساتھ مرتبان پر رکھا گیا۔ لیکن اس میں تمباکو کا دھواں نہیں پہنچایا گیا۔

اب یہ دونوں مرتبان اس طرح رکھے گئے کہ روشنی ان میں داخل نہ ہو سکے اور ۰ ۶ سے لے کر ۶۵ ڈگری تک کی حرارت قائم رہے۔ چھ روز کے بعد دیکھا گیا تو اس مرتبان کا پودا جس میں تمباکو کا دھواں پہنچایا گیا تھا، قد و قامت میں بہت چھوٹا تھا۔ اس کی بالیدگی بہت خراب تھی۔ شاخیں ٹیڑھی ترچھی اور کم زور تھیں دوسرا پودا بالکل تن درست تھا۔ اس کا نشو و نما بہت اچھا تھا۔ اس کے پتے ہرے بھرے اور اس کی شاخیں مضبوط تھیں۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں جہاں لوگ افلاس اور امراض کے شکار رہتے ہیں کروڑوں روپے تمباکو نوشی جیسی بُری مخرب صحت عادت پر خرچ ہوتے ہیں۔ اس تمباکو نوشی کے بُرے اثرات ہاتھوں کی انگلیوں سے لے کر ہونٹ، منھ اور پھیپھڑوں، دل و دماغ اور آنکھوں تک پہنچتے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر دیسی تمباکو کو جو صوبہ بہار، اڑیسہ، اور آسام میں بہ کثرت پیدا ہوتا ہے نظر انداز کر دیا جائے جب بھی صرف غیر ممالک سے درآمد کیے جانے والے سگریٹوں اور سگاروں پر چودہ کروڑ ستر لاکھ روپے صرف ہو جاتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے چودہ کروڑ ستر لاکھ روپے!!!

ہماری غذائیں

پھلوں، ترکاریوں، خشک میووں اور اناجوں کی تاثیرات

آلوچہ ــ بہی ــ لسوڑھے ــ امرود

(حکیم اقبال حسین ۔ ایم ۔ اے)

آلوچہ:۔ آلوچہ کو آلو بخارے ہی کی ایک قسم سمجھنا چاہیے کہ ان دونوں پھلوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پھل کا استعمال ایسے لوگوں کے لیے نہایت مفید ہے جو شرارت، بدمعاشی اور بدمزاجی کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ آلوچہ میں کچھ ایسے طبی خواص پائے جاتے ہیں جن کا اثر براہِ راست اعصاب پر پڑتا ہے۔ اور در اصل نظامِ جسمانی میں اعصاب ہی جذبات خبیثہ کا مرکز ہیں چنانچہ بچوں کی اصلاحی جیل میں سینکڑوں سرکش و بے لگام بچوں کی غذا میں جب آلوچہ کو شامل کر کے تجربہ کیا گیا تو معالج کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ایک ہفتے کی قلیل مدت میں وہ بھیڑ کی طرح پُرامن اور صلح پسند بن گئے۔ بعض اہلِ فن کا یہ خیال ہے کہ ہر وہ پھل جو ملین اثرات کا حامل ہوگا یہی نتائج پیدا کرے گا۔ مگر اصل میں ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ایک کثیر الاولاد ماں کا تجربہ ہے کہ یہ مسکن خصوصیت قدرت نے آلوچہ ہی کو بخشی ہے کسی دوسرے ملین پھل میں یہ اثر نہیں پایا جاتا۔

بدمزاج اور چڑچڑے لوگوں کے لیے آلوچے کی چائے نہایت ہی مفید دوا ہے۔ اس کے بنانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ:۔

کوئی ڈیڑھ پاؤ یا آدھ سیر کے قریب کترے ہوئے آلوچے سیر بھر صاف پانی میں رات بھر بھیگے رکھیے۔ صبح کے وقت اسے آگ پر چائے کے پانی کی طرح ابال لیجیے۔ جب پانی خوب اچھی طرح پک جائے تو اسے آگ سے اتار کر تھما لیا جائے، اور اگر پسند ہو تو لیموں کا رس ڈال کر پی لیا جائے ورنہ ویسے ہی کافی ہے۔

آلوچہ میں بھی اتنی ہی شکر ہوتی ہے جتنی انجیر میں۔ اگر پندرہ بیس آلوچے چوبیس سے اڑتالیس گھنٹے تک پانی میں بھگو کر استعمال کیے جائیں تو نہایت قبض کشا اور ملین ثابت ہوتے ہیں۔ جرمن معالجین اس پھل سے عام طور پر ملین دوا کا کام لیتے ہیں۔ اس پھل کے کثرت استعمال میں ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے اور وہ یہ کہ اس کے ساتھ سبز ترکاریوں کا زیادہ استعمال کیا جائے۔ اگر اسے دال چاول وغیرہ اناجوں کے ساتھ کثرت سے کھایا جائے گا تو پیشاب میں تیزابیت بڑھ جائے گی۔ اور گردے کے مریضوں کے لیے نقصان کا باعث ہوگا اسی وجہ سے تیزابیت (ایسیڈٹی) کے مریضوں کو آلو بخارا اور آلوچہ دونوں کے استعمال سے بچنا چاہیے۔

بہی:۔ یہ پھل مفرح قلب و دماغ ہے، مسکن، صحت بخش و مقوی ہے۔ خشک بہی مبرد (ٹھنڈی) ہے اور بخاروں میں تسکین دیتی ہے۔ اس کے بیج جنھیں طبی زبان میں بیدانہ کہتے ہیں سوزاک اور پیچش میں نہایت مفید ثابت ہوتے

ہیں۔ اِن کا لعاب آنتوں کی غشائے مخاطی کو اَڑے ہوئے سدّوں کی خراش سے بچاتا ہے۔ بہدانہ کو اگر گرم پانی میں اُبال لیا جائے تو یہ پانی کھانسی اور گلے، ٹپنا وغیرہ کے لیے بہت ہی نفع بخش ہے۔ ویسے بہدانہ سے حاصل کیا ہوا پانی بیرونی طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے سر میں خشکی ہو جانے کی حالت میں ڈالتے ہیں اور آبلے پڑ جانے اور جھلس جانے کی صورت میں بھی متاثر حصہ ہائے جسم پر لگاتے ہیں۔ نہایت مسکن ثابت ہوتا ہے۔

لس لسہ (لسوڑھے):۔ یہ پھل غایت درجہ لیس دار ہوتا ہے۔ اس کا لعاب کھانسی، سینے، رحم اور پیشاب کی نالی کی بیماریوں کے علاج میں موثر دوا کا کام کرتا ہے۔ صفراوی امراض میں اس کی بڑی مقدار بہ طور ایک ملین استعمال کی جاتی ہے۔ لس لسے کو جلانے کے بعد جو راکھ حاصل ہوتی ہے اس کا چھڑکنا کانچ نکلنے میں نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ ہندستان میں اس کا اچار بھی ڈالا جاتا ہے۔ اس کی گری کا سفوف داد کے لیے ایک نہایت موثر دوا ہے۔ اسے چنبیلی کے تیل میں اچھی طرح ملا کر لگانا چاہیے۔ اس کی چھال کے خیساندہ سے غرارے کیے جاتے ہیں۔ اس کی چھال کا رس ناریل کے دودھ میں ملا کر پلانا شدید دردِ قولنج میں بہت مفید ہے۔

امرود:۔ امرود میں پچیس فی صدی تک غذائیت ہے جس میں شکر کا عنصر بہت غالب ہے۔ حیاتین ج (وٹامن سی)، اس پھل میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ پکا پھل ملیّن ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ اسے چھیل کر نہیں کھانا چاہیے ورنہ یہی پھل قابض ہو جائے گا۔ کچّے امرود کا استعمال اسہال کی حالت میں بہت مفید ہے اور بعض یورپین معالجین اسے گنٹھیا میں بلاتکلف استعمال کراتے ہیں۔ اس پھل کی جیلی مقوّیِ قلب ہونے کے علاوہ قبض کے لیے بہت مفید ہے۔ امرود کا پانی (امرود کے قتلوں کو چوبیس گھنٹے پانی میں بھگو کر اس کا زلال لے لیا جاتے)۔ ذیابطیس کے مریضوں کی پیاس بجھاتا ہے۔

امرود کی چھال کا جوشاندہ بچوں کے مزمن اسہال میں بہت مفید ہے۔ اس کی مقدارِ خوراک تین ماشے ہے ہیضہ اور مُزمن دستوں میں بھی اس کے استعمال سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ بچوں کی کانچ نکلنے کی شکایت میں مقامی طور پر اس کے لگانے سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ مرض سکروی (فسادِ خون) اور خراب قسم کے زخموں کے لیے بھی اس کا استعمال نفع بخش ثابت ہوا ہے۔ مسوڑھے سوج جانے کی صورت میں اس کی چھال کے جوشاندے سے کلیاں کرنا بھی مفید ہے۔

یہ عام خیال ہے کہ "کوفی" (قہوہ) کے استعمال کرنے والے گہری نیند نہیں سو سکتے۔ اور اس آدمی کو تو قطعی نیند نہیں آتی جو عادتاً کوفی نہ پیتا ہو اور کبھی کبھار پی لیتا ہو۔

شکاگو یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے اس صورتِ حال کی تحقیق کرنے کے لیے تجربات کیے۔ چند آدمیوں کا انتخاب کیا گیا اور رات کے وقت ان کو کوفی کی پیالیاں پلائی گئیں۔ دوسرے دن انہی آدمیوں کو سوتے وقت دودھ پلایا گیا۔ اس رات وہ بہت جلد آرام سے سو گئے۔ محققین کا نتیجہ شائع ہو گیا کہ کوفی نیند اڑاتی ہے۔

اِن محققین کو کسی نے یہ نہیں بتایا کہ دودھ میں خواب آور دوا مِلوا دی گئی تھی!

زبان اور علامتِ امراض

از جناب حکیم سید حسن مہدی صاحب طبیب ہمدرد دواخانہ۔ دہلی

طبی معائنہ اور تشخیص امراض میں زمانہ قدیم سے اب تک مریض کی زبان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ بہت سی مرضی علامتیں بیمار شخص کی زبان پر نمودار ہوتی ہیں اور تجربہ کار اطبا مخصوص بیماریوں میں مریض کی نبض، آنکھوں کے رنگ اور چہرے بشرے کی حالت کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی تشخیص امراض میں بڑی مدد لیتے ہیں۔

"ذرا زبان تو دکھائیے" یہ الفاظ اکثر حکیموں اور ڈاکٹروں کے منھ سے آپ نے سنے ہوں گے۔ جب مریض اپنی زبان دکھاتا ہے تو طبیب اس کی ظاہری حالت اور رنگ کا معائنہ کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لال بخار (تپ قرمزی) کے مریض کی زبان اسٹابری جیسی ہلکی سرخ دانہ دار ہو جاتی ہے۔ پیچش میں زبان مرجھا کر اس پر جھریاں سی دکھائی دیتی ہیں۔ ٹائی فائڈ بخار میں زبان بھوری اور خشک ہو جاتی ہے اور جب جگر کا فعل خراب ہوتا ہے تو اس پر ایک گدلے رنگ کی تہہ سی جم جاتی ہے۔

جدید دور میں گو بہت سے تشخیصی آلات اور لیبوریٹری کی پیدا کی ہوئی وہ سہولتیں حاصل ہو گئی ہیں جو طبی معائنہ میں مدد دیتی ہیں، تاہم ان تمام سائنٹفک ترکیبوں کے باوجود نئے سے نئے اطبا کو بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ زبان بہت سی مرضی علامتوں کو صاف طور پر ظاہر کر دیتی ہے اور اندرونی بیماریوں کا افسانہ کہہ دیتی ہے۔

قدرت نے جان داروں کی انفرادی ضرورتوں کے لیے ان کی زبان کو کس طرح ان کی حاجت کے موافق بنایا ہے۔ یہ اسی سے ظاہر ہے کہ بعض بڑی مچھلیوں کی زبان سے حلقوم تک کچھ ایسے دانہ دار ملحقات ہوتے ہیں جو مچھلی کو اپنے شکار پر پوری گرفت رکھنے اور منھ کے اندر ہی اندر اسے الٹنے پھیرنے کی قدرت عطا کرتے ہیں۔ گائے کی زبان کی سطح بھی کھردری ہوتی ہے جس پر کوئی چیز پھسل نہیں سکتی۔ اسی کے ذریعے وہ زیادہ آسانی سے گھاس اور چارہ کو منھ میں لے کر کھا سکتی ہے۔

جو جھلی زبان کے غلاف کا کام کرتی ہے اس کے ابتدائی فرائض یہ ہیں کہ حرارت کی تبدیلی کو اور لمس کے احساس کو ظاہر کرے اور چاروں بنیادی ذائقوں یعنی نمکین، ترش، میٹھے اور تلخ کو الگ الگ شناخت کر سکے۔

بعض عام اور وسیع اعصابی خرابیاں بھی مریض کی زبان کی غیر معمولی اور غیر معتدل حرکتوں سے ظاہر ہو جاتی ہیں مثلاً غدۂ درقیہ کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی سرگرمی میں زبان بھدی اور بدرنگ ہو جاتی ہے اور مرض ام الصبیان میں بے سبب حرکت کرتی رہتی ہے۔

"نقر الدم" یعنے کمی خون کی بیماری میں چوں کہ خون میں سرخ خلایا اور "ہیموگلوبین" کی مقدار میں غیر معمولی کمی ہو جاتی ہے، اس لیے مریض کی زبان پر زردی چھا جاتی ہے۔ پتلی اور صاف رنگ کی زبان جسم میں حیاتینوں کی کمی کا پتہ دیتی ہے۔ اگر زبان میں ورم ہو یا وریدی استسقا کی صورت پیدا ہو گئی ہو تو سمجھنا چاہیے کہ یہ کسی زہریلی بیماری یا کسی مخصوص قسم کے ردِ عمل (الرجی) کا نتیجہ ہے۔ کچھ لوگ جب مچھلی یا اخروٹ یا چاکلیٹ کھاتے ہیں تو ان کی زبان پر اس کا ردِ عمل ہوتا ہے اور زبان متورم ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ کسی دوسرے صدمے یعنے چوٹ یا

کسی کیڑے کے کاٹنے سے بھی زبان پر آماس نمودار ہوتا ہے۔ زبان میں ورم والتہاب کبھی کبھی نکیلے تیز اور دندانہ دار دانتوں سے یا ذائقہ والے گومڑوں (Papilli) کی کسی سمّی بیماری کے باعث ہوتا ہے۔ زبان میں سوزش کا احساس اکثر فقرالدم کی بعض قسموں سے یا حیاتینوں کی کمی سے متعلق ہوتا ہے کبھی کبھی حد سے زیادہ سگریٹ نوشی یا بھنگ نوشی بھی زبان میں جلن پیدا کرتی ہے۔

بعض لوگوں کی زبان "جغرافیائی قسم" کی ہوتی ہے یعنی چکنی ہونے کے بجائے اس کی سطح پر گہری اور لمبی لکیریں ہوتی ہیں اور کہیں کہیں خاکستری رنگ کے دھبے بھی ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ علامت کسی خاص مرض سے متعلق ہو مگر مریض کا دماغ اس صورتِ حال سے بہت پریشان رہتا ہے۔

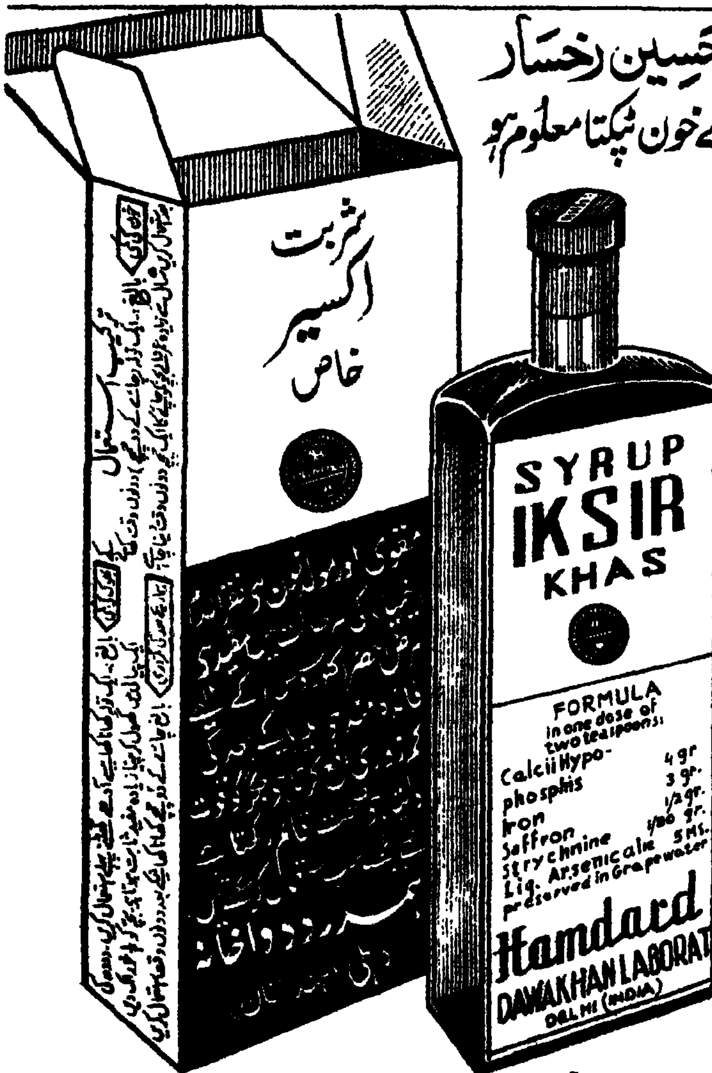
زبان کا زخم یا پھوڑا کسی سمّی مرض یا شدید مقامی رگڑ یا خراش سے پیدا ہوتا ہے اور سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ زخم ہوتا ہے جسے "کینسر" کہتے ہیں۔ یہ علامتیں نہیں بلکہ امراض ہیں۔ ان کی مختلف قسمیں ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بیماریاں خرابیٔ ہضم یا خون کے زہریلے مادوں، یا مریض وسم آلود لوزۃ الحلق یا آتشکی نسوں سے لاحق ہوتی ہیں مگر صحیح اسباب زیرِ تحقیق ہیں۔ ایک خاص قسم کا "کینسر" وہ ہوتا ہے جو تن درست بالغوں کی یا منہ اور دانتوں کی گندگی کے باعث لاحق ہوتی ہیں، مگر صحیح اسباب زیرِ تحقیق ہیں۔ ایک خاص قسم کا "کینسر" وہ ہوتا ہے جو تن درست بالغوں کی زبان پر معین مدتوں کے بعد نمودار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی زبان کا اندرونی پھوڑا جو تھیلیوں میں ہوتا ہے۔ مواد نکال دینے کے بعد جلد اچھا ہو جاتا ہے۔

کھاتے وقت پڑھنا مضر ہے

بعض آدمی کھانا کھاتے وقت اس لیے پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ اس مصروفیت کی وجہ سے وہ غذا کو خوب چباتے رہیں گے اور بغیر چبائے جلد جلد نہیں نگل لیں گے۔ لیکن ان کو یہ خبر نہیں کہ وہ ایک خرابی سے بچنے کے لیے دوسری اس سے بھی زیادہ خرابی مول لے لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اچھے کھانے کی خوش بو، ذائقہ اور ان کا نظارہ یہ سب چیزیں ہماری بھوک میں تحریک پہنچاتی ہیں، اور ہضم غذا پر نہایت اچھا اثر ڈالتی ہیں۔ اس کے برعکس فکر مندی اور کھانے سے دلچسپی نہ ہونا ایسی چیزیں ہیں جو ہضم میں فتور پیدا کیا کرتی ہیں۔ صحیح ہضم کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی خوش دلی سے کھائے۔

ایسے بہت کم لوگ ہو سکتے ہیں جو کھاتے وقت پڑھتے بھی رہیں اور اپنے کھانے کا لطف بھی اٹھاتے رہیں۔

ایسے حسین رخسار
جن سے خون ٹپکتا معلوم ہو



شربت اکسیر خاص (رجسٹرڈ) سے بن سکتے ہیں

تن درست اور جوان رہنا آپ کا فرض ہے

ہمدرد دواخانہ، دہلی

یوگا ورزشیں

زیر نظر ورزش ہر چند نہایت سادہ اور سہل ہے لیکن اس کی گہرائیوں افادیت کو دیکھتے ہوئے اس ذہین دماغ کو بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے جس نے ایسی نفع بخش اور کارآمد ورزش کی حرکات کو اتنی سمجھ بوجھ کے ساتھ مقرر کیا ہے تقریباً ہر شخص بآسانی کر سکتا ہے سوائے اس کے جس کے ریڑھ کی ہڈی غیر معمولی طور پر سخت اور بے لچک ہو، بہرحال وہ بھی کچھ ہفتے کی مشق کے بعد ایک نہ ایک دن اس پر قدرت حاصل کر لے گا۔

ورزش

بالکل چت لیٹ جائیے اس طرح کہ دونوں بازو پہلوؤں میں رہیں اور جسم میں کسی قسم کی سختی نہ ہو سانس برابر لیتے رہیے۔ اس کے بعد دونوں ٹانگیں اوپر کی جانب اٹھائیے۔ اس طرح کہ وہ آپس میں برابر ملی رہیں اور بالکل سیدھی ہوں۔ انھیں برابر اونچا کرتے رہیے۔ جب کولھے اٹھنے لگیں تو ان کے نیچے دونوں ہاتھوں کا سہارا لگا دیجیے۔



تاکہ وہ نیچے نہ آسکیں۔ اور ان کے سہارے سے ٹانگوں کو مزید اوپر کی جانب اٹھایا جاسکے۔ جب پورا جسم بالکل سیدھا شانوں کی پشت پر قائم ہو جائے جیسا کہ کوئی تصویر سے ظاہر ہے تو آہستہ سے دونوں ہاتھوں کو کولھے پر سے سرکا کر کمر پر لے آئیے۔ اس سے جسم کو ایک قسم کا سہارا مل جائے گا اور وہ کچھ دیر اسی ہیئت میں قائم رہ سکے گا۔

ورزش شروع کرتے وقت ایک بات جس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے یہ ہے کہ ٹھوڑی کو سینے کے اس حصے سے ذرا اوپر لگا دینا چاہیے جہاں دونوں ہنسلی کی ہڈیاں ملتی ہیں اور وہ دوران ورزش میں اسی مقام پر اس طرح لگی رہنی چاہیے جیسے چپک گئی ہو۔ ملاحظہ ہو بڑی تصویر جب جسم اس ہیئت پر اچھی طرح قائم ہو جائے تو پھر ہاتھوں کا سہارا ہٹا لینا چاہیے اور ہاتھ حسب سابق فرش پر لٹا دینے چاہییں۔ ملاحظہ کیجیے بڑی تصویر شروع میں یہ ہیئت ایک منٹ تک قائم رکھیے۔ اگر کمزور ہوں تو آدھا منٹ بھی کافی ہوگا۔ اس دوران میں اپنے خیالات غدہ درقیہ پر جمائیے اور پھر واپس پہلی حالت پر آجائیے۔ یہ سب کچھ آپ عجلت اور گھبراہٹ کی حالت میں نہیں کریں گے بلکہ نہایت سہولت اور اطمینان کے ساتھ کریں گے اس لیے کہ یوگا ورزشیں اطمینان ہی سے کرنی چاہییں۔

شروع میں دو ہفتے تک تو اس ورزش کی عملی مدت اتنی ہی کم رہنی چاہیے۔ پھر ہر ہفتے ایک منٹ کے حساب سے بڑھاتے رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ بیس منٹ تک پہنچ جائیں۔ اگرچہ طبیعت پر اس ورزش کے اچھے اثرات کا احساس تو اس وقت ہی سے ہونے لگے گا جب آپ اس ورزش کو آٹھ منٹ تک کرنے لگیں گے۔ لیکن پورا فائدہ اس سے اسی وقت حاصل ہوگا جب آپ پورے بیس منٹ تک کرنے لگیں گے۔ بہتر وقت اس ورزش کے لیے شام کا ہے۔ **معالجاتی فائدے**:۔ (۱) ٹھوڑی کو ہنسلی سے اوپر لگانے سے یہ فائدہ ہوگا کہ دورانِ خون کا رخ غدہ درقیہ کی طرف ہو جائے گا جس سے ان غددوں کی صحت بحال رہے گی۔ اس حقیقت سے آج شاید ہی کوئی لاعلم ہوگا کہ جس کے غدۂ درقیہ صحیح حالت میں ہیں صحیح معنے میں وہی صحت مند بھی ہیں۔

(۲) اس ورزش کے اثر سے جگر اور تلی کی خرابیاں دور ہوتی ہیں اور ان کا دورانِ خون درست ہو جاتا ہے۔

(۳) قبض ہمیشہ کے لیے رفع ہو جاتا ہے (۴) خونی اور بادی بواسیر کے مریضوں کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔

(۵) ریڑھ کی ہڈی کے اعصاب کو تقویت پہنچتی ہے (۶) آنتوں کی سستی اور دوسرے امراض رفتہ رفتہ جاتے رہتے ہیں

(۷) سوء ہضمی کی شکایت کبھی نہیں ہوتی (۸) التہاب زائدہ اعور (اپنڈیسی سائٹس) کا بلا آپریشن علاج ہو جاتا ہے۔ مگر درد کے دوروں کی حالت میں اسے ہرگز نہ کیا جائے۔ (۹) رجولیت کی کمی اور کمزوری باہ کے مریض درست ہو جاتے ہیں (۱۰) یہ ورزش کثرت جماع اور دوسری غلط کاریوں کی وجہ سے صنفی غدد میں جو کمزوری نقص اور دبلا پن پیدا ہو جاتا ہے اسے دور کر کے ان کے وزن اور قوت کو بحال کر دیتی ہے۔ (۱۱) صنفی بے اعتدالیوں کی وجہ سے جو جسمانی کمزوری واقع ہو جاتی ہے۔ اس ورزش کی ملاومت سے نہ صرف وہ جاتی رہتی ہے بلکہ پھولی ہوئی رگیں بھی ٹھیک ہو جاتی ہیں (۱۲) اس ورزش سے عورتوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ انھیں رحم کی شکایات نہیں ستاتیں اور خصیۃ الرحم کے نقائص جاتے رہتے ہیں اور ایام میں باقاعدگی آجاتی ہے۔ (۱۳) بار بار وضع حمل کی وجہ سے جن عورتوں کی صحت خراب ہو جاتی ہے یہ ورزش ان کی صحت کو بحال کر دیتی ہے (۱۴) تناسلی شکایات خواہ مردوں کو ہوں یا عورتوں کو ان کی اصلاح کرتی ہے (۱۵) فتق (ہرنیا) کے علاج میں بھی یہ ورزش بہت


گھر میں، ہسپتال میں، سفر میں اور
شکار میں بھی ہمدرد مرہم ساتھ رکھنا
ضروری ہی۔ ہر حادثے کے وقت
کام آنے والا ہی۔ ہر تکلیف کو
رفع کرنے والا ہی۔
خالص نباتی چیز ہی۔
اسے ہمدرد بناتا ہی۔
HAMDARD OINTMENT
HEALING SOOTHING ANTISEPTIC
AKHLAQ
ہر جگہ ملتا ہی آج ہی خرید کر اپنے پاس رکھیے

انتقاد

جنسی امراض اوران کا علاج

تقطیع ۲۲×۱۸/۸، ضخامت ۳۲۸ صفحے، قیمت چار رُپے۔
پتہ: منیجر صاحب کتب خانہ لطفِ زندگی، اندرون موچی دروازہ لاہور

کرنل بھولا ناتھ آں جہانی نے جنسی امراض اوران کے علاج پر سنہ ۱۹۳۴ع میں یہ کتاب تالیف کی تھی جسے اصحاب علم و فن نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ موصوف نے اس تالیف میں اس موضوع پر سنجیدہ قدیم و جدید معلومات کو جمع کرنے کی کوشش کی تھی جو بڑی حد تک کام یاب تھی۔ اب اس کا یہ دوسرا ایڈیشن جناب حکیم مظفر حسین صاحب اعوان نے کچھ ترمیم کے بعد شائع کیا ہے اور مشکل الفاظ اور اصطلاحات کا مفہوم عام فہم الفاظ میں لکھ دیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ جنسیات پر علمی اور فنی بحث پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں حکیم مظفر حسین صاحب اعوان نے یونانی، ویدک اور مغربی طبوں کے نسخے نہایت محنت سے مرتب کیے ہیں اور تیسرے حصے میں برتھ کنٹرول کے متعلق مفید معلومات پیش کی گئی ہیں۔ انگریزی زبان میں جنسیات پر مفید علمی اور فنی کتابوں کی کمی نہیں، لیکن ہماری زبان میں اس موضوع پر گنتی کی چند کتابیں ہیں اوران میں سے ایک "جنسی امراض اوران کا علاج" ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب نہ صرف اصحابِ فن کے لیے کارآمد ہوگی بلکہ علمی ذوق رکھنے والے غیر فنی اصحاب بھی اس سے پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

جدید طبی فارماکوپیا

تقطیع ۳۰×۲۰/۸، ضخامت ۱۲۴ صفحے، قیمت ایک رُپیہ۔
پتہ: دفتر رسالہ "الطبیب" سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ۔ لاہور۔

رسالہ الطبیب لاہور نے سنہ ۱۹۴۷ع کا سالنامہ "جدید طبی فارماکوپیا" کے نام سے پیش کیا ہے۔ جس میں آیورویدک اور یونانی انجکشن، اعادۂ شباب، غدودی ادویہ، قیمتی پتھروں کے متعلق قدیم و جدید معلومات پیش کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ آخر میں مفید نسخے بھی جمع کیے گئے ہیں۔ بعض بوٹیوں کے خواص بھی اصحاب تجربہ نے لکھے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے یہ اشاعت خاص معالجین کے لیے مفید اور کارآمد ہے۔

سالنامہ آج کل

تقطیع ۲۲×۱۸/۴، ۱۷۹ صفحے، قیمت ایک رُپیہ چار آنے۔
پتہ: منیجر صاحب رسالہ "آج کل" راج پور روڈ، دہلی۔

پندرہ روزہ رسالہ آج کل نے اپنے ادبی اور علمی وقار کی وجہ سے ملک کے رسالوں میں نمایاں جگہ حاصل کرلی ہے۔ اس نے اپنے قلمی معاونین کا ایک ایسا حلقہ قائم کرلیا ہے جو ہر لحاظ سے ممتاز ہے۔ اس کے علاوہ اداریٔ کا ذوقِ سلیم بھی رسالہ کی باطنی وظاہری خوبیوں کا ضامن ہے۔ پیش نظر سالنامہ منظومات، مقالات اور افسانوں کا ایک قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ حصۂ نظم میں ملک کے ممتاز شعرا ہیں۔ مقالات کی تحریر میں بھی سربرآوردہ ادبی شخصیتوں نے حصہ لیا ہے۔ افسانوں کا معیار بھی ہر لحاظ سے بلند ہے۔ کتابت و طباعت کی خوبی اور تصاویر کے تنوع نے

سالنامہ "آج کل" جاذبِ نظر بنایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ شائقین علم و ادب اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

جادہ

تقطیع ۲۶×۲۰/۸، ضخامت ۶۴ صفحے، قیمت سالانہ پانچ رُپے چھ آنے۔
پتہ:- دفتر رسالہ "جادہ" نور محل روڈ، بھوپال۔

جناب کوثر صاحب چاند پوری کا نام ملک کے ادبی اور علمی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے افسانے فنی خوبیوں ہی کے حامل نہیں ہوتے بلکہ اصلاح و اعتدال کی بھی تبلیغ کرتے ہیں۔ موصوف نے حال ہی میں اپنی ادبی جولانیوں کے نئے جادہ پر قدم رکھا ہے۔ تین ماہ کی جادہ پیمائی سے جو نشانات اس جادہ پر مرتسم ہوئے ہیں، ان سے جادہ پیما کی سلامت روی اور استقلال صاف ظاہر ہے۔ "جادہ" میں علمی و ادبی ذوق کی تسکین کا سامان کافی موجود ہے۔ ہمیں امید ہے کہ "جادہ" نہ صرف بھوپال میں صحیح ادبی ذوق کی توسیع و استحکام کا باعث ہوگا بلکہ اس کا مفید اثر دور تک محسوس کیا جائے گا۔

آستانہ

تقطیع ۳۰×۲۰/۸، ضخامت ۷۲ صفحے، قیمت سالانہ دو رُپے۔
پتہ: دفتر رسالہ "آستانہ" عقب جامع مسجد، دہلی۔

جناب محمد محسن فاروقی کی ادارت میں رسالہ آستانہ بڑی شان اور اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں تصوف کے معلوماتی اور جذباتی مضامین قارئین کی ضیافتِ رُوح کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ نثر و نظم کے لیے یکساں اہتمام ہے۔ بلکہ بعض جگہ نظم کی فراوانی کا یہ حال ہے کہ تصاویر کی تعارفی عبارت بھی قلم سے نکلتے نکلتے نظم بن جاتی ہے۔ آستانہ کا پہلا پرچہ جو ہمارے پیش نظر ہے، کتابت اور طباعت اور اپنے خوبصورت ٹائیٹل کی وجہ سے مرصع ہے۔ ہمیں امید ہے کہ نہ صرف ظاہری لحاظ سے بلکہ باطنی خوبیوں کی وجہ سے بھی آستانہ رسالوں کی صفوں میں ممتاز ہوگا۔

زارینہ

تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶، ضخامت ۱۸۲ صفحے، قیمت دو رپے آٹھ آنے۔
پتہ: مکتبہ ادب اُردو، لال کنواں، دہلی۔

یہ آخری ملکہ رُوس کی داستان زندگی ہے جو اپنے اندر تاریخی معلومات کے ساتھ عبرت کا سامان بھی رکھتی ہے۔ محمد رحیم صاحب چمن دہلوی نے رسالہ کا ترجمہ خوبی اور سلاست سے کیا ہے۔ رسالہ کے مؤلف نے زارینہ کی زندگی کے خد و خال کو واضح کرنے میں تاریخی تسلسل کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ انداز بیان دل چسپ ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

شرح میر درد

تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶، ضخامت ۲۰۸ صفحے، قیمت دو رُپے آٹھ آنے۔
پتہ: مکتبہ ادب، لال کنواں، دہلی۔

اردو ادب کی دنیا میں خواجہ محمد شفیع صاحب کی ذات اور ان کی مخصوص طرزِ انشا رمحتاج تعارف نہیں

ہو۔ ان کی تازہ تصنیف شرح میر دردؔ ہمارے لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ ہو۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اس کتاب کا "پیش لفظ" تحریر فرمایا ہو۔ ہمیں ان کی رائے سے پورا اتفاق ہو کہ "کلام کی شرح تو خیر ایک چیز ہی ہی، شارح کی نثر بجائے خود ایسی ہو کہ فصاحت لوٹی جاتی ہو" دوسری طرف ہمیں افسوس ہو کہ اوپر کے الفاظ میں پروف کی ایک بڑی غلطی موجود ہو، یعنی لفظ "شرح" کی جگہ "شرع" شائع ہو گیا ہو۔

زیر نظر کتاب کے دیباچے میں خود مصنف فرماتے ہیں کہ "خواجہ میر درد کی شاعری اور وہ خود تصوف کی گود میں پلے، پروان چڑھے۔ اس صنف کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ جس آسانی، روانی، شگفتگی اور برجستگی سے ان مسائل کو وہ بیان کر جاتے ہیں، دوسرا نہیں کر سکتا" یہ خیال صحیح ہو اور شاید یہی سبب ہو کہ اشعار کی تشریح اور معنوی خوبیوں کے اظہار میں مصنف نے خواجہ صاحب کی شاعری کے اسی پہلو کو زیادہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن خواجہ صاحب کے ذوقِ سخن گوئی اور کمالِ فن کے ساتھ یہ ناانصافی ہو کہ ان کی غزل سرائی کے ایک دوسرے اہم پہلو کو جو تغزل کی رُوح ہو ان کے "تصوف" کے پہلو بہ پہلو جگہ نہیں دی گئی ہو۔ خواجہ میر درد کے اکثر و بیشتر اشعار میں حسن و عشق کی وہ باتیں جنہیں شعری اصطلاح میں "معاملہ بندی" کہتے ہیں اور جسے حضرت داغؔ کی شاعری کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہو، انتہائی حسن و خوبی سے بیان کی گئی ہیں اور پھر استعارات، محاکات اور حسنِ تعلیل وغیرہ کے جو گل زار کھلے ہوئے ہیں، ان کی رعنائی و دل فریبی کی طرف بھی کافی توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ بہرحال خواجہ میر دردؔ کے دیوان کی شرح لکھنے میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہو کہ ان کی غزلیں تو پوری پوری شائع کی گئی ہیں، لیکن شرح صرف چند منتخب اشعار کی لکھی گئی ہو، جن پر نمبر ڈال دیے گئے ہیں۔ صرف غزلیں ہی نہیں بلکہ خواجہ میر دردؔ کے تمام "افراد" اور رباعیات اور مخمسے وغیرہ بھی موجود ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہو کہ منتخب اشعار کی شرح کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب کا پورا دیوان بھی خریدار کو دست یاب ہو جاتا ہو۔ ہم نے دورانِ مطالعہ میں کہیں کہیں یہ دیکھا ہو کہ بعض ایسے اشعار کی شرح پیش کی گئی ہو جو بہت صاف اور سہل تھے اور بعض ایسے اشعار نظر انداز کر دیے گئے ہیں جو کسی حد تک تشریح کے طالب تھے۔ لیکن اس کے لیے خود مصنف کا یہ بیان کافی ہو کہ "میں جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ شرح اغلاط سے مبرا نہیں، نیز اکثر اشعار تشنۂ معنے رہ گئے ہوں" بہرحال اس میں شک نہیں کہ شعر و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے اس "شرح" میں کافی سامانِ دل چسپی موجود ہو اور یہ خوب صورت کتاب ہر کُتب خانہ کی زینت بنائے جانے کے لائق ہو۔

ہم اور وہ

تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، ضخامت ۸۸ صفحے، قیمت ایک رُپیہ آٹھ آنے۔
پتہ: مکتبۂ ادب۔ لال کنواں، دہلی۔

یہ کتاب بھی جناب خواجہ محمد شفیع صاحب کی تصنیف ہو۔ اور ہم ہندستانی اور پاکستانی مسلمانوں کے گزرے ہوئے زمانے اور موجودہ زمانے کی حالت پر ایک بحث ہو جو نئے انداز سے قلم بند کی گئی ہو جیسا کہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اس کتاب پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا ہو "قدیم و جدید کی بحث اب ختم ہو چکی ہو اور کوئی جدت اس میں باقی نہیں رہی" لیکن مصنف کی زندہ دلی نے اس بحث

میں نئی جان ڈال دی ہو۔ اس کتاب کی تصنیف کا سبب یہ ہو کہ اس کا جواں سال مصنّف بوڑھوں سے پیش رفتگاں کی تعریف اور اپنی ہجو سنتے سنتے تھک گیا تھا اس لیے اس نے اوّل الذکر کی لن ترانی کا جواب ترکی بہ ترکی دینے کا فیصلہ کرلیا۔ مصنف کا بنیادی خیال ان چند فقروں سے ظاہر ہو کہ جب "بڑے میاں" بزرگانِ سلف کی تعریف فرماکر" نوجوان" کو بُرا بھلا کہتے ہیں تو نوجوان جواب دیتا ہو کہ "یہ سچ ہو کہ ہم بیمار ہیں .... لیکن اس سے انکار نہ کیجیے کہ ہم کو بیماری ورثہ میں ملی ہو اور بڑوں نے خریدی تھی۔ ہم پا بہ جولاں ہیں اس لیے کہ ہمارے پیش رفتگاں کج رفتار رہتے۔ ہم کو حکم زباں بندی ہو اس لیے کہ ہمارے اجداد کلمۃ الحق سے منحرف ہوئے۔ دریدہ دہنی اختیار کی۔ ہم غلام ہیں اس لیے کہ آزاد منش بڑے بوڑھوں نے آزادی عیش وعشرت کی بھینٹ چڑھا دی ..... ان کے گناہوں کے عذاب ہم بھگت رہے ہیں۔ ان کی خطاؤں کی مکافات ہم کو بھگتنی پڑ رہی ہیں"۔ ایک بوڑھے اور ایک جوان کوّے کی کہانی سے ابتدا کرنے کے بعد اس کتاب میں شروع سے آخر تک اسی دعوے کی دلیلیں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہو، خواہ وہ دلیلیں دورِ گزشتہ کی اردو شاعری کی شکل میں ہوں یا آخری مغل فرمارواؤں کے اعمال و واقعات میں۔ الغرض "اخلاف" کی طرف سے اس امر کی ذمہ داری "اسلاف" پر ڈالی گئی ہو کہ وہ ہمارے لیے غلامی کا ورثہ چھوڑ گئے ہیں۔ "ہم اور وہ" کے مصنف ... کہیں کہیں جذبات سے مغلوب ہوکر" غلو اور مبالغہ کی طرف جُھک پڑا ہو"۔

جام و مینا

$\frac{20\times30}{16}$، ضخامت ۳۰۴ صفحے، قیمت دو رُپے آٹھ آنے۔
مکتبۂ ادب، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔

اس کتاب میں حکیم یوسف حسن صاحب ایڈیٹر رسالہ نیرنگِ خیال، لاہور نے ملک کے ان مشہور افسانہ نگاروں کے تیرہ افسانے جمع کیے ہیں جو جدید ادب اردو کے پہلے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ... کے نام یہ ہیں: حضرت خواجہ حسن نظامی، منشی پریم چند، سلطان حیدر جوش، سدرشن، حامد اللہ افسر، ... مجید سالک، سیّد نصیر حیدر، ایم اسلم، نذر سجاد حیدر، بلقیس خاتون جمال وغیرہ۔ ان افسانوں کو اگر ہم اردو کی جدید افسانہ نگاری کے ابتدائی دور کا آئینہ دار کہہ سکتے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ یہ افسانے اپنے مصنفین کی طرزِ تحریر کے مختلف نمونے بھی پیش کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ادبی رسائل کی جلدوں میں افسانوی ادب کے بڑے بیش بہا ذخیرے موجود ہیں، اور ان کو کتابی صورت میں جمع کرنا ایک مستحسن کارنامہ ہو۔ اس سلسلے میں مرتب کا جو ارادہ ہو وہ خود ان کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہو۔ وہ کہتے ہیں: "نیرنگِ خیال کی بیس سالہ ادبی خدمت کا انتخاب بیس جلدوں میں پیش کرکے انھیں موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لیے محفوظ کردینا ہمارا مطمحِ نظر ہو"۔ زیرِ نظر کتاب "جام و مینا" اس سلسلے کی دوسری کڑی ہو۔

اس مجموعے میں سب سے طویل افسانہ "سُرخ ساڑی" جناب عبدالمجید سالک بی اے مدیرِ انقلاب کا ہو، اور غالبًا اس کی طوالت ہی کے باعث اسے مجموعے میں پہلی جگہ دی گئی ہو۔ "سُرخ ساڑی" کے اصلی پلاٹ میں محبت کی ابتدا، تو اُسی قدیم واقعہ سے ہوتی ہو جسے "پہلی نظر کی محبت" کہتے ہیں۔ یعنی ایک کنواری لڑکی اپنی بھاوج کے ساتھ باغ کی سیر کر رہی ہو کہ ایک طرف کو نگاہ اُٹھاتے ہی اس نے دیکھا کہ کوئی مرد

پہاڑی کی دوسری طرف بیٹھا تھا اور اب ہماری آواز پر سن کر اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اسی وقت ہماری یہ صورت حال ہو گئی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

یعنی دونوں پر "کیوپڈ" کے تیر کا فوری حملہ ہوا اور دونوں مبتلائے محبت ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد افسانہ نئی نئی دل چسپیوں کا جامہ پہن لیتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ہیروئن کی داستانِ حیات دل پر ایک گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ مختصر واقعہ یہ ہے کہ ہیروئن کی شادی اس کی توقع کے خلاف ایک دوسرے شخص سے ہو جاتی ہے، اس کی امیدوں کا چراغ گل ہو جاتا ہے اور اس کا مطلوب ہمیشہ کے لیے لاپتہ ہو جاتا ہے۔ لیکن وقت اپنی چال چلتا رہتا ہے، زمانہ گزر جاتا ہے، یہاں تک کہ ہیروئن بوڑھی ہو کر پوتوں پوتیوں والی بھی ہو جاتی ہے، پھر بھی اس کے پاس اس کی پہلی محبت کی یادگار ایک طلائی ار تھا اور اس کے ساتھ لباس عروسی کی ایک سُرخ ریشمی ساڑھی تھی، جسے ایک مرمریں ڈبہ میں رکھ چھوڑا گیا تھا۔ اس افسانے کے تار و پود اسی سُرخ ساڑی سے متعلق ہیں۔ افسانہ یقیناً دل چسپ ہے۔

دوسرا افسانہ "جین کا سنبوسہ" جناب سلطان حیدر کی "متین ظرافت نگاری" کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے مگر اسے ہم ایک ایسا قصہ کہہ سکتے ہیں جو کوئی پلاٹ یعنی بنیادی خاکہ تو نہیں پیش کرتا مگر تفریح کا خاصہ سامان پیش کرتا ہے۔

"نغمۂ روح" منشی پریم چند کے جادو نگار قلم کا نتیجہ ہے لیکن یہ منشی پریم چند کے اُس دَورِ تحریر کا نمونہ ہے جس میں تخیل اور روحانیت کے عناصر زیادہ اور روزمرّہ کی زندگی کے نفسیاتی پہلو کم ہوا کرتے تھے بعد میں ان کی تحریروں نے کسانوں اور مزدوروں اور عام لوگوں کے حالات کی تشریح کا ایک خاص رنگ اختیار کر لیا تھا۔

جناب سیّد نصیر حیدر صاحب ڈپٹی کلکٹر جن کا افسانہ "تصویر" اس مجموعے میں پیش کیا گیا ہے غالباً صوبۂ بہار کے رہنے والے ہیں۔ ایک زمانے میں اس صوبے کے اکثر رئیس اور باحیثیت حضرات اپنے لڑکوں کو تعلیم حاصل کرانے کے لیے انگلستان بھیج دیا کرتے تھے، اور ان نوجوانوں میں سے بعض حضرات ایک "ولایتی بیوی" جسے نصیر حیدر صاحب نے "دُم چھلا" کہا ہے، ساتھ لے آتے تھے۔ اگرچہ اس افسانے کا ہیرو کوئی "دُم چھلا" نہیں لایا اور اپنی ہندُستانی محبوبہ اور منگیتر ہی کی محبت میں مبتلا رہا، تاہم یہ افسانہ کسی ایسے ہی واقعہ سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ بہر حال افسانہ دل چسپ ہے، اگرچہ کہیں کہیں زبان کی خامیاں پائی جاتی ہیں۔

"قلی شاہزادہ" کے مصنف یعنی حضرت خواجہ حسن نظامی کا نام ان کے خاص طرزِ انشا اور دلّی کی ٹکسالی زبان کے لیے اس قدر مشہور ہے کہ ان کا یہ افسانہ تبصرے سے بالاتر ہے۔ "قلی شاہزادہ" آخری فرمانروائے دلّی بہادر شاہ کی ایک پوتی اور اس کے لڑکے کا ایک دردناک افسانہ ہے۔ اور اس سلسلے میں غدر کے کچھ واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے واقعات کے متعلق جو باتیں خواجہ صاحب کے قلم سے نکلی ہوں گی وہ کس قدر با اثر اور اَلَم انگیز ہوں گی۔

جناب سدرشن ہندستان کے بڑے مشہور و مقبول افسانہ نگاروں میں ہیں۔ ان کا افسانہ

"سدا شگفتہ" جو اس مجموعے میں شامل ہو قطعاً ایک معیاری افسانہ ہو، اور ہمارے نئے افسانہ نگاروں کے لیے چراغ ہدایت کا بھی کام دے سکتا ہو۔ یہ ایک شخص کے ایثار و قربانی کی دل چسپ داستان ہو جس میں نفسیاتی تحلیل کے تمام عناصر موجود ہیں۔ افسانے کا پلاٹ بھی ماہرانہ افسانہ نگاری کا ثبوت بہم پہنچاتا ہو۔

نذر سجاد حیدر صاحبہ کا افسانہ "حق بہ حق دار" ایک قابلِ تحسین سوشل افسانہ ہو۔ لیکن اس میں واقعات کی بھیڑ بھاڑ زیادہ ہو اور تخیل و تصور کی رنگینیاں کم ہیں۔ بہر حال دل چسپی کی کمی نہیں ہو۔ افسوس ہو اس افسانے کی کتابت اس طرح ہوئی ہو کہ تمام مکالموں کو مسلسل لکھ دیا گیا ہو اور ان کے لیے نئے پیرے گراف نہیں بنائے گئے ہیں۔

"مجرم کون؟" ایک اچھا اور مفید اخلاقی افسانہ ہو جس سے سبق حاصل کیا جا سکتا ہو۔ جناب علم الدین صاحب بی۔ اے نے ایک مفید موضوع پر قلم اٹھایا ہو۔ اس کا خلاصہ یہ ہو کہ ایک شخص اپنی فضول خرچ اور نمائش پسند بیوی کے مطالبات پورے کرنے کے لیے دفتر کی رقموں کو غبن کرنا شروع کر دیتا ہو۔ آخر وہ اس جرم میں ماخوذ ہوتا ہو اور اسے سزائے قید دی جاتی ہو۔ جیل خانے میں اس کی صحت اس درجہ خراب ہو جاتی ہو کہ رہائی کے کچھ دنوں بعد وہ مر جاتا ہو۔ نمائش پسند عورتوں اور مردوں کی ذہنی اصلاح کے لیے ایسے افسانوں کی ضرورت ہو۔

جناب ایم اسلم صاحب مشہور افسانہ نگاروں کی صف میں ایک خاص جگہ رکھتے ہیں۔ ان کا افسانہ "نوروز" ایک خاص دل کشی رکھتا ہو۔ اس مجموعے میں "سدا شگفتہ" کے بعد اس افسانہ کا پلاٹ سب سے اچھا ہو۔ اور اس افسانے کے آخر میں جو ایک بالکل غیر متوقع مگر بے حد افسوس ناک حقیقت سامنے آجاتی ہو۔ اس نے اس کا پایہ بہت بلند کر دیا ہو۔

"بہن کی محبت" (از جناب حامد اللہ صاحب افسر بی۔ اے، میرٹھی) ایک گونگی لڑکی کی نتیجہ خیز کہانی ہو۔ ایک شخص نے اپنی بے زبان بیوی کے چھوٹے اور معصوم بھائی کو اس لیے قتل کرا دیا کہ اس کی پوری جائداد کا مالک بن جائے۔ لیکن پھر اس کو بھی قاتلوں کے خنجر کا شکار ہونا پڑا۔ دردناک افسانہ ہو اور طرزِ بیان و زبان خاص طور پر اچھی ہو۔

بلقیس خاتون جمال صاحبہ کا افسانہ "کرشمۂ تقدیر" اچھے خاکہ پر تیار کیا گیا ہو۔ اس میں ضمنی طور پر غدر کے واقعات آ گئے ہیں اور آخر میں بچھڑے ہوئے لوگ یعنی شوہر، بیوی اور بچے اس طرح ملتے ہیں کہ دل پر اس واقعہ کا اثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"حیاتِ ثانی" خود اس مجموعے کے مرتب جناب حکیم یوسف حسن صاحب کا ایک دل چسپ افسانہ ہو۔ پلاٹ کسی قدر حیرت انگیز ہو جس میں ایک ایسی مردانہ روح کا تذکرہ ہو جو بے جان زنانہ قالب میں بھی جلوہ گر ہو جاتی ہو۔ افسانہ دل کش ہو مگر بہت سی باتیں بعید از قیاس ہیں۔ پھر بھی ہمیں شکسپیر کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ زمین و آسمان کے پردوں میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو فلسفے کی کتابوں میں نہیں پائی جاتیں۔

آپ کا نونہال

تن درست اور سب میں ممتاز رہے





ہوشیار مائیں اپنے بچوں کو ہمیشہ نونہال (رجسٹرڈ) دیتی ہیں۔
کیوں کہ وہ جانتی ہیں کہ "نونہال" ان کے معصوم بچوں کے لیے ایک بہترین ٹانک ہے جو ان کی جسمانی ضرورتوں اور کیلسیم کی کمی کو پورا کرتا ہے
نونہال آپ کے بچوں کو ہمیشہ تن درست رکھتا ہے۔ بدہضمی۔ سبز دست پیچش، بخار وغیرہ نہیں ہونے دیتا۔ اور اگر یہ مرض ہو جائیں تو ان کو فوراً آرام کر دیتا ہے۔



دانت نکالنے کے زمانے میں ماؤں! آپ کے بچوں کو ——
"نونہال" سے بہتر چیز نہیں ملے گی!

نونہال پینے والے بچے دوسرے بچوں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں
کئی شیشیاں گھر میں رکھنی چاہییں۔

ہمدرد دواخانہ۔ دہلی

سوال وجواب

حکیم محمد سعید دہلوی

برقع کا فلسفہ :-

سوال :- معاف کیجیے، میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آخر اس برقع وغیرہ کا فلسفہ کیا ہے اور اس کے فائدے کیا ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ مرد تو جہاں چاہیں چلے جائیں۔ ان پر کوئی روک ٹوک نہیں، مگر عورت گھر سے باہر بھی نہیں نکل سکتی۔ مرد جس طرح چاہیں خوب بن سنور کر نکلیں۔ مگر ان بیچاریوں کو اوڑھ لپیٹ کر بھی نکلنے کی اجازت مشکل ہی سے دی جاتی ہے۔ کیوں صاحب! کیا ان غریبوں کے پاس دل نہیں ہے؟ کیا ان کا دل نہیں چاہتا ہوگا کہ وہ بن سنور کر نکلیں اور جو حُسن انھیں قدرت نے عطا کیا ہے اس کی نمائش میں خواہ مخواہ بخل سے کام نہ لیں؟ میں سمجھتا ہوں، اگر پردے کا رواج اُٹھ جائے تو ہندستان اور پاکستان کی عورتوں کی عمریں بھی یورپین عورتوں کی طرح بڑھ جائیں۔ (ایک خریدار)

جواب :- حضرت آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی بود و باش زیادہ تر گاؤں اور قصبوں میں رہتی ہے۔ ورنہ اگر کہیں آپ کو کراچی، لاہور، دلی، کلکتہ، بمبئی اور ایسے ہی دوسرے بڑے شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہوتا تو برقع کا فلسفہ آپ ہم سے پوچھنے کے بجائے خود بتاتے پھرتے۔ گاؤں اور چھوٹے قصبوں کو جانے دیجیے کہ یہاں تو جاہل اور ان پڑھ لوگ رہتے ہیں۔ ذرا شہروں میں جاکر دیکھیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہی برقع جس کا نام آپ نے اس حقارت سے لیا آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ حسن کو دو بالا کرنے اور جسمانی خرابیوں اور عضوی بدنمائیوں کی پردہ پوشی میں کتنا بڑا حصّہ لے رہا ہے اور اب تو برقع پوشوں کے ہراول (Advance Guard) میں ایک اور بھی جدّت دیکھنے میں آرہی ہے جس کے عام ہونے میں قدرے دیر لگتی معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ پاکستان اور ہندستان کی عام مسلمان عورتوں میں آزادی اور حریت فکر کا داعیہ ابھی اس قدر نہیں اُبھرا ہے کہ وہ ہر قسم کی قید و بند کو توڑ ڈالیں۔ بہرحال اگر یہ برقع عام ہوگیا ــــــ اور کوئی وجہ نہیں کہ نہ ہو۔ اس لیے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے ہاں کی عورتیں اس تہذیب و ترقی کے زمانے میں زیادہ مدّت تک دوسری قوموں سے پیچھے رہ جائیں ــــــ تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں ایسی جاذبیت ہوگی کہ ہزار عریانیاں اس پر سے قربان ہو جائیں گی۔ اس میں کسی من چلے نے یہ استادی رکھی ہے کہ جسم کی بدنمائیاں اگر ہوں تو وہ بھی ڈھک جائیں اور جن حصّوں کی نمائش سے جذب و کشش میں اضافہ ہوتا ہے وہ اس انداز سے سامنے آئیں جیسے کوئی آنکھ مچولی کھیل رہا ہو۔ اس برقع کو پہن کر جب ایک عورت بازار میں نکلے گی تو ایسا معلوم ہوگا کہ اواخر انیسویں صدی کی کوئی میم صاحبہ چھتری لگائے ہوئے جا رہی ہیں۔ برقع کا وہ حصّہ تو جوں کا توں رہے گا جو گاؤن کے طور پر پہن لیا جاتا ہے۔ البتہ اس کا بالائی حصّہ جس میں ٹوپی بھی شامل ہے ایک ایسی انگریزی ٹوپی کی طرح ہوگا جس کے چاروں طرف مہین باہن نٹ کی جالی ہو۔ بس اسی کو نقاب سمجھ لیجیے گا۔ اس برقع پر آپ کا وہ اعتراض بھی نہ ہو سکے گا

کہ ایک برقع پوش عورت کے پھیپھڑوں تک تازہ ہوا کے پہنچنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قربان جائیے اس شخص کے دماغ پر جس نے ذرا سی ترمیم کر کے برقع پوشوں اور اسلام پر بیک وقت کتنا بڑا احسان کیا کہ ایک پردہ دار عورت کو وہ سب سہولتیں میسر آگئیں جو ایک بے پردہ عورت کو حاصل ہوتی ہیں، اور نفس پردہ پر وہ اعتراضات بھی نہیں رہے جو مغربی تعلیم یافتہ حضرات کی طرف سے وارد ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ عورتوں کا یہ جدید برقع پاکستان کی تمام عورتوں کا قومی بالا پوش بن جائے اور ڈاکٹر سید حسین صاحب کی مراد پوری ہو جائے۔

کہیے نمائش حسن کا یہ طریقہ بہتر ہے یا وہ طریقہ کہ ایک سوکھی دُبلی اور مدقوق عورت محض ساڑھی یا قمیص شلوار پہنے اور دوپٹہ گردن میں ڈالے اِدھر اُدھر گشت کرتی پھرے!

دیکھیے ایمان نہ نگلیے اور خواہ مخواہ ہم مردوں پر اتہام نہ لگائیے۔ آج کون ہے جو عورتوں کو گھر کی چہار دیواری میں بند کیے ہوئے ہے؟ میرے خیال میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت ہو (الا ماشاء اللہ) جو حدود شریعت کا خیال رکھتی ہو۔ اب تو چشم بد دُور ہماری قوم کی عورتوں کی اکثریت صحت ہی کا زیادہ خیال رکھتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے بعد آپ کو کیا شکایت ہے۔

معلوم نہیں کہ پردہ سسٹم ختم کر دینے اور مرد، عورتوں کے باہمی اختلاط اور میل جول سے عورت اور مردوں یا فقط مردوں کی عمریں کس طرح بڑھنے لگیں گی۔ آپ کے اس نظریے سے بھی ہمیں شدید اختلاف ہے۔ ہماری رائے میں تو درازیٔ عمر کا معاملہ ایک ملک کی آب و ہوا، عمدہ اور صحیح غذا اور اس کے باشندوں کے رہن سہن اور پاکیزہ اور ستھری زندگی پر موقوف ہے۔ بے پردگی، عریانی اور مردوں کے ساتھ آزادانہ اختلاط سے جو دوران خون میں چستی اور تیزی آتی ہے اس کی نوعیت بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسے شراب پینے سے ایک شخص کا دورانِ خون تیز ہو جائے۔ اب اگر شراب نوشی عمر کو نہیں بڑھا سکتی ــــ اور یقیناً نہیں بڑھا سکتی تو مرد اور عورتوں کی آزادانہ شہوت رانی عمریں کیسے بڑھا سکتی ہے!

جب ہمارا ملک تہذیب مغرب سے پوری طرح روشناس نہیں ہوا تھا تو اس آبادی میں ایسے لوگ بہ کثرت پائے جاتے تھے جو ساٹھ ستر سال سے اوپر تھے اور جن کے ہاتھ پیر اس عمر میں اسی طرح چلتے تھے جس طرح چالیس پینتالیس سال کی عمر میں۔ ان کے لیے عام نہ خاص کوئی اہتمام کیا جاتا تھا اور وہ آخر تک اچھی طرح گزارا کر چلتے ہاتھ پیروں چل دیتے تھے۔ آج بھی ہندستان اور پاکستان کے بعض علاقوں میں لوگ بڑی بڑی عمروں کو پہنچتے ہیں اور کافی مضبوط ہوتے ہیں۔ ان غریبوں کے لیے نہ کوئی خاص غذا کا اہتمام ہوتا ہے اور نہ ان کی صحت کی نگرانی اور خدمت گزاری کے لیے معالج کمربستہ رہتے ہیں کہ ذرا انھیں تھکن ہوئی اور ان کی مکی چپی ہونے لگی اور ذرا ان کی نبض کی رفتار میں فرق آیا اور انھیں چت لٹا کر چُپ رہنے کا مشورہ دے دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک شخص کی عمر بڑھانے کے کچھ اور دوسرے اہم اسباب ہیں جن کا پردہ سسٹم سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔

شراب و خمار

سوال:- میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ ہمدرد صحت کی قریبی اشاعت میں 'خمار' پر روشنی ڈالیں گے

عام طور پر شراب یا دوسری نشہ آور چیزوں کے استعمال کے بعد ایک شخص پر خماری کیفیات طاری ہو جاتی ہیں اور وہ گویا ایک قسم کی نشے کی مزید خواہش ہوتی ہے جو نشہ کرتے ہی جاتی رہتی ہے اور جہاں نشہ اترا پھر عود کر آتی ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ خمار اصل میں ہے کیا چیز اور آپ اس کی کیا توجیہہ کریں گے ؟

محمد عثمان عندلیب شاہ جہاں پور

جواب ۔ لفظ "خمار" بہت سی جسمانی کیفیات کا حامل ہے۔ مثلاً اگر آپ کسی کے متعلق یہ خبر دیں کہ اسے خمار چڑھا ہوا ہے تو اسے سن کر ایک شخص یہ سمجھے گا کہ اس شخص کو سخت قسم کی گرانی سر ہے اس کا جسم ٹوٹ رہا ہے اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے اور اس پر پست ہمتی طاری ہے وغیرہ وغیرہ۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ وہ لوگ جو کثرت سے گوشت کھاتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں، تمباکو، چا۔، اور قہوہ نوشی کے عادی ہوتے ہیں، ان کے خون میں تیزابیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ خون کا خاصہ یہ ہے کہ وہ تیزابیت کو زائل کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرتا ہے اور جہاں جہاں اسے ایسے اجزا ملتے ہیں جن کے خون میں شامل ہونے سے تیزابیت کم ہوتی ہے، وہ لیتا رہتا ہے۔ جب تک معاملہ اس درجے میں رہتا ہے شراب نوشی اور اسی قسم کی مقوی و محرک غذا استعمال کرنے والا شخص تن درست نظر آتا ہے لیکن اگر ان کے استعمال میں غیر معمولی زیادتی کی جائے۔ اتنی کہ خون تیزابیت سے لبریز ہو کر "چھلکنے" لگے تو اس صورت میں ہوتا یہ ہے کہ خون اپنی تیزابیت کو کم کرنے کے لیے ایسے ساختوں میں جہاں نہیں بھی ہونی چاہیے جا بٹھاتا ہے۔ اس طرح خون میں سے تو تیزابیت کم ہو جاتی ہے مگر جسم میں پھر بھی رہتی ہے جو دوسرے امراض مثلاً گٹھیا، وجع المفاصل، وجع القلب اور عرق النسا وغیرہ کا باعث ہوتی ہے۔ ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا کہ خمار کی کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب خون میں بے انتہا تیزابیت بڑھ جاتی ہے اس کو دور کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ نشے بازی چھوڑ دی جائے اور ایسی چیزیں کھائی جائیں جو بد قبت (کھاری) پیدا کرنے والی ہوں تاکہ تیزابیت کی زیادتی کا خاتمہ ہو جائے ۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہی چیزیں جن سے تیزابیت اس قدر بڑھ گئی تھی، مزید کھائی جائیں تاکہ خون میں تیزابیت اس نقطے پر پہنچ جائے کہ اس کے بعد کوئی گنجائش باقی نہ رہے تو پھر وہ جسم کی نسوں اور بافتوں میں جا کر جم جائے۔ شرابیوں اور دوسری قسم کے نشہ کرنے والوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ جب تک وہ مزید نشہ نہیں کرتے اس وقت تک تیزابیت خون میں رہتی ہے جس کے باعث ان کی حالت خمار آلود رہتی ہے۔ لیکن جب وہ مزید نشے کر لیتے ہیں تو تیزابیت جسم کے آخری گنجائشی نقطہ سے بڑھ جاتی ہے اور طبیعت اسے خون میں سے کم کرنے کے لیے ساختوں میں جگہ دے دیتی ہے اور اس طرح خون سے تیزابیت کے غیر معمولی بڑھاؤ کے کم ہوتے ہی وہ شخص خود کو چست و چالاک محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب اس شراب کے استحالہ کے نتیجے میں مزید تیزابیت خون میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی وہی خماری کیفیت پھر عود کر آتی ہے جسے وہ مزید شراب پی کر پھر ختم کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ یہی لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے جس کا انجام آج ان پڑھ اور جاہل سے جاہل بھی اچھی طرح جانتا ہے۔

معلوم نہیں خماری حالت کی یہ تشریح آپ نے ہم سے کس غرض کے لیے دریافت کی ہے۔

لیکن ہماری نیت اس کے تحریر کرتے وقت یہی تھی کہ لوگ اسے پڑھیں گے اور انھیں معلوم ہوگا کہ شراب اور دوسری نشہ کرنے والی چیزیں ہماری صحتوں کے لیے کس قدر مہلک ہیں۔

آہ مجھے ناشتے کے بعد اجابت ہوتی ہے

سوال :۔ میں ہمیشہ صبح ناشتے کے بعد اجابت کے لیے جاتا ہوں۔ یہ عادت میری بچپن ہی سے ہے۔ میری والدہ کو ہمیشہ میری اس عادت سے کچھ چڑ سی رہی ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ ناشتے کے بعد اجابت کے لیے جانا آنتوں کی کمزوری کی علامت ہے۔ اس سلسلے میں وہ مجھے ہمیشہ مشورہ دیتی ہیں کہ میں کسی طبیب حاذق کو دکھاؤں۔ حالانکہ مجھے آج تک کبھی قبض نہیں ہوا۔ ہمیشہ با فراغت اجابت ہو جاتی ہے کل آپ کا رسالہ ہمدرد صحت دیکھا۔ اس کے سوال و جواب کا کالم میری والدہ نے دیکھا تو مجھ سے کہا کہ میں اپنی شکایت کا حال آپ کو لکھوں اور آپ سے مشورہ طلب کروں۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ ہمدرد صحت کی کسی قریبی اشاعت میں اس خاص معاملے پر روشنی ڈالیں گے۔

عزیز الحق۔ لکھنؤ

جواب :۔ بعض لوگوں کی پریشانیاں بھی کچھ عجیب و غریب قسم کی ہوتی ہیں۔ بھلا بتائیے ایک شخص کو نہ ہضم و قبض کی شکایت ہے، نہ اسے اور کسی قسم کا عارضہ ہے، اس کی عام صحت بھی اچھی ہے، مگر ان کی والدہ صاحبہ کو اور کچھ نہیں تو یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ ان کے بچے کو جانے کیا ہو گیا کہ ہمیشہ ناشتے کے بعد اجابت ہوتی ہے پہلے کیوں نہیں ہوتی۔ کچھ حد بھی ہے اس وہم کی!

جناب والا آپ بھی سن لیجیے اور اپنی والدہ محترمہ کو بھی بتا دیجیے کہ ناشتے کے بعد اجابت کا ہونا کوئی مرضی حالت نہیں ہے بلکہ جدید تحقیقات کی رو سے تو وہ لوگ جو ناشتے کے بعد رفع حاجت، کی عادت ڈال لیتے ہیں شاید مزے میں رہتے ہیں۔ انھیں اور کچھ ہو تو ہو معدے اور آنتوں کی شکایت کبھی نہیں ستاتی۔

اس میں شک نہیں اطبائے قدیم کھانے کے بعد اجابت آنے کو آنتوں کی کمزوری پر محمول کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ آنتوں کی حرکت دودیہ اگر سست نہ ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔ گویا ایسے لوگوں کو اجابت اسی وقت ہوتی ہے جب معدے میں غذا پہنچنے کے بعد معدہ میں تحریک ہوتی ہے۔ معدے کی تحریک کا اثر آنتوں تک پہنچتا ہے اور اس وقت وہ بھی فضلے کو آگے کی جانب دھکیلتی ہے اور اجابت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس لیے ان کو یہ خیال ہوا کہ کھانے کے بعد اجابت کا آنا سستی امعاء کی طرف اشارہ کرتا ہے ان کی طرف سے اس خاص معاملے میں جو کچھ بھی توجیہہ پیش جاتی ہے مجھے ایک حد تک اس سے اتفاق ہے مگر اس سے یہ تو کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا کہ کھانا کھانے کے بعد اجابت کے لیے جانا آنتوں کو کمزور بناتا ہے۔ ان بزرگوں نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ظاہر ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ اگر کچھ لوگوں کو کھانا کھانے کے بعد ہی اجابت آئے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی آنتوں کی طبعی حرکت دودیہ سست ہے۔ اور غذا کی تحریک کے بغیر ان میں اس حد تک تحریک نہیں ہوتی کہ وہ فضلے کو خود بہ خود بھی دھکیلتی رہیں۔ بلا شبہ یہ ایک مرضی حالت ہوگی۔ مریض کو قبض ہوگا۔ بھوک نہیں لگے گی، عام صحت بھی اچھی نہ ہوگی۔ اس کا جگر اور

استحالۂ غذا بھی نقص سے خالی نہ ہوگا اور ایک غریب طبیب بھی دیکھ کر معلوم کرلے گا کہ یہ شخص صحت مند نہیں ہے مگر جس شخص میں ان علامتوں میں سے ایک علامت بھی نہ ہو اور سوائے اس جسمانی خطا کاری کے کہ وہ ناشتے کے بعد اجابت کے لیے جاتا ہو اس میں کوئی دوسری جسمانی خرابی بھی نہ ہو تو اسے تو آپ مریضوں کے زمرے میں نہیں لاسکتے اس لیے کہ معدے میں غذا پہنچنے کے بعد آنتوں کی حرکات میں طبعی طور پر تحریک ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس تحریک سے بھی طبیعت کا یہی منشا ہوتا ہے کہ فضلے کو آگے کی جانب دھکیلا جائے تاکہ آئندہ غذا کے فضلے کے لیے جگہ خالی ہو جائے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جس وقت معدے میں غذا پہنچنی شروع ہوتی ہے وہ اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ اس کی حرکات کا اثر چھوٹی آنت پر پڑتا ہے اور وہ یہ سمجھ کر کہ مزید غذا آرہی ہے اپنے سابقہ فضلے کے باقی ماندہ حصے کو آگے بڑی آنت کی جانب دھکیل کر بڑی آنت کے منہ میں ڈال دیتی ہے اور بڑی آنت اپنے باقی ماندہ فضلے کو دھکیل کر معائے مستقیم کے آخری حصے میں پہنچا دیتی ہے۔ جب آنت کا یہ آخری حصہ بھی بھرنے لگتا ہے تو یہ بھی حرکت میں آتا ہے تاکہ فضلے کو "جسم بدر" کردے۔ آنت کی اس آخری حرکت سے احساس اجابت ہوتا ہے اس سے ایک اور حقیقت کی طرف بھی ہماری رہنمائی ہوتی ہے وہ یہ کہ اس تحریک کے وقت چھوٹی آنت سے بڑی آنت میں فضلہ جانے کا جو "دروازہ" اور بڑی آنت سے آخری حصے میں فضلہ پہنچانے کا جو دروازہ ہے ان کے پٹ کھل جاتے ہیں اور جو کچھ غذا کا باقی ماندہ فضلہ ان کے قریب جا پہنچا ہے وہ وہاں پڑا رہنے کے بجائے اس غذائی تحریک کی بدولت ان کی دروازوں سے جلد گزر جاتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ فضلے کا باقی ماندہ حصہ خواہ کتنا ہی تن درست آدمی کا ہو۔ ان دروازوں سے آنتوں کی غیر معمولی تحریک کے بغیر نہیں گزر سکتا۔ اب اگر کوئی شخص ناشتہ کرنے کے بعد رفع حاجت کے لیے جاتا ہے تو اس سے یہ فائدہ پہنچے گا کہ وہ باقی ماندہ فضلے کی آنتوں کی جدید تحریک کی بدولت اسی وقت خارج ہونے کی جگہ پہنچ کر خارج ہو جائے گا۔ ورنہ دوسری صورت میں وہ باقی ماندہ فضلہ دوسری اجابت کے ساتھ خارج ہوتا ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ دیر تک آنتوں میں پڑا رہے گا جس سے کسی فائدے کی توکوئی توقع نہیں ہوسکتی البتہ نقصان کا یقین ضرور ہوسکتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ ناشتے کے بعد اجابت کے لیے جانا بغیر ناشتہ کیے جانے سے بہتر ہے کہ اس صورت میں آنتوں سے زیادہ سے زیادہ فضلہ خارج ہو جاتا ہے اور قبض کی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ امید ہے کہ ان حقائق کی روشنی میں جب آپ اس معاملے پر غور کریں گے تو آپ کا اور آپ کی والدہ صاحبہ دونوں کا وہم دُور ہو جائے گا۔

قبض

سوال: میں دائمی نوعیت کے سخت ترین قبض کے ہاتھوں اس قدر پریشان ہوں کہ بیان نہیں کرسکتا دُبلا اس قدر ہوگیا ہوں کہ ہڈی سے چمڑا الگ گیا۔ ابھی اکیس ہی سال کا ہوں مگر سر کے بال سفید ہونے شروع ہوگئے ہیں۔ معلوم نہیں آئندہ یہ دائمی قبض کیا کیا گل کھلائے گا۔

یوں تو مجھے گیارہ سال کی عمر سے کم وبیش قبض ہے، لیکن سولہ سال کی عمر سے تو اس نے مستقل شکل

اختیار کرلی ہے۔ کچھ طبیبوں نے بتایا کہ آنتوں میں خشکی ہوگئی ہے۔ اس کا علاج کرایا۔ جب تک علاج ہوتا رہا افاقہ رہا جب علاج بند ہوا تو پھر وہی حال ہوگیا۔ علاج سے جب کچھ فائدہ ہی نہیں ہوا تو میں نے پھر حسب ذیل پروگرام بناکر عمل کرنا شروع کردیا۔

روزانہ تقریباً سیر بھر پالک کا ساگ اُبلوا تا اور ٹماٹر اور دوسری سبزیاں بھوسی ملے ہوئے آٹے کے ساتھ استعمال کرتا۔ جب ابلا ہوا ساگ اتنی زیادہ مقدار میں ویسے نہ کھا سکتا تو اس کو آٹے میں گندھوا کر اس کی روٹی پکوا کر کھاتا۔ صبح پیٹ کی ورزش کرتا یا باغ میں دوڑتا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد ایک دو میل پیدل چلتا۔ دودھ بھی کافی مقدار میں پیتا۔

مندرجۂ بالا پروگرام سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ ہر روز اجابت ہونے لگی۔ مگر قبض کا احساس پھر بھی رہتا اور اس کے بعد بھی ہلکاپن کبھی محسوس نہ ہوا۔ اگر آپ نے میرے لیے کوئی مؤثر علاج تجویز کردیا تو میں تمام عمر آپ کا ممنون رہوں گا اور آپ کے بتائے ہوئے پروگرام پر نہایت پابندی سے عمل کروں گا خواہ وہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔

(ارشاد، بنارس)

جواب:۔ آپ کا تفصیل حال پڑھا۔ میرے نزدیک آپ کا معاملہ اس درجے میں ہرگز نہیں آیا ہے کہ آپ مایوس ہوجائیں۔ جس غذا کے استعمال سے آپ کو کم سے کم ایک وقت پاخانہ ہوجاتا ہے وہ صحیح غذا ہے۔ اس کا استعمال برابر جاری رکھیے۔ پالک اور خرفے کا ساگ تقریباً روزانہ یا ایک دن بیچ کرکے ضرور استعمال کیجیے۔ مونگ کی دال اگر کھائیں تو اس میں بھی پالک کا ساگ ڈال کر پکوائیں۔ پکی ہوئی ترکاریوں میں خالص گھی اچھی مقدار میں استعمال کیجیے۔ پھلوں میں کشمش، منقّے اور انجیر کا استعمال زیادہ رکھیے اور دودھ بھی برابر پیتے رہیے۔ بھوسی کی روٹی کھائیے اور اسے گیہوں کا بے چھنا آٹا لے کر اس میں تھوڑی سی بھوسی ملاکر اور تھوڑا سا گھی ڈلوا کر پکوا لیجیے۔ اس سے وہ نرم رہے گی اور اچھی طرح چبا کر کھائی جائے گی۔

گاجروں کے موسم میں گاجریں، مولیاں، ٹماٹر وغیرہ خوب کچے کھائیے۔ پیدل ہواخوری کے ساتھ ہمدرد صحت میں جو پیٹ کی ورزشیں دے رکھی ہیں انھیں بھی استقلال کے ساتھ استعمال کیجیے ان کا اثر آنتوں پر لازمی طور پر پڑتا ہے اور ان کا فعل درست ہوجاتا ہے۔

چوں کہ آپ کو بچپن ہی سے شدید قسم کا قبض ہے اس لیے اسے رفع کرنے کے لیے آپ کو شدید کوشش کرنی پڑے گی۔ اس کے لیے انیما کے ذریعے آنتوں کا صاف کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کا بہترین طریقہ آپ کے لیے یہ ہے کہ آپ پہلے نیم گرم پانی سے حقنے کا برتن بھر لیجیے اور اسے جس جگہ آپ لیٹیں اس سے ۲ فٹ اونچا لٹکا دیجیے پھر اس کی منال پر تھوڑی سی ویسلین لگا لیجیے اور مقعد میں داخل کردیجیے۔ پھر ٹونٹی کھول کر پانی آہستہ آہستہ چھوڑیئے۔ یہ خیال رہے کہ انیما آپ چت لیٹ کر لیں گے۔ جب سارا پانی آنت میں چلا جائے تو منال کو مقعد سے نکال لیا جائے اور کوشش کی جائے کہ دس بارہ منٹ تک پانی کو اندر روکے رکھیں۔ اس دوران میں پہلے آپ بائیں کروٹ لیٹیں۔ پھر پٹ ہوجائیں۔ پھر دائیں کروٹ لیٹیں اور پھر بائیں طرف ہوجائیے اور آخر دونوں گھٹنوں اور ہاتھوں پر اس طرح قائم ہوجائیے جس طرح چوپائے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد قریب ہی کموڈ پر اجابت کے لیے بیٹھ جائیے۔ اگر اس وقت اجابت نہ ہوگی تو تھوڑی دیر بعد ہو جائے گی انیما کا

یہ طریقہ بے ضرر ہے اور اس میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ صَرف ہوں گے۔ ایک ہفتے تک روزانہ رات کے وقت اپنا لیجیے۔ پھر ایک ہفتے کے بعد ایک دن بیچ کر کے اور اس کے بعد خود بہ خود اجابت ہونے لگے تو اسے چھوڑ دیا جائے۔ یہ نہایت موثر علاج ہے اسے ضرور کیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک مہینے کے اندر اندر آپ کی یہ شکایت بالکلیہ رفع ہو جائے گی اور آپ کو بغیر انیمہ کے وہ وقت اجابت ہونے لگے گی۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک عادت آپ اور شروع ہی سے ڈالیے۔ وہ یہ کہ صبح اٹھتے ہی بیت الخلا جاکر بیٹھیے، خواہ اجابت آئے یا نہ آئے اور کچھ دیر اس طرف توجہ دے کر نکل آئیے۔ اس طرح شام کو وقت اجابت کے لیے پھر بیت الخلا میں بیٹھیے۔ ہلکا سا زور بھی لگائیے مگر زیادہ نہیں۔ اس طریق سے آنتوں کی ورزش ہوگی اور باقاعدہ اجابت بافراغت ہونے لگے گی۔ ہوسکتا ہے کہ شروع میں کئی روز تک آپ کو ناکامی ہو، مگر ایک آدھ ہفتے کے بعد یقین ہے کہ روزانہ دونوں وقت اجابت ہونے لگے گی۔ اس کے بعد سے ان اوقات کو ہمیشہ کے لیے مقرر کر لیجیے اور روزانہ اجابت کے لیے بیت الخلا جائیے۔

برتھ کنٹرول کیسا ہے؟

سوال :- ایڈیٹر صاحب۔ ہمدرد صحت کی مئی سنہ ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں گھرانے کے متعلق منصوبہ بندی کے عنوان سے ضبط ولادت کی تائید میں ایک مضمون نکلا ہے جس کے آخر میں آپ کا "استدراک" بھی شامل ہے۔ میرے خیال سے تائید اور مخالفت کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ مضمون نگار صاحب اگر اس ذہنیت کا شکار ہیں جو صرف مغرب کے معیار ذوق کو مستند سمجھتی ہے تو آپ نے بھی گویا اپنی جگہ پر یہ طے کر لیا ہے کہ سمندر پار سے آنے والی ہر چیز کا بائی کاٹ کریں گے۔ جناب والا دنیا میں کوئی چیز صرف اچھی یا صرف بُری نہیں ہوتی۔ مگر ایسا ہو تو آدمی کے دماغ میں کبھی اس کا تصور ہی نہ آئے۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ ہماری توجہ کسی ایک طرف اتنا زیادہ جھک جاتی ہے کہ اس کا دوسرا پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہی افراط و تفریط ہے جو کسی چیز کو اچھا یا بُرا بنا دیتی ہے۔ ورنہ بہ ذاتِ خود کوئی چیز اچھی یا بُری نہیں ہوتی۔

ضبط ولادت، اس میں شبہ نہیں کہ ایک غیر فطری اصول ہے۔ مگر طبیب ہونے کی حیثیت سے غالباً یہ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ اکثر اوقات غلطیوں کی اصلاح کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ کسی تن درست شخص کے پیٹ میں درد اٹھے تو آپ اسے کوئی دوا دے کر بعض معمولی قسم کے غذائی پرہیز بتا دیں گے مگر جس کا ہاضمہ مستقل طور پر اس کی نادانی کی نذر ہو چکا ہو، اس کے لیے آپ کی تجویز کا خاص جزو ایک لمبا اور مکمل فاقہ ہوگا، اور اس کے بعد کھانے کا جو پروگرام آپ اسے دیں گے اس میں بھی سنترے کے رس جیسی ہلکی غذائیں ہوں گی جو پہلے آپ ہضم ہو جاتی ہیں اور معدے پر کوئی بار نہیں پڑتا۔ یہ "فاقہ" کا اصول جو اکثر امراض میں آپ کے یہاں ایک مستند طریق علاج ہے فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ کیوں کہ قدرتی طور پر جو خواہشیں ہمارے اندر رکھی گئی ہیں ان کو دبا کر رکھنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ مگر زیادتی کے ہاتھوں جب یہی چیز تباہی کا باعث بنتی ہے تو اس کی روک تھام اور اس کی وجہ سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کے لیے ہم قدرت کے ان سرچشموں کو بند کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس طرح اسے کام سے چھٹی دے کر اس بات کا موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے

کو سنبھالے اور نئے سرے سے قوتوں کو نشوونما دے کر اپنی کھوئی ہوئی صحت کو دوبارہ حاصل کرے۔

ضبطِ ولادت یا برتھ کنٹرول کو میں بھی اچھا نہیں سمجھتا۔ مگر جہاں تک اس صورتِ حال کا تعلق ہے اس کی ضرورت ایک حد تک تسلیم کرنا ہوتی ہے۔

دنیا میں سب سے زیادہ بالکیف چیز میاں بیوی کا خوش و خرم جوڑا ہے اور اس جوڑے کے ذریعے سے جو سب سے زیادہ قیمتی چیز دنیا کو ملتی ہے وہ اس کی اولاد ہے۔ مرد اور عورت ایک ساتھ ہو کر گویا اپنے لیے دنیا کی جنت تعمیر کرتے ہیں اور پھر اس کے نتیجے میں دنیا کی سب سے بڑی مراد پوری ہوتی ہے۔ عورت مرد کی بجائے کا امکان ختم ہو جائے تو زندگی کی تمام رعنائیاں چھن جائیں اور دنیا اپنے وجود کی اصل ضرورت سے محروم ہو جائے مگر کسی چیز کی واقعی حیثیت اسی وقت قائم رہتی ہے جب تک وہ صحیح اور سچے اصولوں کی پابند رہے۔ اپنے حد سے گزرنے کے بعد سب سے اچھی چیز بھی ہمارے لیے سب سے بری بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں جنسی تعلقات کی روک تھام کرنے کا قائل ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اپنی بعض غلطیوں کی وجہ سے ہم نے قدرت کے اس جائز ترین حق کو اپنے لیے اتنا بگاڑ لیا ہے کہ اب وہ ہمارے لیے صرف ایک بوجھ رہ گیا ہے جس سے اگر ہم کچھ دنوں کے لیے دست بردار ہو جائیں تو اچھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی ہر قوم کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے بقائے نسل کی ضرورت ہوتی ہے مگر کسی چیز کو صرف اس کے وجود کی خاطر زندہ رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔ کسی مقصد، کسی بلند نصب العین کی تعمیر کی اہلیت ہی اصل میں وہ چیز ہے جو کسی کے وجود کے لیے وجہ جواز ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کو صفحۂ ہستی پر باقی رہنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت بچے پیدا کرنے سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ صحیح قسم کے والدین تیار کیے جائیں۔ ہمارے ماں باپ نے اپنی مشینری کو اتنا بگاڑ لیا ہے کہ اس سے نکلا ہوا مال ہماری ضرورت تو کیا پوری کرے گا اس کو بازار میں کھپانا ہی ایک مستقل عذاب ہو رہا ہے۔

اکثر لوگوں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا ہے کہ آخر یہ قدرت کی کون سی منشا پوری کر رہے ہیں۔ آپ جانیے شہری آبادی کے بیشتر انسان وہ ہیں جو زندگی گزارنے کے علاوہ اپنا اور کوئی خاص مقصد نہیں رکھتے۔ یہ لوگ اپنے آپ نہیں ظاہر ہو گئے نہ قدرت نے پتلے بنا کر زبردستی ان کو دنیا میں اتار دیا ہے۔ بلکہ قدرت کے بنائے ہوئے نظام کے ماتحت قصداً پیدا کیے گئے ہیں۔ ان کی پیدائش کے ذمہ دار صرف ان کے ماں باپ ہیں نہ کہ قدرت۔ یہ محض اپنے والدین کی غلطی کا نتیجہ ہیں اور پیدا ہونے کے جرم میں خواہ مخواہ زندگی کے دن تباہ کر رہے ہیں اور ان کے پیدا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

برتھ کنٹرول کی موافقت کے معنی کبھی نہیں ہیں کہ سرے سے نسلِ انسانی کا خاتمہ کر دیا جائے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ غیر ضروری طور پر بڑھتی ہوئی آبادی کے سیلاب کو روک کر موجودہ آبادی کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ مطمئن ہو کر اپنے لیے صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکیں اور پھر اپنے کو درست کر کے عمدہ اور لائق نسل پیدا کرنے کے قابل ہوں۔ یہ محض ایک طرح کی انتہا پسندی نہیں بلکہ "فاقہ" کے اصول پر علاج کر کے ان کو فوراً کسی کام کا زیادہ سے زیادہ اہل بنانا ہے جس سے وہ اس وقت رو کے جا رہے ہیں۔

میرے نزدیک کثرتِ اولاد نے ہم سے جو سب سے بڑی چیز چھینی ہے وہ صحت ہے جو یقیناً دنیا کی سب سے بڑی

اور قیمتی چیز ہے۔ مرد کی غلط کاری نے اس کی قوتِ حیات ضائع کی اور عورت بار بار ماں بننے اور بچوں کی پرورش اور برداشت کا بار اٹھانے کی وجہ سے نڈھال ہو گئی اور اس طرح دونوں بے حال ہو کر رہ گئے۔ اب نہ زیادہ ہمت اور قوت کے ساتھ وہ کوئی کام کر سکتے نہ ان کے کھانے کے لیے زیادہ مہیا ہوا۔ وہ صرف اتنا کماتے ہیں کہ مشکل سے اپنے جسم کی پرورش کر سکیں۔ مگر اتنے ہی میں ان کو پورا ایک گھر کھلانا ہوتا ہے۔ اس لیے مجبوراً سستی اور معمولی قسم کی خوراک پر قناعت کرتے ہیں۔ وہ بھی اتنی نہیں ہوتی کہ ان کو اور ان کے بچوں کے غولِ بیابانی کو کافی ہو۔ ایک طرف تو یہ حال، دوسری طرف جتنا ان لوگوں کو تقسیم ہو کر ملتا ہے اس میں بھی یہ اپنے حصے کی بڑی مقدار اپنے بچوں کو کھلا دیتے ہیں۔ یہ بے وقوفی، جسے وہ غلطی سے محبت سمجھتے ہیں ان کو دوگونہ عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ بچوں اور بڑوں میں دو مختلف طریقوں سے مگر ایک ہی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ماں باپ غذا کی کمی اور بچے اس کی زیادتی کی وجہ سے بیمار اور کمزور ہو جاتے ہیں۔

اس کا علاج صرف یہ ہے کہ سلسلۂ تناسل کو روک کر موجودہ اسباب کے لیے سرے سے تنظیم کی جائے تاکہ اس سے جو چیز نکلے وہ عمدہ صحیح اور کارآمد ہو۔ فرمائیے اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟ وحیدالدین

جواب:۔ آپ کے خط کو کئی مرتبہ غور سے پڑھا اور پھر ڈاکٹر مفتی صاحب[1] کے مضمون "گھرانے کو متعلق منصوبہ بندی" اور اس پر جو استدراک تھا اسے بھی بار بار دیکھا، مگر پھر بھی یہ سمجھ میں نہ آیا کہ تائید و مخالفت کا یہ طریقہ کس وجہ سے صحیح نہیں ہے۔ ہم نے تو یہی کیا ہے کہ جو کچھ صاحب مضمون بتانا چاہتے تھے اسے من وعن شائع کر دیا۔ اور ناظرین ہمدرد صحت کو اس موضوع پر ادارے کے خیالات سے بھی باخبر کر دیا تھا تاکہ اس معاملے میں وہ جو بھی قدم اٹھائیں سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔

ہم نے یہ تو کہیں بھی نہیں کہا کہ مغرب سے آنے والی ہر چیز قابلِ نفرت ہے اور اسے ہرگز ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ ضبطِ ولادت کے سلسلے میں فقط یہی بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ مسئلہ انسان کی پوری زندگی سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے اس مسئلے پر جب بھی غور کیا جائے پوری انسانی زندگی کے مسائل کو سامنے رکھ کر کیا جائے کہ انسانیت ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اسے علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر مفتی مرحوم نے اس مسئلے پر جس انداز سے بحث کی ہے اسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف کی توجہ اس خاص مسئلے پر اس قدر زیادہ منعطف ہو گئی ہے کہ اس کے دوسرے اتنے ہی اہم پہلو اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کے اسی یک طرفہ جھکاؤ کو دیکھ کر ہمیں استدراک لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی ڈاکٹر یا طبیب خالص طبی نقطۂ نظر سے یہ بتائے کہ ان عورتوں کو جن کی زندگیاں حاملہ ہونے سے خطرے میں پڑ جاتی ہیں حمل سے بچنے کے لیے یہ بے ضرر مانع حمل تدبیریں اختیار کرنی چاہییں، تو کوئی ناسمجھ ہی ہوگا جو اس کی مخالفت کرے گا۔ ہمیں صحیح مواقع پر مانع حمل تدبیریں بتانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ جو کچھ اعتراض ہے وہ ضبطِ ولادت کی باقاعدہ تحریک چلانے پر ہے۔ ہم اسے صحیح نہیں سمجھتے کہ خرابی

---

[1] فسادات دہلی میں جن لاتعداد جانوں کا نقصان ہوا ان میں ہمارے کرم فرما ڈاکٹر ایف ایچ مفتی چیف میڈیکل آفیسر دہلی بھی تھے۔ یہ ڈپٹی کمشنر صوبہ دہلی کے ساتھ علاقہ پہاڑ گنج میں صفائی کا ہفتہ کے سلسلے میں گئے تھے، کسی سفاک نے اس خادم انسانیت کے چھرا گھونپ دیا اور انھوں نے ہسپتال میں جان دے دی (انا للہ وانا الیہ راجعون)

کے درخت کی جڑ کو تو اسی طرح چھوڑ دیا جائے اور اس کی شاخوں کی کاٹ چھانٹ کر کے اس کی خرابی اور بگاڑ کو درست کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمارا دعوئے یہ ہو کہ اگر ایسا صحیح قسم کا نظامِ حکومت قائم ہو جائے یا کیا جائے جس میں ہر شخص کی انفرادیت کے ابھرنے اور اس کی صلاحیتوں کو بردے کار آنے کے پورے پورے مواقع آئیں اور ہر شخص کو دنیا میں اوسط درجے کی زندگی بسر کرنے کے مواقع مل جائیں تو ضبطِ ولادت اور منع حمل کی تدبیر اختیار کرنے کی سرے سے ضرورت نہ پیدا ہو۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر انسان کو ان چیزوں کے کرنے کا لائسنس کیوں کر دے سکتے ہیں جن کے عواقب و نتائج کا صحیح صحیح علم ہمیں نہ ہو۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ اگر اس وقت ہند و پاکستان میں ضبطِ ولادت کی تحریک کو تقویت دی جائے اور نہایت زور شور سے چلایا جائے تو دس سال بعد جب کہ اس کے نتیجے میں پاکستان اور ہندستان کی آبادی بڑی حد تک کم ہو جائے گی، اس ملک کے بچاؤ کا مسئلہ پیدا ہونے پر کیا کیا جائیگا؟ کیا اس ملک کا بھی وہی حشر ہوگا جو جرمنی کے مقابلے میں فرانس کا ہوا تھا۔ بہرحال ضبط ولادت کے مسئلے پر غور کرتے وقت ہمیں ان پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

آخر میں آپ نے کثرتِ اولاد ہونے کی صورت میں ایک گھرانے کا جو بھیانک منظر کھینچا ہے اس کی واقعیت سے تو مجھے بھی انکار نہیں اگرچہ اس میں کافی مبالغے سے کام لیا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ ضبط ولادت بھی اس کا کوئی حل پیش نہیں کرتا۔ یہ مسائل حکومت کی مشینری اور طرزِ حکومت سے متعلق ہیں کہ جب تک اس کی اصلاح نہ ہوگی، کچھ بھی نہ ہوگا۔

ہم اس قسم کی تحریکوں کو خالص طبی تحریکیں نہیں سمجھتے بلکہ ان کا تعلق طب سے زیادہ مدنیت و معاشرت سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ڈاکٹروں یا طبیبوں کو طب کے نام پر ضبط ولادت جیسے ہمہ گیر مسئلہ پر قدم اٹھانے کا مجاز نہیں سمجھتے اور ان کی اس خواہش کو روکتے ہیں کہ مبادا اس ضمن میں ہم کوئی غلط قدم اٹھا کر پوری قوم کو نقصان پہنچا جائیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اس مسئلہ پر صحیح نقطہ نظر سے غور فرمائیں گے تو اپنے خیالات میں غیر معمولی تبدیلی پائیں گے +

بقیہ ص ۷۷

بہت مددملتی ہے۔

مختصر یہ کہ یوگا کی یہ ایک ہی ورزش اعادۂ شباب کے لیے کافی ہے اور جتنی بھی اس کی خصوصیات مندرجہ بالا سطروں میں بیان کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک تجربہ کی کسوٹی پر پوری اتری ہوئی ہے۔

تنبیہہ: یہ ورزش ان لوگوں کو نہیں کرنی چاہیے جن کے قلب کمزور ہیں یا جو قلب کے پرانے مریض ہیں۔

انتباہ

لفظ ہمدرد ٹریڈ مارک کی کیٹیگریز میں جس طرح ہندستان میں رجسٹرڈ ہے اُسی طرح پاکِستان میں بھی یہ لفظ جُملہ کیٹیگریز میں رجسٹرڈ متصوّر ہے۔ وہ حضرات جو اِس مُغالطے میں ہیں کہ تقسیمِ مُلک کے بعد ہندستانی تجارتی اِداروں کے ٹریڈ مارک کے حقوق پاکِستان میں باقی نہیں ہیں، اور جو لفظ ہمدرد سے ناجائز اِنتفاع کے لیے کوشاں ہیں، ہم انھیں متنبہ کرتے ہیں کہ وہ سخت غلطی پر ہیں۔

ہمدرد دواخانہ کی جو دوائیں رجسٹرڈ اور پیٹنیٹ ہیں وہ جس طرح ہند میں رجسٹرڈ ہیں اُسی طرح پاکستان میں بھی رجسٹرڈ ہیں۔ وہ حضرات جو اِن تمام دَواؤں میں سے کچھ نام اپنی دواؤں کے لیے استِعمال کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں اُن کو اپنی غلط فہمی دُور کر دینی چاہیے۔

قانون سے ناواقفیت اور ناجائز انتفاع کے جذبے سے جن حضرات نے غلط اقدام کیا ہے اُن کے خِلاف عدالتی چارہ جوئی کی جا رہی ہے۔

شائع کردہ: ہمدرد دواخانہ

ہمدرد صحت

نگران :- حکیم حاجی عبد الحمید دہلوی
ایڈیٹر :- حکیم حافظ محمد سعید دہلوی

صدر دفتر انتظام: ہمدرد روڈ، کراچی
دفتر ادارہ: ۵۸/۱، اپر سندھ کولونی، بندر روڈ ایکس ٹینشن، کراچی
صدر دفتر ہند: ہمدرد منزل، لال کنواں، دہلی
دفتر بمبئی: ۱۹۰ دلال سٹریٹ، فورٹ، بمبئی
دفتر ایڈورٹائزنگ: ۱۹۰ دلال اسٹریٹ، فورٹ، بمبئی
دفتر سعودی عرب: ثولیقہ بازار، مکہ المکرمہ

ہمدرد صحت ماہانہ شائع ہوتا ہے "ہمدرد دواخانہ دہلی"
اس کے شائع کرنے والے ہیں

قیمت سالانہ (ہندستان و پاکستان میں) پانچ رُپے (۵ر)
قیمت فی پرچہ آٹھ آنے (۸ر) محصول ڈاک دو پیسے (۲؍)

طابع و ناشر: حکیم محمد سعید دہلوی
مطبع: مشہور آفسٹ لیتھو پریس بیکولڈ روڈ۔ کراچی (پاکستان)



جلد: ۱۷ | فہرست مضامین ! | نمبر: ۲

جون سنہ ۱۹۴۸ء

ہمدردِ صحت

سالانہ قیمت: ہمدردِ صحت کے دورِ جدید کی پہلی اشاعت (مئی ۴۸ء) دیکھ کر اب تک کسی نے برائی کے کلمات نہیں لکھے۔ اور بچانوے فیصد نے سالانہ قیمت پانچ روپے کر دینے پر اتفاق رائے کیا ہے اور اکثر نے اسے پسند کیا ہے کہ طلباء کے لیے ہم نے چار روپے سالانہ قیمت رکھی ہے۔ ہم اپنے تمام قارئین کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے ہمدردِ صحت کو پسند فرمایا اور اسے خود مطالعہ میں رکھنے اور دوسروں تک پہنچانے کا سلسلہ بدستور قائم رکھا ہے۔

وی۔پی: مئی سنہ ۴۸ء کی اشاعت کے بعد ہمارے پاس کم و بیش ساڑھے چار ہزار خطوط ایسے ہیں جن میں معزز خریداروں نے وی۔پی طلب فرمایا ہے۔ ہم نے ان سب حضرات کی خدمت میں ایک سرکلر مع منی آرڈر فارم بھیجا ہے اور درخواست کی ہے کہ سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں۔ یہاں بھی ہم یہ کہیں گے کہ ازراہِ کرم اپنا سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر ہی بھجا کیجیے۔ وی۔پی بھیجنے میں ادارہ کو تامل ہے۔

طبّی مشورہ

وہ حضرات جو بصورت سوال و جواب طبّی مشورہ طلب فرماتے ہیں اُن کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ سوال کی عبارت ہمیشہ مختصر اور جامع تحریر فرمایا کریں۔ مدیر ہمدردِ صحت جوابات کے لیے جتنا وقت نکال سکتے ہیں اُس میں ان سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی یہی ایک صورت ہے۔ ازراہِ کرم جواب کے لیے لفافہ مع ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیے۔ اور اس قسم کے خط پر لفظ "سوال و جواب" ضرور لکھ دیا کیجیے۔

طلبا: بعض طلباء نے اپنے سالانہ قیمت کے ساتھ ہیڈ ماسٹر صاحب یا پرنسپل صاحب کا تصدیق نامہ نہیں بھیجا ہے۔ طلباء اس کا خیال رکھیں کہ ایسا کرنے میں ادارہ کو سہولت رہے گی۔

خریداری نمبر: خریداران ہمدردِ صحت کی خدمت میں گزارش ہے کہ اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں۔ ورنہ ممکن ہے کہ ان کے ارشاد کی تعمیل نہ ہو سکے یا اس میں غیر معمولی تاخیر ہو جائے۔

پرانے فائل: دفتر میں اس وقت بعض پرانے فائل موجود ہیں۔ جو حضرات ضرورت مند ہوں، اپنی ضرورت سے آگاہ فرمائیں۔ ممکن ہے اُن کی ضرورت پوری کی جا سکے۔

منتظم ہمدردِ صحت (دفتر انتظام) ہمدرد روڈ (رام باغ روڈ) کراچی ۱

اشارات

پچھلے مہینے "اشارات" میں ہم نے ایک اعلا طبی درس گاہ کے بارے میں کچھ اشارات کیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ آئندہ اشاعت میں ہم ایک اعلا طبی درس گاہ کا ایک قابلِ عمل نمونہ وخاکہ پیش کریں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں شہنشاہِ طب فاضل گرامی جناب مولانا حکیم محمد کبیر الدین صاحب کی رہنمائی حاصل ہوگئی اور ہم اس اشاعت میں اُن کا مجوزہ اور مُرتبہ لائحہ عمل پیش کر رہے ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ حکیم صاحب حیدر آباد دکن کی سکونت مستقلاً ترک کرکے کراچی تشریف لے آئیں تاکہ ان کی رہنمائی میں ایک طبیہ کالج کی بنیاد پڑ جائے اور اس طرح ایک اہم کام شروع ہو جائے۔

اس اسکیم کی نقول واجب الاحترام جناب وزیر تعلیم صوبۂ سندھ اور جناب وائس چانسلر صاحب سندھ یونیورسٹی کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہیں اور ہماری اطلاعات کے بموجب حکومت سندھ اس پر تھوڑا بہت غور بھی کر رہی ہے ہمیں بہرحال حکومت کی جانب سے بہتر اقدامات کی امید رکھنی چاہیے اور توقع رکھنی چاہیے کہ حکومت اس سلسلے میں تاخیر کو جگہ نہ دیگی اور اس طبی ادارہ کو وقت کی اہم ضرورت سمجھ کر عمل کی طرف جلد قدم اُٹھائے گی۔

آئندہ صفحات میں جامعہ طبیہ پاکستان کا خاکہ ملاحظہ فرمائیے۔ (ادارہ)

جامعۂ طبیہ پاکستان

(مجوزہ حکیم کبیر الدین)

پس منظر

اس طبی ادارہ کا خاکہ بناتے وقت چند تصورات کارفرما رہے ہیں، جن کا اظہار مناسب ہے:

(۱) طبِ یونانی یا بالفاظ دیگر، طبِ عربی ہمارا ایک بے بہا، اور انسانی وجود کا ایک سود مند سرمایہ ہے جس کے وقار کو پچھلے دنوں تجارت پیشہ پردیسی حکومت کے معاندانہ سلوک نے اپنے مقاصد تجارت وحکومت کے تحت بہت صدمہ پہنچایا، اور حکمت کے اس انمول لعل کو رسوائی کی مذلت میں ڈال کر عیسائی دُنیا کے قرونِ وسطےٰ (مُظلمہ) کی تاریک عصبیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

(۲) اس وقت جب کہ ایک شاندار اسلامی حکومت (پاکستان) قائم ہو چکی ہے جس سے پوری مسلم آبادی کی بجا طور پر یہ توقع وابستہ ہو چکی ہے کہ قومی تعمیر وقت اب آگیا ہے، اب اپنی ہر چیز کو

اُبھرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع نصیب ہوگا۔

(۳) ملک کے پورے طول و عرض میں، اس وقت جہاں جہاں اس یُونانی طب کے اِدارے قائم ہیں، بدنصیبی اور قومی بدنصیبی ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی، بہ لحاظ معیارِ تعلیم اور بہ لحاظ ساز و سامان ایک کامیاب **معیاری اِدارہ** نہیں کہا جا سکتا۔

(۴) اس لیے وقت کا صحیح تقاضہ یہ ہے کہ کراچی میں جو **طبی اِدارہ** قائم کیا جائے، وہ پاکستان کے شاندار تصورات کے مطابق **ایک بلند پایہ** اور **مثالی ادارہ** بنے، جو ملک کے دوسرے اداروں کے لیے **نمونہ** بن کر انھیں ہدایت و رہبری کی **مشعل** دکھلائے۔

(۵) یہی وجہ ہے کہ اس لائحہ میں **معیارِ داخلہ** دوسرے عام طبی اداروں کی طرح پست اور **مدتِ تعلیم** ناکافی نہیں رکھی گئی ہے۔ معیارِ داخلہ کی پستی، اور مدت تعلیم کی کمی، یہ دونوں چیزیں **احساسِ کمتری** کی ایسی بنیادیں ہیں، کہ ان دونوں کی موجودگی میں نہ اُن اطبّاءؔ سے پستی کا احساس کم ہوگا جو اس ادارہ سے تعلیم پا کر نکلیں گے اور نہ عوام کی پست ذہنیتیں اُن اطبّاءؔ کے لیے بلند ہوں گی، جو انگریزی حکومت کے صد سالہ مساعی، تدابیر اور حکمت عملی سے اِن کے دماغوں میں راسخ ہو چکی ہیں۔

(۶) اس امر کا اظہار بھی اس وقت مناسب ہے کہ شاید اوائل میں، داخلہ کے لیے اعلا قابلیت کے طلبا ہمیں کم ملیں، کیونکہ ایسے طلبا کی پوری تعداد کو **طبِّ مغربی** کی یہ جاذبیت اپنی طرف کھینچ لیتی ہے کہ ان کا مستقبل شاندار ہے، طبِّ انگریزی کا وقار بلند ہے، اور ملازمت کے دروازے بڑی تنخواہوں اور بڑے اقتدار کے ساتھ ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں جو ان دنوں تعلیم کی انتہائی غرض و غایت بن چکی ہے۔

(۷) اس لیے بدیہی ہے کہ جب تک اس حقیقت کی طرف ہمدردی کے ساتھ توجہ نہ کی جائے گی، اور ہمارے طلبا کے تاریک مستقبل کو، طبِ انگریزی کے مستندین کی طرح روشن نہ کیا جائے گا، اس وقت تک نہ ہمارا فن **زندہ** ہو سکے گا اور نہ اس میں **حیاتِ نو** کی دل کش بہار آ سکے گی، جس کے بغیر عوام کے قلوب کا اس طرف منجذب ہونا ایک خواب، ایک خیال اور ایک تمنائے محال ہے بالفاظ دیگر ــــ اس وقت ہمارا فنِ عزیز جن نامساعد حالات میں گھرا ہوا ہے، اور جس کی وجہ سے وہ ایک مرجھائے ہوئے سُوکھے پودے کی شکل میں نظر آ رہا ہے اگر اس کی اس وقت حدودِ پاکستان میں خاطر خواہ سیرابی نہ کی گئی، اور اسے اسی حالتِ یاس و ناامیدی اور یتیمی کی کس مپرسی میں **خدا نہ کردہ** چھوڑ دیا گیا تو یہ محض اپنی قوم کی **غلامانہ ذہنیت** کا ایک **سوگوار نمونہ** ہوگا، جس کے بعد فرشِ ماتم بچھا کر نالہ و فریاد کرنا قطعاً عبث اور بے سود ہوگا۔

(۸) آخر میں ہزاروں تمناؤں کے ساتھ میری یہ دلی دُعا ہے کہ یہ ادارہ مرکزِ پاکستان میں اس شان سے قائم ہو کہ ایک مرتبہ پھر **بغداد و قرطبہ** کی دلکش یاد، اور تاریخی روایات تازہ ہو جائیں، جنکے شفاخانو

دُستُورُالعَمَل

تعلیم کی نوعیت:

بہ لحاظ نوعیت، تعلیم کے دو معیار قائم کیے گئے ہیں:

(۱) جس سے لائق اطبا پیدا کیے جائیں، جو ملک کے بیماروں کی پوری اہلیت کے ساتھ خدمت کرسکیں، اور بہ لحاظ فن ہر طبقہ کا انھیں اعتماد حاصل ہو۔

(۲) جس سے ایسے فاضل اَطِبّاء پیدا کیے جائیں جو اساتذہ کی جگہ پر سکیں، اور مؤلف و مُصَنِّف بن کر تحقیق و تنقید کے اصول پر فن کی خدمت کرسکیں، اور اپنی طب میں شاندار اضافات کرکے اس کے اعزاز اور دائرۂ افادت کو وسیع تر کریں۔

مُدّتِ تعلیم

پہلے معیار کے لیے مدتِ تعلیم پانچ سال ہو، اور دوسرے معیار کے لیے مزید دو سال۔

عِلمی لقب

پہلے نصاب کی تکمیل کے بعد فارغ التحصیل کو کامِلُ الطِّب* کے لقب کی سند عطا کی جائیگی اور دوسرے نصاب کی تکمیل کے بعد مَاہِرُ الطِّب** کی۔

زبانِ تعلیم

پہلے معیار کے لیے ذریعہ تعلیم اُردو ہو، اور دوسرے معیار کے لیے اُردو کے علاوہ عربی کیوں کہ طبِ عربی کا سارا ذخیرہ عربی ہی میں ہے۔

مَضَامِین تَعلیم:

طِبّی مَضَامین:

(۱) کُلیات

(أ) امورِ طبیعیہ اور مَنَافِعُ الاعضاء

(ب) عِلمُ الاحوال (علم الامراض)

(ج) علم الاسباب۔

(د) علم العلامات

(ہ) کلیاتِ علاج (امراض کُلیہ)

(۲) عِلمُ الاَعضاء (تشریح عِلمی و عَملی)

(۳) عِلم الاَدوِیہ (اَدوِیہ مُفردہ و مرکبہ)

و صَیدَلیہ (اصُولِ دَوَاسازی)

(۴) عِلم السُّمُوم و طِبّ قانونی (متعلقہ قوانین عدالت و طبی شہادت)

---

* اس کے بجائے طب کامل ** اس کی بجائے طب ماہر۔

(۵) علم حفظ صحت

(۶) معالجات امراض (امراض جزئیہ) علمی

معالجات امراض (امراض جزئیہ) عملی (حاضری شفاخانہ ونسخہ نویسی)

(۷) علم الجراحۃ

(۸) علم القبالۃ (علم القابلہ : دایہ کا فن)

(۹) تاریخ طب، وتحقیق مسائل مہمہ۔

غیر طبی مضامین

مبادی طب : مذکورہ طبی مضامین کے علاوہ ادارہ میں مبادی طب کی ضروری تعلیم کا بھی بندوبست کیا جائے، جو محض اس وقت تک جاری رہے جب تک معیاری قابلیت کے طلباء کی کمی محسوس ہو، اور جب قابل طلباء کافی تعداد میں داخل ہونے لگیں تو ان مضامین کی تعلیم موقوف کردی جائے۔

(۱۰) حکمت قدیمہ (جس کے اصول پر ہماری طب کی بنیاد قائم ہے) مع ضروری معلومات واصطلاحات منطق۔

(۱۱) حکمت جدیدہ (طبعیات، کیمیا، نباتیات، حیوانیات)

(۱۲) تعلیمات عربیہ: عربی طبی اصطلاحات کی اصلی ساخت سمجھنے اور صحیح بولنے کے لیے ضروری معلومات

انتباہ: ان غیر طبی مضامین کی تعلیم محض اُن ہی طلباء کو دی جائے گی جو ان سے نابلد ہوں گے۔

اساتذہ بہ لحاظ تقسیم مضامین

(۱) معلم کلیات تاریخ وتحقیق

(۲) " تشریح

(۳) " منافع

(۴) " علم الادویہ

(۵) " علم السموم وطب قانونی
" علم حفظ صحت

(۶) " معالجات

(۷) " علم الجراحۃ
" علم القبالۃ

(۸) " علم الامراض و علم تشخیص

(۹) معلم حکمت قدیمہ و تحصیلات عربیہ
(۱۰) " حکمت جدیدہ

انتباہ (ا) صدر الکلیہ: ان ہی مذکورہ اساتذہ میں سے کسی صاحب کے ذمہ، جس کو ارکان مجلس پسند کریں گے، ادارہ کی صدارت کے فرائض سپرد ہوں گے۔

(ب) عملی شعبوں کو بہتر اور معیاری طریقے پر چلانے کے لیے اس تعداد میں کم از کم چار پانچ معاونین کا اضافہ ضروری ہوگا، مثلاً

(۱) دار التشریح کے لیے ایک، یا دو۔
(۲) قبالت کے لیے ایک۔
(۳) تشخیص اور امتحان مواد کے لیے ایک۔
(۴) ادویہ کے لیے ایک۔

اصول تعلیم اور اس کی ضروریات

علم طب کے سارے اجزا میں (جیسا کہ ہر صاحب علم پر منکشف ہے) کم و بیش فرق کے ساتھ تجربہ، مشاہدہ، اور عملی مزاولت کی شدید ضرورت ہے، اس لیے اس معیاری تعلیم گاہ کا بنیادی اصول یہ رکھا گیا ہے کہ علم طب کے جن اجزا کی تعلیم میں مشاہدہ، تجربہ، اور عملی مزاولت کی ضرورت ہے، ان کے لیے حسب ضرورت عمل اور تجربہ کے تمام وسائل مہیا کیے جائیں۔ تاکہ نظری تعلیم کے ساتھ عملی تعلیم کی، خوبی کے ساتھ تکمیل ہو جائے، مثلاً

تشریح کے لیے (ا) محفوظ کیے ہوئے انسانی اعضاء۔
(ب) اعضائے انسانی کے مصنوعی نمونے (تماثیل و مجسّمات: ماڈلز آف اناٹمی)
(ج) نقشے
(د) دار التشریح (ڈسکشن ہال) جہاں طلبا، خود اپنے ہاتھوں سے مُردے چیر کر اندرونی اعضاء کی ترکیب و ساخت کا مشاہدہ کریں گے۔

کیمیا کے لیے معمل کیمیاوی (کیمیکل لیبورٹری)
طبعیات کے لیے معمل طبعی (فزیکل لیبورٹری)
علم الادویہ، نباتات، اور حیوانیات کے لیے بستان العقاقیر (بوٹانیکل گارڈن) نمائش گاہیں، جن میں ضروریات تعلیم کے نمونے جمع کیے جائیں۔
دوا سازی کے لیے مستقل عمارت، آلات دوا سازی، اور ضروری سامان کے ساتھ۔
تشخیص کے لیے معمل مرضی (پیتھالوجیکل لیبورٹری) جہاں مواد امراض اور فضلات کے امتحان کا سامان ہوگا۔

فراشیات کے لیے، یعنی مریضوں کے حالات کا معائنہ کرنے، مرض کی تشخیص، تیمار داری اور علاج کے اصول سیکھنے، اور نسخہ نویسی کی تعلیم کے لیے۔

(ا) بیرونی شفاخانہ کے ساتھ۔

(ب) رہائشی شفاخانہ کا وسیع پیمانہ پر انتظام، جہاں ہر قسم کے مریضوں کی کافی تعداد کا قیام ممکن ہو، اور جہاں حسب اصول، دوا، وتدابیرِ علاج کے علاوہ مریضوں کی خوراک و پوشاک کا انتظام بھی شفاخانہ کی طرف سے (بلا قیمت) ہو۔

کتب خانہ

اساتذہ اور طلبہ کے مطالعہ اور توسیع معلومات کے لیے ایک اچھے کتب خانہ کی ضرورت ہے۔ جس میں طب قدیم وجدید کی عام کتابوں کے علاوہ قوم وملک کے نادر اور بیش بہا سرمایہ کو، جو عربی زبان میں بہ صورت مخطوطات ادھر اُدھر منتشر ہے، حتی الامکان جمع کرنے کی کوشش کرنا۔

شرائط داخلہ

یہ ظاہر ہے کہ جتنی اچھی لیاقت کے طلبہ ادارہ میں داخل ہوں گے اُسی قدر اعلا معیار کے طبیب بن کر نکلیں گے، اس لیے ابتدائی داخلہ میں کم از کم مندرجہ ذیل قابلیت مشروط کر دی جائے:

(ا) جامعہ پنجاب کا مولوی عالم مولوی فاضل منشی فاضل

(ب) ایف اے ایف ایس سی

(ج) دوسرے مسلمہ اداروں کے فارغ التحصیل، جن کی قابلیت کا معیار مذکورہ بالا ہر دو گروہ (ا و ب) سے کم نہ ہو۔

عمر: طالب علم کی عمر داخلہ کے وقت (۱۸) سال سے کم نہ ہو۔

صحت: امیدوار تن درست، اور امراض متعدیہ سے محفوظ ہو۔

سیرت: امیدوار نیک چلن ہو۔

مسلمہ ادارے

جن کی سندیں داخلہ کے لیے تسلیم کی جائیں

(۱) دارالعلوم دیوبند	۲- ندوۃ العلماء	۳- مدرسہ عالیہ کلکتہ
۴- مدرسہ عالیہ رامپور	۵- جامعہ عربیہ ارکاٹ	۶- مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن
۷- مظاہر العلوم سہارنپور	۸- مدرسہ امینیہ دہلی	۹- مدرسہ فتحپوری، دہلی
۱۰- مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ	۱۱- جامعہ احمدیہ بھوپال	۱۲- جامعہ ڈابھیل گجرات
۱۳- مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ	۱۴- جامعہ سعدیہ حیدرآباد سندھ	۱۵- جامعہ عباسیہ بہاولپور

۱۶- جامعہ سیفیہ سُورت گجرات۔

اس فہرست میں حسب سفارش مَجْلِس تعلیمی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

مجلس تعلیمی

اِدارہ کا نظم و نسق قائم رکھنے، اور تعلیمی امور کو باقاعدہ چلانے کے لیے ایک مجلس عاملہ کی ضرورت ہے، جو مَجْلِس تَعْلِیْمِی کے نام سے یاد کی جائے گی۔ اس مجلس کی تشکیل حسب ذیل صورت میں ہونی چاہیے:-

(ا) صدر　　شیخ الجامعہ

(ب) اَرْکان　　(۱) مُسَجِّل جامعہ

(۲) کلیہ طبیہ کے کم از کم پانچ اساتذہ

(۳) دو بیرونی اطبّاء، جو تعلیمی تجربہ رکھتے ہوں، اور شہر کراچی میں مقیم ہوں۔

(ج) مُعْتَمَد　　صدر کلیہ

فرائض

تمام تعلیمی و انتظامی امور کے لیے ذمہ دار جماعت مَجْلِس تعلیمی ہے، جس کے فرائض اجمالاً حسب ذیل صورت میں شمار کیے جا سکتے ہیں:

(۱) نصاب کا متعین کرنا، قواعد کا بنانا، اور حسب ضرورت پچھلے دستور میں ترمیم کرنا۔

(۲) ادارہ کا نظم و ضبط قائم رکھنا، اور اس سلسلے میں مناسب احکام کا صادر کرنا۔

(۳) ضروریات تعلیم کی پوری نگرانی اور اہتمام کرنا۔

(۴) کتب، مجسّمے، نقشے، اور تعلیمی ضروریات کی فراہمی اور خریداری کی منظوری دینا۔

(۵) امتحانات کا انتظام، ممتحنین کا انتخاب، نتیجۂ امتحان کی ترتیب اور منظوری، اور طلبا، کو جماعتوں میں ترقی دینا۔

(۶) نظام الاوقات کی ترتیب، اور تقسیم مضامین میں (حسب ضرورت) صاحب صدر کو مناسب ہدایات دینا۔

(۷) تعلیمی ضروریات کے مطابق کسی نئے استاذ کا انتخاب کرنا۔

(۸) تصفیہ طلب نئے مسائل کا فیصلہ کرنا جس کا ذکر موجودہ دستور العمل میں نہ ہو۔

مَاهِرُ الطِّبّ

جماعت ماہر کا طریقۂ درس و عمل کامِلُ الطِّبّ کے عام طریقۂ تعلیم سے سراسر جداگانہ ہوگا [illegible]

مقصد یہ ہوگا کہ وہ علم طب کے کسی علمی یا عملی جزو کو اپنا موضوع خاص بنائیں، اور کاوش و تحقیق اور عمیق مطالعہ کے ذریعہ محض اسی جز میں کامل مہارت پیدا کرکے ایک فاضلانہ مقالہ لکھیں جس میں ان کے ذاتی مطالعہ، کاوش و تحقیق، اور علم و عمل کے نتائج درج ہوں، اور جس کے صفحات (۱۵۰) سے کم نہ ہوں۔

رہبری : مجلس تعلیمی کا فرض ہوگا کہ ادارہ کے اساتذہ میں سے کسی ایک کو نامزد کردے، جس کی رہبری میں طالب علم اپنا تحقیقی کام جاری رکھ سکے گا

موضوع : اپنی دل چسپی کے لحاظ سے موضوع کا انتخاب خود طالب علم کرے گا، مگر اس کی منظوری مجلس تعلیمی دے گی۔


SUALIN
FOR CUGHS&
BRONCHITIS
سعالین


خسرہ
چیچک
حلق کا درد
کھجلی
گرمی دانے
خناق
نکسیر
مہاسے
پھوڑے پھنسیاں
کن پھیڑے
داد
چنبل
پتّی اُچھلنا
خون کا بگاڑ
صافی
خون صاف کرنے کے لیے دس خوراکیں
Safi
صافی
Hamdard
تیار کردہ:- ہمدرد دواخانہ، دہلی
پرانا قبض
پیشاب کی جلن
طبیعت گری گری رہنا
طاعون


ماءُ اللحم (۲) دو آتشہ
ہمدرد کا ماءُ اللحم تازہ فواکہات، مقوی میوہ جات قیمتی دواؤں، پرند
مچھلی کے لطیف گوشت سے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ دل و دماغ اور اعضائے رئیسہ
میں نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔ عام جسمانی کمزوری کو دُور کرتا ہے۔ عمدۂ ٹانک
ہے۔ اور
ہر موسم میں قابلِ استعمال ہے!
جب بھی معالج کوئی ٹانک تجویز کرے ماءُ اللحم کو یاد رکھیے
بچوں، بڑوں، عورتوں اور مردوں
سب کے لیے
تازہ فواکہات
سبز ترکاریاں
خاص پرند
مچھلی
AKHLAQ.
Hamdard
ہمدرد دواخانہ
دہلی۔ کراچی
ایشیا کے مشہور یونانی دواساز

مزاج

بناب حکیم مولوی محمد کبیرالدین صاحب

کلمۃ التمہید

قدیم مصنفین علم طب میں سب سے پہلے انسان کے کل پُرزوں کا ذکر کیا کرتے ہیں جن سے انسان کا بدن مرکب ہے۔ ان کل پرزوں کو وہ "امور مُقوّمہ" کہتے ہیں ۔۔ یعنی ایسے امور جن سے بدنِ انسان کا قیام و قوام ہے۔

جب تک یہ امور طبعی رفتار پر رواں رہتے ہیں، اُس وقت تک انسان کے اعمال وافعال باقاعدہ جاری رہتے ہیں، اسی کا نام صحت ہے۔

ان ہی امور مقوّمہ کا اصطلاحی نام "اُمورِ طبیعیہ" ہے ۔۔۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ ایسے امور ہیں، جن سے طبیعتِ انسانیہ کی تخلیق وابستہ ہے۔ انسانی طبیعت ان امور کے بغیر اپنے صحیح اعمال وافعال پر قادر ہی نہیں رہتی۔

امورِ طبیعیہ ہی کا دوسرا نام فزیالوجی ہے ۔۔۔۔۔ فزیالوجی کی اگر تشریح کی جائے، تو اس میں سے دو چیزیں برآمد ہو جائیں گی۔

فزیاس : طبیعت　　　لوجی : علم، بحث

علم طب کا ہر مبتدی جانتا ہے کہ قدیم طرز تعلیم کے لحاظ سے امور طبیعیہ میں سات چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے :-

(۱) عناصر بدن انسان۔

(۲) مزاجِ انسان و مزاجِ اعضاء۔

(۳) اخلاط بدن　(بدن انسان کے سیال اجزاء)

(۴) اعضاء　(سخت اور جامد اعضاء بدن)

(۵) ارواح　(بدن کے لطیف ہوائی و بخاری اجزاء)

(۶، ۷) قویٰ اور افعال، جن کو منافعِ اعضاء کہا جاتا ہے۔

علم طب میں، اور طبیب کے اعمال میں مزاج کی بحث کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ ذی علم اطباء کے نزدیک اظہر من الشمس ہے۔ لیکن منکرین کی کتابیں چوں کہ اس قسم کی اصطلاحات سے اب خالی کر دی گئی ہیں، اس لیے شکوک و شبہات کے بحرِ ظلمات میں وہ غوطہ کھانے پر مجبور ہیں۔

ہاں اگر وہ زاویۂ فکر کو ذرا بدل دیں، تو امید ہے کہ صحیح نتائج تک بہ آسانی پہنچ سکیں۔

انسان کا بدن جس طرح آلات کا ایک بہترین مجموعہ ہے، اسی طرح یہ کیمیائی تغیرات کا بھی ایک عجیب **معمل** (کارخانہ: کارگاہ) ہے۔ اور کسی کیمیائی کارخانے میں — اگر بہ نظرِ امعان دیکھا جائے ——— ہوتا کیا ہے؟ ہر جگہ اور ہر تغیر جو کہیں نمودار ہوتا ہے، وہاں عناصر ہی کا مخصوص تناسب اور اس کی آمیزش کارفرما ہوا کرتی ہے، جس کو **امتزاج کیمیائی** کہا جاتا ہے۔ اسی امتزاج کیمیائی کا قدیم نام **امتزاج حقیقی** ہے، جس کا نتیجہ **حقیقی مزاج** ہے۔

تمام مرکبات کے حاصل ہونے کا مدار، اور ان مرکبات کے سارے خواص کا مدار عناصر کے اسی تناسب کیمیائی اور ان کی صحیح آمیزش پر ہے۔ اور طبِ قدیم، بحثِ مزاج میں اسی سے بحث کرتی ہے۔

اگر اصطلاحات کی مغایرت ہٹادی جائے، جو غیر مستحسن اغراض کے تحت یورپ نے قصداً حائل کردی ہے، تو درمیانی حجابات عجیب طور سے کافور ہو جائیں، اور اس پردے کے ہٹنے پر نہ معلوم کتنے قسم کے انوار جھلکنے لگیں۔

اس تمہید کے بعد اب ناظرینِ طبِ یونانی کی اس بحثِ مزاج کو جو بہ ظاہر بہت ہی سادہ اور پھیکی معلوم ہوتی ہے، مطالعہ فرمائیں ——— اور دیکھیں کہ اس پھیکے پن میں حقائق کی کتنی حلاوتیں روپوش ہیں۔

قدماء قائل ہیں کہ ایک چیز کے خواص دوسری چیز سے اگر مختلف نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے مزاج ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔ یعنی عناصر جس مقدار اور جس تناسب سے کسی ایک چیز میں پائے جاتے ہیں، دوسری چیز میں دوسری مقدار اور دوسرے تناسب سے شریک ہوتے ہیں۔

الفت و نفرت:

حکماء قدیم اس کے بھی قائل ہیں کہ بعض عناصر میں بعض دوسرے عناصر سے ملنے کی خاص کشش پائی جاتی ہے جس کو **الفت** (اُلفتِ کیمیاویّہ) کہا جاتا ہے۔

اور بعض عناصر میں باہم آمیزش کی یہ کشش نہیں ہوتی، اس لیے وہ باہم کسی طرح ترکیب نہیں پاتے ——— بہ الفاظِ دیگر ان میں باہمی نفرت و عداوت ہوتی ہے، اس لیے دو دشمنوں کی طرح وہ آپس میں متحد نہیں ہوتے، اور ملانے کی کوشش پر بھی جدا ہو جاتے ہیں۔ اس کیفیت کو **بغضت** (نفرتِ کیمیاویّہ) کہا جاتا ہے۔ "تیل اور پانی کا بیر" اسی حقیقت کی ہندی ترجمانی ہے۔

الغرض عناصر میں باہم ملنے کی کشش کم و بیش ہوا کرتی ہے، سب میں یکساں نہیں ہوتی۔ جن عناصر میں باہم ملنے کی کشش ہوا کرتی ہے، وہی ترکیب پایا کرتے ہیں، اور ان ہی کے امتزاج

باہمی سے "مزاج" حاصل ہوا کرتا ہے۔

امتزاجِ سادہ و حقیقی:

پھر امتزاج کی دو صورتیں ہیں:

اگر دو یا زیادہ عناصر باہم سادہ طور پر مل جائیں اور ان کے سابقہ خواص بدستور قائم رہیں، تو اس کو امتزاجِ سَاذَج (سادہ آمیزش) کہتے ہیں، مثلاً پانی اور شکر کا مل جانا۔

لیکن اگر چند عناصر باہم اس طور پر ملیں کہ ان کے سابقہ خواص و کیفیات بدل کر بالکل نئے خواص پیدا ہو جائیں، تو اس کو امتزاجِ حقیقی (صحیح آمیزش) کہتے ہیں۔

حقیقی مزاج اسی قسم کے امتزاج کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ غذاؤں سے خون اور خون سے اجزا کا بننا، اور ان سے ہڈی کری، گوشت، بال، کھال اور ناخن کا بننا حقیقی امتزاج کی صورتیں ہیں۔

تعریفِ مزاج:

مزاج اس نئی کیفیت کا نام ہے، جو عناصر کے ملنے کے بعد مرکب میں حاصل ہوتی ہے۔

مزاج بننے کی صورت میں عناصر اتنے باریک اجزا میں منقسم ہو جاتے ہیں کہ وہ مرکب میں کسی طور پر ممتاز نظر نہیں آتے، خواہ کسی طاقت ور خردبین سے دیکھا جائے۔

مزاج حاصل ہونے کی صورت میں جو نئی کیفیت اور جدید خاصیت پیدا ہو جاتی ہے، وہ سارے مرکب میں یکساں طور پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے، مثلاً شکر کا اگر کوئی ذرّہ سفید اور شیریں ہے، تو دوسرے ذرات بھی اس صفت میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اسی کو کہا جاتا ہے "اجزا کی یکسانیت و یکرنگی" (تَشَابُہِ اجزا)

تقسیمِ مزاج:

مزاج کی قسمیں نو ہیں: ایک معتدل اور آٹھ غیر معتدل (علامہ قرشی)

معتدل اور غیر معتدل:

علم طب میں مزاج معتدل اُس مزاج کو کہتے ہیں، جس میں وہ عناصر بقدر ضرورت ہوں، یعنی جس مرکب میں وہ عناصر داخل ہیں، اُن کا تناسب اُس میں ٹھیک ٹھیک اُن افعال و خصوصیات کے مطابق ہو، جو اس مرکب سے مقصود ہیں۔

اس لحاظ سے سارے حیوانات، نباتات اور جمادات معتدل ہیں، بشرطیکہ وہ طبعی حالت پر ہوں، اگرچہ ان سارے مرکبات میں عناصر کی مقداریں مختلف تناسب سے داخل ہیں۔ کسی میں ایک عنصر اگر غالب ہے، تو دوسرے میں دوسرا عنصر۔

اسی طرح ہڈی، کری، گوشت اور چربی وغیرہ تمام اعضا اپنی اپنی جگہ معتدل ہیں، بشرطیکہ یہ اپنے طبعی مزاج، یعنی طبعی تناسبِ عناصر پر قائم ہوں، یہ معلوم ہے کہ ہڈی میں سختی اور مضبوطی پیدا کرنے کے لیے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اجزاء ارضیہ اس ترکیب میں بڑھا دیے جائیں۔

علیٰ ہٰذا چربی چونکہ عندالضرورت جل کر بدن کی حرارت قائم رکھنے کی خدمت انجام دیتی ہے، اس لیے اس میں ایسے عناصر اور ایسے امتزاج خاص کی حاجت ہے، جو بسہولت احتراق پذیر ہوں۔

الغرض چربی کا مزاج اگر ہڈی سے مختلف ہے تو اس کا فعل بھی ہڈی سے جداگانہ ہے۔ اس لیے جو عناصر چربی میں جس تناسب سے پائے جاتے ہیں، وہ چربی کے افعال و اغراض کے لیے مناسب ہیں، اور جو عناصر ہڈی میں کسی خاص تناسب سے فطرت نے ڈھالے ہیں، وہ ہڈی کے مقاصد کے لیے موزوں ہیں۔

علمِ طب میں اسی قسم کے مزاج کو مُعتَدِل کہتے ہیں، اور اسی سے بحث کی جاتی ہے اسی وجہ سے اس کا نام مُعتَدِل طبی ہے۔

اور جب کسی مرکب کی ترکیب میں کوئی خرابی آجاتی ہے، یعنی عناصر کا طبعی تناسب معدوم ہوتا ہے، تو اسے غیر معتدل کہا جاتا ہے جس کے بعد اس مرکب کے مطلوبہ افعال میں خلل لاحق ہو جاتا ہے، اور اگر وہ مرکب، انسان، حیوان یا نبات ہے، تو مریض بن جاتا ہے۔

معتدل حقیقی :

قدیم فلاسفہ کا جو گروہ چار عناصر (آگ، ہوا، پانی اور خاک) کا قایل تھا، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر کسی مرکب میں چاروں عناصر قطعاً برابر ہوں، تو ایسے مزاج کو معتدل حقیقی (سچا معتدل) کہا جاتا ہے۔ نیز ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں ایسے مرکب کا کوئی وجود نہیں، ایسے معتدل کا وجود محض عقلاً فرض کیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ :

معتدل طبی اور معتدل حقیقی دونوں کی تعریفات کا اگر باہم مقابلہ کیا جائے تو لازماً یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ معتدل طبی میں عناصر کی مساواتِ مقدار کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بلکہ سوال ضرورت و حاجت کا ہے: یعنی مرکب میں عناصر کی جس مقدار کی ضرورت ہے، اسے وہ مقدار ملنی چاہیے، خواہ مقدار کم ہو یا زیادہ۔ اس کے مقابلے میں معتدل حقیقی کے اندر چاروں عناصر کا مساوی مقدار میں ہونا ضروری ہے۔

لیکن چونکہ خارج میں ایسا کوئی مرکب پایا ہی نہیں جاتا، جیسا کہ فلاسفہ قدیم کی رائے ہے، اس لیے نہ صرف کسی انسان کا مزاج ایسا ہو سکتا ہے اور نہ کسی دوا کا۔ پھر ایسے ناممکن الوقوع مزاج سے اطبا کیوں کر بحث کر سکتے ہیں۔

اسی مدعا کی طرف علامہ قرشی اس طرح اشارہ کر رہے ہیں:

معتدل :

علم طب میں معتدل کی اصطلاح تعادل سے مشتق نہیں ہے، جس کے معنی ساری قوتوں کے برابر ہونے کے ہیں کیونکہ ایسے معتدل کا بیرونی دنیا میں کوئی وجود نہیں، بلکہ یہ اصطلاح عدل فی القسمۃ سے ماخوذ ہے، جس کے

معنے "قدرتی تقسیم میں عدل و انصاف کرنے" کے ہیں۔ (علامہ قرشی)

چوں کہ معتدل طبی میں قدرت کی طرف سے مقدار اور کیفیت کے لحاظ سے عناصر بقدر ضرورت عطا ہوتے ہیں، یعنی اس کی قدرتی تقسیم میں عدل و انصاف پایا جاتا ہے، اس لیے کہا گیا ہے کہ لفظ معتدل "عَدْل فِی القِسْمَۃ" سے نکلا ہے ——— تَعَادُل سے نہیں نکلا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ تمام ارکان کی قوتیں (تاثیرات) اور ان کی مقداریں برابر ہوں۔ کیوں کہ ایسا کوئی مزاج خارجًا پایا ہی نہیں جاتا۔

غیر معتدل :

مزاج غیر معتدل کی آٹھ قسمیں ہیں : چار مُفرد اور چار مُرکب

غیر مُعتدل مُفرد کی چار قسمیں یہ ہیں :-

۱۔ حار (گرم) جس میں گرمی ضرورت سے زیادہ ہو۔
۲۔ بارد (سرد) جس میں سردی ضرورت سے زیادہ ہو۔
۳۔ یابس (خشک) جس میں خشکی ضرورت سے زیادہ ہو۔
۴۔ رطب (تر) جس میں تری ضرورت سے زیادہ ہو۔

غیر معتدل مرکب کی چار قسمیں یہ ہیں :-

(۱) حار یابس (گرم خشک) جس میں گرمی اور خشکی دونوں کی زیادتی ہو۔
(۲) حار رطب (گرم تر) جس میں گرمی اور تری دونوں کی زیادتی ہو۔
(۳) بارد یابس (سرد خشک) جس میں سردی اور خشکی کی زیادتی ہو۔
(۴) بارد رطب (سرد تر) جس میں سردی اور تری کی زیادتی ہو۔

(علامہ قرشی)

مزاج مفرد یا غیر مُعتدل مُفرد اسے کہتے ہیں جس میں ایک ہی کیفیت ضرورت سے زیادہ ہو۔ مثلاً محض گرمی کی زیادتی، یا محض سردی کی زیادتی۔

اور مزاج مرکب اسے کہتے ہیں جس میں دو کیفیتیں ایک ساتھ ضرورت سے زیادہ ہو جائیں مثلاً گرمی و خشکی دونوں کی زیادتی ہو جائے۔

سوءِ مزاج :-

سوء مزاج ایک مشہور طبی اصطلاح ہے جس کے معنیٰ ہیں : مزاج کا بگاڑ ——— اس سے یہی مزاج غیر معتدل مراد ہے جس کی آٹھ قسمیں اوپر بیان کی گئیں۔ اسی وجہ سے سوء مزاج کی بھی آٹھ قسمیں ہیں : چار مفرد، چار مرکب۔

لیکن یہ واضح رہے کہ سوء مزاج مفرد عام طور پر مرکب میں تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔ یعنی کسی ایک کیفیت کے غلبے کے ساتھ دوسری کیفیت بھی متاثر ہو جایا کرتی ہے، مثلاً بدن میں کسی وجہ سے حرارت بڑھ جاتی ہے تو عادتاً یہ دیکھا جاتا ہے کہ بدن کی رطوبت بھی اپنے اعتدال پر قائم نہیں رہتی۔

یہ بھی واضح رہے کہ ایسے بہت کم امراض ہیں جن میں کم وبیش سوء مزاج نہ پایا جاتا ہو، خواہ وہ محدود ہو یا پھیلا ہوا۔

کَیْفِیَاتِ اَرْبَعَہ (کیفیات چہارگانہ):

کیفیات فاعلہ: حرارت و برودت، یعنی گرمی اور سردی کو اطبائے قدیم کیفیات فاعلہ (مؤثرہ) کہتے ہیں (فِعل۔ عمل کرنا، اثر کرنا)

کیفیات مُنفَعِلَہ: اور اس کے مقابلے میں رطوبت و یبوست یعنی تری و خشکی کو کیفیات منفعلہ (انفعالیہ، متأثرہ) ــــــ (انفعال: متاثر ہونا: اثر کو قبول کرنا)

اس سے وہ اس طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ عمل اور تاثیر کی شان حرارت و برودت میں قوی ہے، اور رطوبت و یبوست میں ضعیف۔ اسی طرح تأثر و انفعال کی شان مقابلۃً رطوبت اور یبوست میں غالب ہے، اور حرارت و برودت میں مغلوب۔

کَیْفِیَاتِ اَوَّلِیَّہ: ان چاروں کیفیات کو قدما، کیفیات اَوَّلِیَّہ (بنیادی اور ابتدائی کیفیات) کہتے ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں دوسری کیفیات (مثلاً سختی۔ نرمی، رنگ، مزہ، بُو وغیرہ) کو **کیفیات ثوانی** (دوسرے درجے کی کیفیات) کہتے ہیں۔

اس سے وہ اپنے اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ چاروں کیفیات بہ لحاظ تاثیر بنیادی ہیں یعنی باقی دوسری کیفیات درصل کیفیات چہارگانہ کے نتائج اور ان کی پیداوار ہیں۔ مثلاً پال کی گرمی سے آم میں مٹھاس آجاتی ہے، چولھے کی آگ سے غذا پک کر نرم ہو جاتی ہے، بھٹی کی آنچ سے اینٹ میں سُرخی و سختی آجاتی ہے۔ وعلیٰ ہٰذا۔

کیفیات چہارگانہ کی تعریف:

حرارت: وہ کیفیت فاعلہ ہے جس کا کام مادّہ میں خِفّت (ہلکاپن) پیدا کرنا (تخفیف)۔ حجم کو بڑھا دینا (تَخَلْخُل پیدا کرنا)ــــــ کثیف مادّے کو لطیف بنا دینا (تلطیف)۔ اور اجزا کو متفرق و منتشر کر دینا (تفریق) ہے۔

چنانچہ گرم پانی بہ مقابلہ ٹھنڈے پانی کے ہلکا ہوا کرتا ہے۔ (تخفیف) ــــــ گرمی سے پانی اور پارہ کا حجم بڑھ جایا کرتا ہے (تَخَلْخُل) ــــــ لوہا اور برف حرارت سے سیال بن جاتے ہیں، اور سیال پانی ہوا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (تلطیف) ــــــ گوشت اور ہڈی حرارت سے جل کر راکھ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں (تفریق)

برودت: وہ کیفیت فاعلہ ہے، جس کا کام تمام باتوں میں حرارت کی ضد ہے۔ مثلاً بجائے تخفیف کے تثقیل (وزن بڑھا دینا۔ بھاری کر دینا) بجائے تخلخل پیدا کرنے کے تکاثُف پیدا کرنا ــــ بجائے تلطیف کے تغلیظ ــــــ بجائے تفریق کے جمع یعنی متفرق اجزا کو سمیٹنا۔

رطوبت: وہ انفعالی کیفیت ہے، جس کی وجہ سے جسم ہر شکل کو آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے، اور ہر شکل کو آسانی کے ساتھ چھوڑ بھی دیتا ہے۔

یبوست: رطوبت کے خلاف عمل کرتی ہے۔

انسانی مزاج:

تمام مزاجوں میں زیادہ معتدل انسان کا مزاج ہے (علامہ قرشی)

یہ مسئلہ طب کے مباحث اور اس کے اعمال سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتا، کیوں کہ علم طب کے لحاظ سے ہر حیوان، ہر نبات اور ہر مرکب جماد، جب کہ یہ طبعی حالت پر ہو، معتدل ہے۔ اس لیے ایک تن درست انسان جس طرح معتدل ہے، اسی طرح ایک تنومند گدھا اور خچر بھی معتدل ہے۔

الغرض اس مسئلہ کا تعلق یونانیوں کے قدیم فلسفہ سے ہے، کہ کسی مرکب کا مزاج جب تک اشرف و اعلیٰ نہ ہو، اس وقت تک اس کے کمالات بلند و بالا نہیں ہو سکتے۔ یعنی مرکب میں تمام کمالات و محاسن مزاج ہی کی شرافت کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ مزاج تو ادنیٰ قسم کا ہو اور کمالات اعلیٰ معیار کے۔ قدرت کی تنظیم و تقسیم اس قسم کی بے تکی نہیں ہے۔

سوال: جب سارے حیوانات و نباتات اپنے اپنے افعال کے لحاظ سے معتدل ہیں، تو اس کے کیا معنیٰ کہ انسان سب سے زیادہ معتدل ہے؟

جواب: یہاں معتدل سے طبی معتدل مراد نہیں ہے، کیوں کہ ہر حیوان طبی اعتدال کے لحاظ سے معتدل ہے، بلکہ یہاں اعتدال سے تیسرے معنیٰ مُراد ہیں۔ یعنی معتدل حقیقی سے زیادہ قریب ہونا۔ اور اس لحاظ سے انسان تمام حیوانات و نباتات کے مقابلے میں مفروضہ معتدل حقیقی سے قریب تر ہے

سوال: انسان کا مزاج تمام امزجہ سے معتدل ہے۔ اس پر دلیل قائم کیجیے۔

جواب: چوں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، اس لیے اس کا مزاج بھی اشرف ہونا چاہیے۔ اور اشرف مزاج وہی ہو سکتا ہے جو بالکل معتدل ہو، یعنی معتدل حقیقی ہو، مگر چوں کہ معتدل حقیقی کا وجود محال ہے، اس لیے سب سے اشرف مزاج اس کے بعد وہی ہو سکتا ہے جو اس کے قریب تر ہو۔

انسان اشرف کیوں ہے؟ اس لیے کہ انسان کے کام بہ لحاظِ عقل و تدبیر اور کثرت کے تمام حیوانات و نباتات سے اعلیٰ ہیں۔ انسان کا نفس نفس ناطقہ کہلاتا ہے، جو تمام نفوس نباتی و حیوانی سے بہ لحاظ کمالات بہتر ہے۔

سوال: یہ کیسے ثابت ہوا کہ اشرف و اعلیٰ مزاج وہی ہو سکتا ہے، جو معتدل ترین ہو؟ ہم ایسے مزاج کو کیوں نہ اشرف تسلیم کریں جو بہ افراط حار یا با فراط بارد ہو؟

جواب: یہ معلوم ہے کہ حیوانات اور نباتات ذی حیات مرکبات آلیہ میں سے ہیں، جن میں "جان" تسلیم کی جاتی ہے، چناں چہ جس طرح حیوان کو ایک وقت موت آ جاتی ہے، اسی طرح نباتات بھی مر جایا کرتے ہیں۔ اگر ان میں جان تسلیم نہ کی جائے، تو ان کے مرنے کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہو سکتا۔

علیٰ ہٰذا یہ بھی مسلم ہے کہ جاندار چیز بہ نسبت بے جان کے اشرف و اعلیٰ ہے۔ ایک ادنیٰ کیڑا خواہ وہ ہزار گند گیوں کے اندر پیدا ہوا ہو، ہزار رُپے کے ہیرے سے بدرجہا بلند ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا کوئی ذی حیات چیز افراط حرارت یا افراط برودت کو برداشت کر سکتی ہے؟

مشاہدہ اور تجربہ شاہد ہو کہ افراطِ حرارت اور افراطِ برودت، دونوں، دشمنِ حیات و زندگانی ہیں۔ کھولتے ہوئے پانی اور جمے ہوئے پانی میں نہ کوئی پودہ زندہ رہ سکتا ہو، اور نہ کوئی کیڑا۔ لُو اور پالے سے جس طرح جانور مرجاتے ہیں، اسی طرح ان سے کھیتیاں بھی تباہ ہوجاتی ہیں۔

اس سے ثابت ہوگیا کہ نہ حرارت کی زیادتی مناسبِ حیات ہو، نہ برودت کی زیادتی، بلکہ ان دونوں کے درمیان کی کیفیت ہی، جس کو مزاج معتدل یا متوسط کہنا چاہیے، جاندار چیزوں کے لیے موزوں ہو۔

پھر جب یہ ثابت ہوگیا کہ اوسط درجے کی کیفیت (مزاج معتدل) ہی ذی حیات چیزوں کے لیے مناسب ہو، اور اس لحاظ سے وہی مزاج اشرف ہو، تو اب یہ بھی قرینِ قیاس ہو کہ وہ ذی حیات مرکب جس قدر زیادہ اشرف و اعلیٰ ہوگا، اسی قدر اس کے مزاج میں اعتدال زیادہ ہونا چاہیے۔ اسی اصول سے حکماء قدیم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان چونکہ "اشرف المرکبات" ہو، اس لیے اس کا مزاج بھی شریف ترین یعنی معتدل ترین ہو۔

حرارت و رطوبت اور مناسبتِ حیات:

شیخ الرئیس بوعلی سینا نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ انسان کا مزاج معتدل ترین امزجہ ہو، یہ بھی صراحت کی ہو کہ "حرارت و رطوبت حیات کے لیے زیادہ موزوں و مناسب ہیں اس لیے جن چیزوں میں حیات ہو یعنی سارے نباتات و حیوانات (بہ شمول انسان) حرارت و رطوبت کی طرف مائل ہیں۔"

اس مسئلہ کی روشنی میں اگر انسانی مزاج کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت صادق ہو کہ انسان کے مزاج میں حرارت بھی پائی جاتی ہو اور رطوبت بھی۔ حرارت کا وجود تو بالکل بدیہی ہو۔ رہی رطوبت اس کا ثبوت یہ ہو کہ بدن میں پانی کی بہت بڑی مقدار (تقریباً دو تہائی یا اس سے زیادہ) پائی جاتی ہو۔

پیمائشِ حرارت:

اگر بدنی حرارت کی پیمائش سو درجے والے آلۂ مزاج پیما (مُستَمزِج مِئَوِی) سے کی جائے جس کے سو درجے پر پانی کھولنے لگتا اور صفر پر جم جاتا ہو تو انسان کی طبعی حرارت (حرارتِ غریزیہ) جزوی فرق کے ساتھ تقریباً (۳۷ [1]) درجے ہوا کرتی ہو۔ اس کے مقابلے میں بندر کی اس سے کسی قدر بلند گھوڑے کی (۳۸)، خرگوش کی (۳۸٫۲) سے (۳۹) تک، اور کتے کی اس سے بھی زیادہ (۳۸ سے ۳۹٫۵ تک)۔

حرارتِ غریزیہ:

انسان اور دیگر حیوانات کے بدن میں طبعاً جو حرارت پائی جاتی ہو، اُسے حرارتِ غریزیہ

---

[1] ۳۷ مستمزج مئوی = ۹۸٫۶ مستمزج فروج
۳۸ " " = ۱۰۰٫۴ " "
۳۹ " " = ۱۰۲٫۲ " "

(حرارت طبیعیہ) کہا جاتا ہے۔ اسی کو بعض لوگ حرارت حیوانیہ بھی کہتے ہیں، کیونکہ عملاً حیوانات میں یہ حرارت ممتاز طور پر بڑھی ہوئی ملتی ہے، خواہ موسم کتنا ہی ٹھنڈا ہو۔ اس کے برعکس نباتات میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔

یہ حرارت ہمارے بدن میں روح سے اور خون کے مخصوص اجزا کے احتراق سے پیدا ہوتی ہے۔ رُوح تو تنفس کی ہوا سے حاصل ہوتی ہے اور خون کے مخصوص اجزا غذا سے۔ تولید حرارت کے لیے غذا اگر وَقُود (ایندھن) کے قائم مقام ہے، تو رُوح ہوا کے قائم مقام۔ اور یہ ظاہر ہے کہ چراغ کے جلنے میں جس طرح تیل کی ضرورت ہے، اسی طرح ہوا کی بھی۔ (کامل الصناعہ)

یہی حرارت اگر بدن میں غیر معمولی طور پر زیادہ پیدا ہونے لگے، جیسا کہ بخار میں دیکھا جاتا ہے، تو اُسے حرارت غریبہ، کہا جاتا ہے۔ اور اگر معمول سے کم پیدا ہو، جیسا کہ غشی، سقوطِ قوت، اور فاقے میں ہوتا ہے، تو اسے حرارتِ مقصرہ کہا جاتا ہے۔ مقصرہ کے معنی کوتاہی کرنیوالی کے ہیں۔ ایسی کم زور حرارت سے چونکہ بدنی افعال پورے طور پر چل نہیں سکتے، اس لیے اس کو "کوتاہی کرنے والی" حرارت کہا جاتا ہے۔

حرارت غریزیہ طبیعت کا آلہ ہے: بدن کے سارے طبعی افعال حرارت غریزیہ کی موجودگی میں ہی صادر ہوا کرتے ہیں۔ اسی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے اطبا، کہا کرتے ہیں کہ

"حرارت غریزیہ طبیعت کا آلہ ہے"

یعنی طبیعت کے سارے افعال کے لیے حرارت غریزیہ ایک مشترک ذریعہ ہے۔ اس معتدل حرارت کے بغیر کوئی طبعی فعل ظاہر ہی نہیں ہوتا۔

طبیعت بہ ہر صورت بدنی حرارت کے اس اعتدال کو قائم رکھنے کی جد و جہد کرتی ہے خواہ افریقہ جیسا گرم ملک ہو، یا سائبیریا جیسا سرد ملک۔

سردیوں کے موسم میں میٹھی اور روغنی غذائیں خوب کھائی جاتی، اور ہضم ہوتی ہیں۔ یہ بھی درحقیقت طبیعت کی ایک اندرونی مدبرانہ اور حکیمانہ کوشش ہے کہ بدنی حرارت زیادہ پیدا ہو، تاکہ سردی کے غلبے کا مقابلہ کیا جا سکے اور بیرونی ہوا کی خنکی سے اعضا، کا مزاج بارد نہ ہو جائے۔ اسی طرح گرمیوں کے موسم میں پسینہ زیادہ آتا ہے، تاکہ زائد حرارت اس صورت سے خارج ہو جایا کرے اور مزاجی اعتدال برابر قائم رہے۔

معتدل ترین ممالک:

اس بارے میں حکما، قدیم کے دو گروہ ہیں:

(ا) ایک گروہ کا قول ہے جس میں بو علی سینا شریک ہیں، کہ انسان کے مختلف اصناف میں خط استوا، کے باشندے زیادہ معتدل ہیں، اس کے بعد چوتھی اقلیم کے باشندے (قرشی)

(ب) دوسرا گروہ کہتا ہے جس میں امام رازی داخل ہیں کہ:

"چوتھی اقلیم کے باشندے سب سے زیادہ معتدل ہیں، اور خط استوار کے باشندے بہت زیادہ گرم ہیں۔" یعنی معتدل سرزمین چوتھی اقلیم ہے، اور خط استوار بہ افراط حار۔

خط استوار

خط استواء وہ فرضی خط یا دائرہ ہے، جو زمین کے گولے (کرۂ زمین) پر ٹھیک بیچ میں پورب سے پچھم تک جاتا ہے اور پھر گھوم کر پچھلے سرے سے مل جاتا ہے۔ اس دائرے کی وجہ سے زمین کا گولہ (کرۂ زمین) دو برابر حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں حصے نصف شمالی (اُتر کے) اور نصف جنوبی (دکھن کے) ہوں گے، جس طرح گول امرود کو چاقو سے اس طرح کاٹ دیا جائے کہ دو نصف ٹکڑے پیدا ہو جائیں۔

اس کو خط استوار اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں دن رات تقریباً مساوی ہوا کرتے ہیں۔ (استواء = برابر ہونا)

کرۂ زمین کے اسی خط (خط استوا) کی سیدھ میں، یعنی اس کے محاذی ایک خط اگر آسمان پر فرض کیا جائے تو اسے مُعَدِّلُ النَّہَار (دن کا برابر کرنے والا) کہتے ہیں، کیوں کہ جب سورج اس خط پر پہنچ جاتا ہے، تو دن رات بالکل برابر ہو جاتے ہیں۔

رُبعِ مَسکون اور سات اقالیم: قدیم علمائے جغرافیہ کا یہ خیال تھا کہ کرۂ زمین کی محض ایک چوتھائی آباد ہے، اس لیے اس کو رُبعِ مَسکون کہتے ہیں۔ (رُبع: چوتھائی۔ مَسکون: آباد)۔

کرۂ زمین کی اس چوتھائی کو خط استوا سے شمال کی طرف قطب شمالی تک سات ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جس سے لمبوترے سے ٹکڑے نکل آتے ہیں۔ جس طرح امرود کے چار ٹکڑے کرنے کے بعد ایک ٹکڑا لے لیا جائے، اور پھر اس ایک ٹکڑے کو سات لمبوترے حصوں میں کاٹ دیا جائے ان ساتوں حصوں کو اقالیم کہا جاتا ہے۔ پہلی اقلیم خط استوار کے قریب ہے، اور ساتویں اقلیم قطب شمالی کے قریب

مزاج اقالیم:

ساتوں اقالیم میں سے آخیر کی اقلیمیں، جو قطب شمالی کے قریب ہیں، سرد ہیں، جہاں آفتاب کی شعاعیں ترچھی پڑا کرتی ہیں، اسی وجہ سے پورب کی سرزمین میں برودت کافی ہوا کرتی ہے۔ اور روس کا وہ علاقہ، جو قطب شمالی سے قریب ہے، بہت ہی ٹھنڈا ہے۔ مثلاً سائبیریا۔ اسی وجہ سے وہاں آبادی بہت ہی قلیل ہے۔ یعنی نباتات، حیوانات، اور انسانوں کی حیات کا سامان وہاں بہت کم ہے۔

اسی طرح ابتدائی اقالیم، جو جنوب کی طرف، خط استوار سے قریب واقع ہیں، وہاں سورج کی کرنیں کم و بیش سیدھی پڑا کرتی ہیں (سمت راس پر پڑا کرتی ہیں) اس لیے وہاں گرمی کی شدت ہوتی ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ شمال کی طرف کی اقلیمیں ٹھنڈی ہیں، اور جنوب کی طرف کی گرم، تو

درمیان کی اقلیم (چوتھی اقلیم) کو لامحالہ معتدل ہونا چاہیے۔
یہی وجہ ہے کہ چوتھی اقلیم سب سے زیادہ آباد ہے، اور تیسری سے پانچویں تک براعظم ایشیا کا بیشتر حصہ واقع ہے، جو دوسرے براعظموں سے زیادہ معمور ہے۔

ممالک حارّہ اور ممالک باردہ :

اقالیم باردہ، مثلاً شمالی ممالک میں چوں کہ فضا سرد ہوا کرتی ہے، اور اقالیم حارّہ، مثلاً جنوبی ممالک کی ہوا اس کے مقابلے میں گرم۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ان دونوں مقامات کے باشندوں کے مزاج ایک دوسرے کے متقابل ہوتے ہیں۔

چنانچہ سرد ممالک کے باشندوں کو چوں کہ سردی کا سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اور اس مقابلے میں ان کے جسم کی حرارت بڑی مقدار میں صرف ہوجایا کرتی ہے، اس لیے طبیعت مدبرہ اس کا بندوبست کرتی ہے کہ ان کے بدن میں حرارت کافی پیدا ہو۔ اسی وجہ سے ٹھنڈے ملک کے باشندوں کی قوتِ ہاضمہ بہت بہتر ہوتی ہے، جس سے ان کے جسم میں غذا خوب ہضم ہوتی ہے، اور بڑی مقدار میں خون تیار ہوتا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ خون ہی ایندھن پر مشتمل ہوتا ہے، جو روح کی معیت میں مشتعل ہو کر حرارت پیدا کیا کرتا ہے۔

اس کے برعکس گرم ممالک کے باشندوں کے جسم میں تولیدِ حرارت کا ایسا بندوبست نہیں ہوتا، اس لیے وہ ایسی شدید سردی کو برداشت نہیں کرسکتے۔

علامہ محمود آملی کہتے ہیں، جو صحیح ہے کہ بلادِ شمالیہ کے باشندوں کی حرارت عزیزیہ اُن کے اندرونی اعضا میں قوی ہوتی ہے، اس لیے ان کے بدن میں غذا خوب رچتی پچتی ہے۔

جالینوس قائل ہے کہ : بلدان باردہ (ٹھنڈے ممالک) کے باشندے، مثلاً ترک صقالبہ[1]، اور دوسری قومیں جو شمال میں رہتی ہیں، اُن کے اندرونی اعضا میں حرارتِ عزیزیہ قوی ہوتی ہے جس سے ان کے قویٰ بہتر ہوتے ہیں، اور ان کے اعضا میں چستی پائی جاتی ہے۔

اس کے برعکس باشندگانِ افریقہ و حبشہ وغیرہ جو جنوبی ممالک میں اقامت گزیں ہیں، ان کے اندرونِ بدن کی حرارتِ عزیزیہ نسبتاً کم زور ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے اندرونی اعضا گویا بارد ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی جلد بیرونی فضا کی شدتِ حرارت سے کالی پڑجاتی اور یہ سخت اور خشک محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے گرم ممالک کے باشندوں میں نہ ویسی چستی پائی جاتی ہے، اور نہ ان کے قویٰ بلند ہوتے ہیں۔

علیٰ ہٰذا شمال کے ممالک کے باشندے، اور وہ لوگ جن کے پیشے پانی سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً دھوبی اور سقے، ان کے بدن میں رطوبت زیادہ ہوتی ہے۔ جو لوگ ان کے خلاف ہیں (مثلاً جنوبی ممالک کے باشندے اور آگ کا کام کرنے والے ــــــ جیسے لوہار وغیرہ) ان کے مزاج بھی ان کے خلاف ہیں۔ (شیخ)

---

[1] صقالبہ: وہ قوم بحرِ خزر (قزوین) کے اطراف میں رہتی تھی، اس کے بعد یورپ کے مختلف حصوں میں پھیل گئی۔

مختلف عمروں کے مزاج

عمروں کے لحاظ سے جوان زیادہ معتدل ہوتے ہیں، اور بچے حرارت میں اگرچہ جوانوں کے برابر ہوتے ہیں، مگر بچوں میں رطوبت زیادہ ہوتی ہے، اسی وجہ سے بچوں کی حرارت نرم اور ہلکی اور جوانوں کی حرارت تیز ہوتی ہے۔

ادھیڑ اور بوڑھے سرد خشک ہوتے ہیں، مگر بوڑھوں میں ایک عارضی اور تر کرنے والی رطوبت (رطوبتِ غریبہ بالّیہ) زیادہ ہوتی ہے۔ (علامہ قرشی)

عمر کے درجات: آسنان، یعنی عمروں کو چار درجات میں تقسیم کیا جاتا ہے جیسا کہ عوام میں بھی مشہور ہے۔

(۱) سِنِّ نُمُو (۲) سِنِّ وُقُوف (۳) سِنِّ کُهُولَت (۴) سِنِّ شَیخُوخَت

یہی آسنانِ اربعہ ہیں (آسنان: عمریں۔ اربعہ: چار)

(۱) سِنِّ نُمُو (نشو ونما کا زمانہ): اس عمر میں اعضا بڑھتے رہتے ہیں، یہ تقریباً ۳۰ سال تک کا زمانہ ہے۔

مصنف کے قول میں "بچے" سے یہ پورا زمانہ مراد ہے، جو جوانی سے پہلے واقع ہے، نہ کہ بچپن کا ابتدائی زمانہ، جب کہ بچہ گود میں رہتا ہے۔

(۲) سِنِّ وقوف: اس میں نہ اعضا بڑھتے ہیں اور نہ گھٹتے ہیں، اس کو سِنِّ شَبَاب (جوانی کی عمر) کہتے ہیں۔ یہ سِنِّ نمو کے بعد تقریباً ۳۵ یا ۴۰ سال تک زمانہ ہے۔ (وُقُوف: ٹھیراؤ۔ شَبَاب: جوانی)۔

(۳) سِنِّ کُهُولَت (ادھیڑ عمر) اس عمر میں نقصان اور قویٰ کا انحطاط ہوتا ضرور ہے، مگر زیادہ نمایاں نہیں ہوتا۔ یہ وقوف کے بعد تقریباً ۶۰ سال تک کا زمانہ ہے۔ (کهولت: ادھیڑ ہونا)

(۴) شیخوخت: (بڑھاپے کی عمر) اس عمر میں نقصان اور انحطاطِ قویٰ محسوس طور پر ہوتا ہے۔ رطوبت غریزی اور حرارتِ غریزی بدن میں کم ہو جاتی ہے۔ یہ سِنِّ کهولت کے بعد آخیر عمر تک کا زمانہ ہے۔ (شیخوخت: بوڑھا ہونا)

اِنتباہ: چاروں عمروں کی مدتِ ابتدا، وانتہا، جو اوپر لکھی گئی ہے، یہ تقریبی ہے، اور مردوں کے لحاظ سے بتائی گئی ہے۔ عورتوں میں یہ مدتیں کچھ چھوٹی ہوتی، اس لیے ان میں لازماً فرق ہوگا۔

بچوں اور جوانوں کا مزاج

بچوں کے مزاج کے مسئلے میں تین فریق ہیں:

(۱) ایک فریق کی رائے ہے کہ بچوں کی حرارت جوانوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ ابو الطیب بقراط اس خیال کا مؤید ہے۔

(۲) دوسرے فریق کا خیال ہے کہ بچوں کی حرارت جوانوں سے کم ہوتی ہے۔

(۳) تیسرے فریق کی رائے ہے کہ بچوں کی حرارت جوانوں کے برابر ہوتی ہے۔

رہی رطوبت، تو اس میں تینوں فریق ہم خیال ہیں، کہ بچوں میں بہ مقابلہ جوانوں کے رطوبت غالب ہوتی ہو، جس پر ان کے اعضا کی نرمی گواہ ہو، جس کہ بچوں کی ہڈیاں بھی ملائم اور لچک دار ہوتی ہیں، اور سبز شاخ کی طرح صاف ٹوٹنے کے بجائے مڑجایا کرتی ہیں۔

اگر دریافت کیا جائے کہ ان تینوں آرائیں کونسی رائے صداقت سے قریب تر ہو، تو میں کہوں گا کہ پہلی رائے، یعنی یہ رائے کہ بچوں کی حرارت جوانوں سے زیادہ ہوتی ہو۔ کیوں کہ یہ مسلّم ہو کہ بدنی حرارت کے لیے وَقُوْدُ (ایندھن) غذا ہو۔ یہ ایندھن جس قدر زیادہ خرچ ہوگا، اسی قدر حرارت زیادہ پیدا ہوگی۔ اور اگر تناسب اعضا کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف عمروں کا مقابلہ کیا جائے، کہ کس عمر میں یہ ایندھن زیادہ صرف ہوتا ہو، تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ بچپن کی عمر ہو، جس میں بھوک اور قوتِ ہاضمہ دونوں بہتر ہوتی ہیں۔ اس لیے بچے غذا خوب کھاتے اور خوب ہضم کرتے ہیں، جس سے ان کے بدن میں اتنا خون بنتا ہو کہ اس سے نہ صرف روزمرہ کے خرچ و تحلل کی تلافی ہو جایا کرتی ہو، بلکہ مزید برآں بدن میں نمو وافزائش بھی حاصل ہوتی رہتی ہو۔

پھر اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ ایندھن اسی وقت زیادہ جل سکتا ہو جب کہ اُسے ہوا بھی زیادہ میسر ہو، تو مذکورۂ بالا رائے کی تائید حاصل ہوتی ہو کیوں کہ بچوں کا تنفس اور ان کے قلب کی حرکات دونوں تیز ہوتی ہیں۔ اور عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد مسلسل گھٹتی ہی چلی جاتی ہو۔

اسی چیز کو دیکھ کر کہا جاتا ہو جو بالکل درست ہو، کہ ابتدائے عمر سے آخر عمر تک یعنی بچپن سے بڑھاپے تک بدن کی حرارت و رطوبت بتدریج گھٹتی ہی چلی جاتی ہو۔ بڑھنے کا کوئی سوال ہی نہیں اس لیے یہ رائے صحیح ہو کہ ادھیڑوں اور بوڑھوں کے بدن میں جس طرح حرارت کم پیدا ہوتی ہو اسی طرح ان کے بدن میں رطوبت گھٹ جاتی ہو۔ یہی معنیٰ ان کے سرد و خشک ہونے کے ہیں۔

ادھیڑوں اور بوڑھوں کا مزاج :

ادھیڑوں اور بوڑھوں میں حرارت غریزیہ مقابلتاً کم زور ہوتی ہو، یہی معنی ان کے بارد ہونے کے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہو کہ

(۱) ان کی بھوک، اور ان کی قوتِ ہاضمہ بچوں اور جوانوں کی نسبت کم زور ہوتی ہو۔ اس لیے ان کے بدن میں خون کم بنتا ہو، جو درحقیقت تولید حرارت کے لیے وقود (ایندھن) کا کام کرتا ہو۔

(۲) ان کے قلب اور تنفس کی حرکات نسبتاً سست اور کم زور ہوتی ہو۔

(۳) سردی سے مقابلہ کرنے کی قوت ان میں تدریجاً گھٹتی چلی جاتی ہو۔

ان کے خشک ہونے کی علامت یہ ہو کہ بچوں اور جوانوں کی جلد اور ان کے بَشَرہ میں جو ایک دل فریب رونق اور تازگی ہوا کرتی ہو اور جو رطوبت غریزیہ ہی سے حاصل ہو سکتی ہو، وہ ادھیڑوں اور بوڑھوں میں مفقود ہوتی ہو، یعنی ان کی جلد میں ایک قسم کی خشکی پائی جاتی ہو۔ اسی پر اندرونی اعضا کو قیاس کیا جا سکتا ہو، ان کے گوشت، ان کی ہڈیاں اور کریاں نسبتاً زیادہ سخت ہوتی ہیں۔ اسی لیے

اس عمر میں ہڈیاں آسانی سے ٹوٹ جایا کرتی ہیں۔ (کسرِ عظام) اور بہت دیر میں جڑا کرتی ہیں۔ اس کے برعکس جوانوں کی ہڈیاں اور بچوں کی ہڈیاں اس سے زیادہ جلد جڑا کرتی ہیں۔ یہ امر بھی مسلم ہو کہ حیوان جس قدر کم عمر ہوتا ہو اسی قدر اس کا گوشت وغیرہ بھی ملائم ہوتا ہو۔

علیٰ ھذا عمر جس قدر بڑھتی چلی جاتی ہو، اسی قدر بدن کی کرّیاں اور رباطات ہڈی میں تبدیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ امتداد زمانہ سے سر کے درز بھی غائب ہونے لگتے ہیں، جس سے سر کی متعدد ہڈیاں مل کر ایک ہو جایا کرتی ہیں۔

بوڑھوں میں رطوبتِ غریبہ بالّہ:

جب یہ معلوم ہو گیا کہ بوڑھوں کی قوتِ ہاضمہ بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہو، جس میں معدہ اور جگر کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ بلا استثنا سارے اعضا کی قوتِ ہاضمہ اس ضعف میں شریک ہو، تو جو رطوبات و اخلاط ان کے بدن میں ناقص ہضم سے پیدا ہوں گے، وہ اصلی رطوبات کا، جو پورے طور پر نضج یافتہ ہوں، کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان ہی خام یا نیم پختہ اخلاط کو رطوبتہ غریبہ بالّہ (گیلا کرنے والی غیر طبعی رطوبت) کہا جاتا ہو جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کے بال سفید ہو جاتے ہیں، اور تمام بیرونی و اندرونی اعضا رُو بہ زوال ہوتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا ان میں نزلہ کی شکایت عام اور کثیر الوقوع ہو، جس میں خام رطوبت بصورتِ بلغم خارج ہوا کرتی ہو۔

اگر بڑھاپے میں غیر طبعی رطوبات کی کثرت نہ ہو، بلکہ جوانوں کی طرح رطوباتِ صالحہ (رطوباتِ اصلیہ) کی فراوانی ہو تو بڑھاپا کبھی نہ آئے، بلکہ برابر جوانی قائم رہے۔

رطوباتِ اصلیہ اور رطوباتِ غریبہ کو سمجھنے کے لیے درخت کی تر و تازہ شاخ اور ایسی خشک شاخ پر غور کرنا چاہیے جسے پانی میں ڈال کر بھگو دیا گیا ہو۔ سبز شاخ کی رطوبت کو اصلی رطوبت کے قائم مقام سمجھنا چاہیے اور بھگوئی ہوئی سوکھی شاخ کی رطوبت کو رطوبتِ غریبہ۔ یہ ظاہر ہو کہ ان دونوں رطوبتوں میں آسمان و زمین کا فرق ہو۔

مزاجِ اجناس:

جس طرح خالقِ برتر نے ہر حیوان، اور اس کے ہر عضو کو ایسا مزاج عطا فرمایا ہو، جو اس کے افعال و احوال کے لحاظ سے اَنسب و اَلیَق ہو۔ اسی طرح بہ لحاظِ جنس اگر دیکھا جائے، تو عورتوں اور مردوں کا مزاج بھی ایک دوسرے سے جُداگانہ ہو۔ چنانچہ عورتوں کے اعضا مردوں کے مقابلے میں نرم و نازک ہوتے ہیں، جلد اور عضلات ملائم، اور جلد کے نیچے چربی کی مقدار زیادہ ہوتی ہو۔ نیز مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا قد و قامت نسبتاً چھوٹا اور اندرونی اعضا حجم اور وزن میں مقابلتاً کم ہوتے ہیں۔

مذکورہ امور کو دیکھ کر اطبائے قدیم نے یہ رائے قائم کی ہو کہ عورتوں کا مزاج مردوں کے مقابلے میں بارد و رطب ہو

اگر ان کی حرارتِ غریزیہ مردوں کے برابر ہوتی، تو ان کے جسمانی قویٰ مردوں کے برابر اور اعضا

کا نمونہ بھی مردوں کے مساوی ہوتا۔

علیٰ ہٰذا ان کے بدن میں چربی کا زیادہ جمع ہونا بھی اس بات کی علامت ہو کہ ان کے بدن میں حرارت نسبتاً کم ز ر ہوتی ہو۔ کیوں کہ بلوغ سے پہلے جلد کے نیچے کی چربی لڑکے اور لڑکیوں میں تقریباً یکساں ہوا کرتی ہو۔ لیکن بلوغ کے بعد مردوں میں جلد کے نیچے کی چربی زیادہ خرچ ہو جاتی ہو اور عورتوں میں بہت زیادہ جمع رہتی ہو۔

یہ بھی معلوم ہو کہ بہ حیثیتِ مجموعی مردوں کی خوراک عورتوں سے زیادہ ہوا کرتی ہو، اور سینے کی اندر ہوا کی گنجائش بھی مردوں میں بڑی ہو۔ الغرض جب حرارت کا **وقود** (ایندھن) اور رُوح جسم کے اندر زیادہ پہنچے گی، تو حرارت کا زیادہ پیدا ہونا ایک بدیہی امر ہو۔

یہ بھی صحیح ہو کہ مہماتِ امور اور اعمالِ شاقہ پر عورتوں کے مقابلے میں مرد زیادہ قادر ہیں۔ اور یہ اطبا، کا ایک مسلّہ اصول ہو کہ قوی کی برتری حرارت کی برتری کے تابع ہوا کرتی ہو۔ یہ ناممکن ہو کہ حرارت کم ہو اور افعال بہتر سرزد ہوں۔

یہ بھی واضح ہو کہ عورتوں اور مردوں کے مزاج کا نمایاں اختلاف سنِ بلوغ کے بعد ہی ظاہر ہُوا کرتا ہو۔ اس سے پہلے یہ اختلاف ایسا زیادہ نمایاں نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہو کہ بلوغ سے پہلے اگر کسی لڑکے کو زنانہ بھیس میں تبدیل کر دیا جائے، تو امتیاز عموماً دشوار ہوتا ہو۔

نیز بلوغ کے بعد ہی آواز میں تبدیلی لاحق ہوا کرتی ہو۔ یعنی لڑکوں کی آواز بدل کر بھاری ہو جاتی ہو، جسے **مردانہ آواز** کہا جاتا ہو۔ اس کے برعکس عورتوں کے حنجرہ میں کوئی ایسا نمایاں تغیر واقع نہیں ہوتا جس سے ان کی آواز اس طرح بدل جائے۔

بیرونی اشتہارات

اب ہمدردِ صحت میں شائع کرائے جاسکتے ہیں

"بیرونی اشتہارات" سے مراد وہ اشتہارات ہیں جو ہمدرد دواخانہ اور اس کے مختلف اداروں سے علاوہ ہوں۔ چونکہ ہمدردِ صحت کے صفحات بڑھا دیے گئے ہیں اور مزید بڑھائے جاسکتے ہیں اس لیے ہمدرد دواخانہ کے علاوہ "بیرونی اشتہارات" کے لیے ہمدرد صحت میں گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ لیکن ہمدرد صحت میں وہی اشتہارات جگہ پاسکیں گے جن کے متعلق ادارے کو ان کی صحت کا اطمینان ہو جائے گا۔ سینما کے اشتہارات ہمدرد صحت میں نہیں لیے جائیں گے۔ لیکن تعلیمی اور علمی فلموں کے اشتہارات لیے جاسکیں گے۔ اُجرت بہر حال پیشگی لی جائے گی۔ اور نصف صفحے سے کم کا اشتہار نہیں لیا جائے گا

اُجرتِ اشتہار

اُجرت فی صفحہ فی بار ——— ایک سو رُپے

اُجرت ½ صفحہ فی بار ——— پچاس رُپے

ایک سال (بارہ صفحات) کا کنٹریکٹ کرنے کی صورت میں پانچ فی صد کمیشن وضع کیا جاسکے گا۔

نوٹ: ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی معرفت بھی اشتہارات لیے جاسکیں گے۔

ازراہِ کرم اس پتے پر خط و کتابت کیجیے:

بزنس منیجر ہمدردِ صحت۔ ہمدرد روڈ (رام باغ روڈ) کراچی ۱

ڈاکٹری کے متعلق صاف صاف باتیں

سٹر برنر میکفیڈن ۔ امریکا

ہماری جسمانی مشینری کی حیرت انگیز ساخت

ہر انسان کا جسم اپنے اندرونی خون، گوشت، پوست و استخواں سے بنی ہوئی ایک عجیب و غریب پیچیدہ نوعیت کی مشین رکھتا ہے — اس کی ترکیب و ساخت میں بلاشبہ پیچیدگیاں ہیں، اور ایسی پیچیدگیاں جو اس جدید ترین دَورِ ترقی تک کو چیلنج کر رہی ہیں۔

طبّی سائنس کے طالب علم یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں انھوں نے علم تشریح پڑھا اور انسانی مشینری کے متعلق انھیں سب کچھ معلوم ہو گیا، حالاں کہ دراصل یہ صورتِ حال نہیں ہے جسمانی ساخت میں بھی بہت سی ایسی چیزیں ہیں، جن کے متعلق ابھی تک کچھ نہیں معلوم کیا جا سکا، اور حرارتِ غریزی جسم انسانی میں کس طرح قائم رہتی ہے، خواہ گرم موسم ہو خواہ موسمِ سرما، موجودہ علم اور انسانی عقل اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

وقتاً فوقتاً ہمارے پاس ایسے شکایت نامے آتے رہتے ہیں جن میں ہمارے ڈاکٹری علاج پر اعتراضات و نکتہ چینیوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ (ڈاکٹر صاحبان) ہمارے اعتراضات پر تو ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ مگر اپنی اس میڈیکل سائنس کی خبر نہیں لیتے جو معالجے کے سلسلے میں ابھی تک کسی ایک نقطے پر قائم نہیں ہوئی۔ اس معاملۂ خاص میں ایک عجیب ابتری و پریشان خیالی ہے جو ملک میں چاروں طرف چھائی ہوئی ہے۔ میڈیکل سائنس کے مختلف گروپ اپنے اپنے نظریات کو لیے بیٹھے ہیں، اور ایک دوسرے کے خلاف اتنا شدید تعصب رکھتے ہیں کہ اکثر آپس میں لعن طعن کرتے رہتے ہیں۔

ہم دَواؤں کے مخالف نہیں بلکہ اس خاص طریقہ علاج کے مخالف ہیں

ہم نے انفرادی طور پر ڈاکٹروں پر کبھی تنقید نہیں کی۔ ہماری مخالفت تو جو کچھ بھی ہے، دواؤں سے علاج کرنے کے ان مخصوص طریقے سے ہے۔ ہم اسے کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ لوگوں کی صحتوں کے معاملے میں کاروباری اور تجارتی انداز میں سوچا جائے۔ یہ ایک جُرم ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ علاج کرنے میں غلطیاں نہیں ہوتیں ضرور ہوتی ہیں، اور ہر ایک سے ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر بھی انسان ہیں۔ ان سے بھی ہوتی ہیں۔ مگر ایک غلطی تو ایسی ہے جو انسانی دماغ سے چوک ہو جانے کی وجہ سے ہوتی ہے، اس پر تو کسی کا بھی بس نہیں اور ایک غلطی ایسی ہے جو غلط اور ٹیڑھا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے، تو ڈاکٹری کے معاملے میں ہمیں جو کچھ بھی شکایت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ اس نے راستہ ہی غلط اختیار کیا ہے۔ اور اب اس کے حاملین کے لیے اس راہ پر اتنی ترقی و پیش قدمی کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے طریقۂ علاج میں بنیادی تبدیلیاں کر ڈالیں۔ ڈاکٹری تعلیم کی تحصیل پر انھوں نے ایک خطیر رقم صرف کی ہے اور اب جس ڈھنگ پر وہ مطب کرتے ہیں اس کی آمدنی سے خود ان کا اور ان کے متعلقین کا پیٹ پلتا ہے۔

اس لیے مشکل یہ ہے کہ اگر وہ اپنی غلطی کو پا بھی لیں تو موجودہ صورت میں ان کے لیے سوائے اپنے مخصوص ڈگر پر چلنے کے کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے یا پھر ایسا کرنے پر آمادہ ہو جائیں کہ اپنی عمر بھر کی کمائی اصول کے خاطر قربان کردیں۔

ایلوپیتھک اَن سائنٹی فک ہے، اور غیر فطری ہے ہمارے نزدیک اس طریقۂ علاج کے بنیادی اصول اَن سائنٹی فک اور فطری اور طبعی قوانین سے موافقت نہیں رکھتے۔ سٹینڈرڈ ڈکشنری نے ایلوپیتھی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے، "یہ ایک ایسا طریقۂ علاج ہے کہ جس میں حالت مرض کو دور کرنے کے لیے نظام جسمانی میں ایک ایسی کیفیت پیدا کرنی پڑتی ہے جسے غیر طبعی کہنا زیادہ موزوں ہوگا" اگر ایسے طریقۂ علاج سے کام لیا جاتا جو ان طبعی قوتوں کے عین موافق ہوتا جو نظام جسمانی کی اصلاح و درستی خود اندر ہی سے کرتی ہیں اور ویکسین اور اسی قسم کی دوسری دواؤں سے اجتناب کیا جاتا تو میں نہیں سمجھتا کہ ایسے طریقۂ علاج پر کسی جہت سے بھی اعتراض کیا جاسکتا تھا۔ لیکن جب غیر طبعی محرکات کا کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے اور جلد کے ذریعے سے تیز اور زہریلی دوائیں پہنچا کر براہِ راست خون کے چشمے کو گدلا اور ناصاف کیا جاتا ہے تو پھر ہمیں بھی اعتراض کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

ایک ہی مریض کو دس بیماریاں بتائی گئیں "فزیکل کلچر" کو جاری کیے ہوئے ابھی چند ہی سال ہوئے تھے، میں نے ایک مریض کو (جس نے اپنی علامات مرض کو حفظ یاد کرلیا تھا) دس مختلف ڈاکٹروں کے پاس بھیجا۔ ان ڈاکٹروں کا خاص طور پر کسی سکیم کے تحت انتخاب نہیں کیا گیا تھا، بلکہ وہ شہر کے بڑے بازار کے ایک سرے سے چل کھڑا ہوا، اور راستے میں جو بھی مطب آیا اس میں چلا گیا۔ اس مریض نے دس مختلف ڈاکٹروں کو اسی ایک دن میں دکھایا اور ہر ڈاکٹر کے سامنے وہی علامتیں سنائیں جو اس نے حفظ کر رکھی تھیں۔ ان دسوں ڈاکٹروں نے علیحدہ علیحدہ دس بیماریاں تشخیص کیں اور علیحدہ ہی علیحدہ نسخہ بھی تجویز کیا —— دیکھا آپ نے! یہ ہے وہ میڈیکل سائنس جس کا اتنا شور و غوغا ہے۔

ہر چند ایلوپیتھک طریقۂ علاج میں اب دواؤں پر اتنا شدید زور نہیں دیا جاتا جیسا کہ پہلے تھا لیکن اب بھی بہت کچھ شعبدہ بازی اور "چھو منتر" کے طریقے رائج ہیں کہ ادھر دوا دی یا انجکشن لگایا اور اُدھر آرام ہوا۔ میرے علم میں بہت سے ایسے ڈاکٹر ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ان طریقوں پر جو ہمیں کالجوں میں پڑھائے جاتے ہیں، سختی سے عمل نہیں کرتے، بہت سے حالات میں عقل سلیم سے کام لے کر علاج کرنے میں شفا ہو جاتی ہے۔ اصل میں واقعہ بھی یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر جو اپنے آپ کو "عقل کل" سمجھنے کے بجائے ہمیشہ طالب علم سمجھتے ہیں، وہ اگر تجربے سے اپنے مخصوص طریقے کو غلط سمجھتے ہیں تو خواہ مخواہ اس سے چمٹے نہیں رہتے، بلکہ اسے چھوڑ کر دوسروں کے علم اور تجربے سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسے ہی معالجین سے مریض کو نفع پہنچتا ہے۔ ایسے ایلوپیتھک ڈاکٹروں پر ہم نکتہ چینی نہیں کرتے، بلکہ ہمارا اعتراض تو ان ڈاکٹروں پر ہے جو اپنے سامنے کسی دوسرے طریقے کو صحیح نہیں سمجھتے، اور جو کچھ انھوں نے دورانِ تعلیم میں حاصل کرلیا ہے، اسی کو "کل" سمجھ کر خود کو فاضلِ اجل سمجھتے ہیں۔

ذرا ایسے "عقل کل" ڈاکٹروں سے ہوشیار رہیے: "عقل کل" سے میری مراد وہ ڈاکٹر ہیں

جوہر اس چیز سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں جو ان کے نصاب تعلیم میں شامل نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے معالجین پر علم سائنس کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ شفایاب کرنے کا فن ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک مرتبہ جو نظریات قائم کر لیے گئے ہوں، ان میں پھر کوئی تبدیلی نہ ہو سکے۔ جیسے جیسے علم و سائنس ترقی کرتے جائیں گے، علم طب کے نظریات بھی بدلتے جائیں گے۔ ترقی یافتہ معالج وہ ہے جو حالاتِ زمانہ پر پوری پوری نظر رکھے۔ میں ایسے بہت سے معالجین کو جانتا ہوں جو محض دواؤں کی بوتلوں اور شیشیوں پر تکیہ نہیں کرتے۔ وہ مریضوں کے اصرار پر مناسب دوائیں بھی دیتے ہیں، مگر صحت یابی کے دوسرے مناسب حال طریقوں سے فائدہ اٹھانے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ بلکہ بہت سے تو محض نام اور ڈگری ہی کے ایلوپیتھک ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ علاج الامراض میں ان کے نظریات بالکل بدل چکتے ہیں۔ وہ فطرت کے اس راز کو پا لیتے ہیں کہ معالج تو اصل میں انسانی طبیعت ہے، اس لیے ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن سے طبیعت کو دفع مرض کے پورے پورے مواقع میسر آ جائیں۔

پانی کے استعمال میں تغافل بھی بسا اوقات امراض کا باعث ہوتا ہے

پانی کے استعمال میں تغافل بھی بسا اوقات متعدد امراض کا باعث ہوتا ہے تنفس، مساماتِ جسمانی، بول و براز اور غشائے مخاطی کے راستوں سے جو جسمانی سیالات نظام جسمانی سے خارج ہوتے ہیں ان کی مقدار روزانہ دو یا تین کوارٹ سے کم نہیں ہوتی۔ اس کے اخراج سے جسم میں سیالات کی جو ضرورت پیدا ہوتی ہے، ایلوپیتھک ڈاکٹری میں اس کے پورا کرنے پر کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ بعض اس قسم کی خامیوں کو دیکھ کر معالجین کا وہ طبقہ جو قدرتی طریق پر علاج کرنے کا قائل ہے یہ سمجھنے لگا ہے کہ ہم بہت جلد ان کی جگہ لے لیں گے۔ میرے نزدیک ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایلوپیتھک قائم رہے گی۔ مگر اس میں ایسی خوش گوار تبدیلیاں ہو جائیں گی جن سے وہ عملی دنیا پر چل سکے، وہ فاقہ، غذا، علاج بالماء اور ان سب دوسرے طریقوں کو قبول کریں گے جن میں دواؤں سے زیادہ تدبیر اور حکمت عملی سے کام لیا جاتا ہے۔ اب بھی بہت سے ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک ڈاکٹر ان طریقوں کو برت رہے ہیں جن کا پرچار ہم چالیس سال سے کر رہے ہیں۔ وہ اب سمجھنے لگے ہیں کہ نظام جسمانی کو فاسد مادّوں سے پاک کرنا نہایت ضروری ہے کہ اس سے مختلف امراض کی تکلیف دہ علامتوں کا بھی علاج ہو جاتا ہے۔

علاج الامراض میں پہلے اسباب کو دور کرو!

اس حقیقت سے تو آج کوئی ڈاکٹر بھی انکار نہیں کر سکتا کہ کسی مرض کا صحیح علاج آپ اسی وقت کر سکتے ہیں، جب آپ مرض پیدا کرنے والے اسباب کا کھوج لگا لیں۔ ہر شخص کی قدرتی و طبعی حالت یہ ہے کہ وہ تن درست ہو، اب اگر وہ بیمار پڑتا ہے تو یہ اس کی غیر طبعی حالت ہوگی اور اس کا کچھ نہ کچھ سبب ضرور ہونا چاہیے۔ اس لیے معالج کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ مرض کے اسباب کو دریافت کرے، تاکہ دفع مرض کے لیے وہ اسی کے مطابق مناسب مداوا کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی صحت کو بنانے والی تدابیر سے آپ بھی غفلت نہیں برت سکتے۔ تاکہ بیماری پیدا کرنے والے سارے ہی اسباب کا خاتمہ کر دیا جائے۔

اسباب مرض کو علی حالہ قائم رکھ کر محض علامات مرض کا علاج کرنا ہی سرے سے بنیادی غلطی ہے جو ڈاکٹر صاحبان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرض کا حملہ بار بار ہوتا ہے کبھی کسی شکل میں اور کبھی کسی صورت میں۔ کیونکہ محض علاماتِ مرض کو دبا ڈالنے سے مرض کا مادہ خارج نہیں ہوتا۔

ہماری عین خواہش ہے کہ ہم اُن سب لوگوں کے ساتھ بہ لحاظ طریقہ علاج رواداری برتیں جو بیماروں کے تن درست کرنے کا کام کرتے ہیں، بشرطیکہ وہ اپنے علم اور تجربے کے مطابق نہایت دیانداری کے ساتھ امکان بھر کوشش کریں ہمیں یقین ہے کہ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں جب ڈاکٹروں سے اس لیے رجوع کیا جائیگا کہ وہ لوگوں کی صحتیں قائم رکھیں، اس لیے نہیں کہ وہ بیماری کا علاج کریں۔ اب تو ڈاکٹر موت اور بیماری کے نام پر بہت کچھ کما لیتے ہیں، لیکن جب لوگ تن درست رہنے لگیں گے تو ڈاکٹروں کی آمدنی بھی کم ہو جائے گی، اور بہت ممکن ہے کہ اس کے ساتھ ہی ان کے تجارتی نقطۂ نظر سے علاج کرنے میں بھی فرق آجائے۔ یہ تجارتی ڈاکٹر ہی تو ہیں جو لوگوں کو وباؤں سے ڈراتے ہیں۔ یہ ہیں اصل سازشی! ان کے لیے ملک کے باشندوں کی زندگی اور صحت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میں کہتا ہوں انسانی صحت کی تجارت نہایت ذلیل قسم کی تجارت ہے، جس سے ایک دیانتدار معالج کو بچنا چاہیے۔

"سچائی کا سیرم"

اس کے عجیب اور غریب اثرات

البرٹ روتھ

"سچائی کا سیرم" (Truth Serum) سائنس کی ایک جدید دریافت ہے۔ اس کا نام اس لیے "سچائی کا سیرم" رکھا گیا ہے کہ اگر کسی شخص میں "یہ سیرم" بذریعہ انجکشن داخل کر دیا جاتا ہے تو وہ سچ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور جو باتیں اس کے دماغ میں چھپی ہوئی ہیں یا جنھیں وہ چھپانا چاہتا ہے، اُن کو ظاہر کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس ترکیب سے مجرموں کا اقبال جرم کرلینا آسان ہو گیا ہے۔ اگرچہ متمدن ممالک میں یہ فیصلہ نہیں کیا گیا ہے کہ اس دوا کی اثرات کی قانونی حیثیت کیا ہے، اور عدالتی کارروائی میں اس کو بہ طور "شہادت" تسلیم کیا جا سکتا ہے یا نہیں تاہم اس کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

اس "سچائی کے سیرم" کا نام "سوڈیم پنٹوتھل" (Sodium Pentothal) ہے۔ اس کو پچھلے دنوں شکاگو کے ایک ماہر معالجۂ دماغی (Psychiatrist) نے ایک شخص پر سچائی کا سیرم استعمال کیا تھا جو ایک نوجوان حسینہ کا قاتل تھا اور اس نے اس دوا کے زیر اثر اقبال کر لیا تھا۔

بہرحال اس مضمون کو اس جدید دریافت کے طبی پہلو سے تعلق ہے۔ یعنی ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دماغی امراض میں "سچائی کا سیرم" کس کس طرح مفید و کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ اوپر معالجۂ دماغی کے جس ماہر کا ذکر کیا گیا ہے ان کا نام ڈاکٹر رائے۔ آر۔ گرنکر ہے۔ انھوں نے اپنے رفیق کار میجر جے۔ آر۔ اسپیگل کے ساتھ مل کر "سچائی کے سیرم" کو خللِ اعصاب کے مرض میں استعمال کیا ہے اور امریکن ہوائی بیڑے کے مریضوں پر جانچا ہے۔ گرنکر اور اسپیگل نے اپنے اس عمل کو نارکو سینتھیسس" (Narcosynthesis) یعنی "بیہوش کر کے نفسیاتی تجزیہ کرنے" کا نام دیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ دورانِ جنگ میں جو معالجاتی ترقیاں ہوئی ہیں ان میں اس کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مریض کو "سوڈیم پنٹوتھل" بذریعہ انجکشن دے کر اس پر ایک ہلکی سی غنودگی طاری کر دی جاتی ہے۔

شکاگو کے ماہرین معالجۂ دماغی کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے "سچائی کے سیرم" کے طریق عمل اور جنگ کے مریضانِ اعصاب پر اس کے حیرت انگیز اثرات کو بہت صاف طور پر بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

> "مریض کو ایک نیم تاریک کمرے میں تنہا رکھا جاتا ہے اور اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم کو ایسا انجکشن دیا جائے گا جس سے تمھیں نیند آ جائے گی۔ اس کے بعد یہ دوا بازو کی ایک مخصوص رگ میں بہت ہی سست رفتار سے

سائمنہ داخل کی جاتی ہے یعنی صرف ½ گرام فی منٹ، اور مریض کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ۱۰۰ کے عدد سے پیچھے کی طرف شمار کرے یعنی ۹۸،۹۹ ، ۹۷ وغیرہ۔ جوں ہی اس شمار میں غلطیاں ہونے لگتی ہیں اور اس سے پہلے کہ مریض کو حقیقت میں نیند آجائے، انجکشن بند کر دیا جاتا ہے......

"تخدیر کی کافی سطح تک پہنچنے کے بعد بعض اشخاص خود بخود بولنا شروع کر دیتے ہیں، اور اگر مریض اپنے میدان جنگ کے تجربات بیان کرتا ہے تو مداخلت نہیں کی جاتی اور اسے بے تکلف بولنے دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض مریضوں کو زبانی حوصلہ افزائی یا محرکِ خیال اشارات کی ضرورت ہوتی ہے۔ مریض سے کہا جاتا ہے کہ تم میدانِ جنگ کی اگلی صفوں میں ہو اور پھر اس کے بعد ایک خیالی منظر اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ اس کے آس پاس گولے چل رہے ہیں، ایک گولہ ابھی ابھی اس کے قریب ہی گرا ہے، دشمن کے ہوائی جہاز اس کے سر پر پرواز کر رہے ہیں۔ اس کے پہلو کی طرف سے کوئی حملہ آور ٹینک آرہا ہے۔ اور اب اس کا فرض ہے کہ تمام واقعات بیان کرے

"اس زبانی حوصلہ افزائی یا تحریک کی مقدار مختلف مریضوں کے لیے مختلف ہوتی ہے۔ بعض پر صرف چند الفاظ کے بعد ہی ردعمل شروع ہو جاتا ہے اور وہ میدانِ کارزار کے تمام حالات نہایت وضاحت سے بیان کرنے لگتے ہیں۔ اور بعض مریض مختلف مدتوں تک متاثر نہیں ہوتے یا مدافعت کرتے ہیں۔ جب یہ مدافعت گہری اور دیرپا ہوتی ہے تو بیرونی تحریک کو حقیقی بلکہ ڈرامائی شکلوں میں پیش کرنا پڑتا ہے۔

"اس وقت خود ڈاکٹر کو ایک ساتھی سپاہی کا پارٹ ادا کرنا پڑتا ہے وہ خوف زدگی کی آواز میں مریض سے کہتا ہے کہ دیکھو تمھارے سر پر گولہ گرتا ہے تیزی سے سر جھکا کر پیٹ کے بل آگے بڑھ جاؤ۔ کبھی اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ تمھارا ایک ساتھی سپاہی بُری طرح زخمی ہو گیا ہے، اس کو اٹھانے میں مدد کرو۔ اس طرح کی باتیں سنتے ہی مریض فوراً تمام حقیقتیں بیان کرنے لگتا ہے"

ڈاکٹر گرنکر اس "سچائی کے سیرم" یعنی "سوڈیم پنٹوتھل" کے زیر اثر "نفسیاتی تجزیہ" کے چند دلچسپ واقعات بیان کرتے ہیں۔ بعض مریضوں پر اس کا ردعمل ایسا ہوتا ہے کہ وہ میدانِ کارزار کی تمثیل پیش کرنے میں خود اپنا پارٹ ادا کرنے لگتے ہیں۔ وہ بستر سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور کمرے میں ادھر اُدھر پھر کر کوئی "خندق" تلاش کرنے لگتے ہیں تاکہ جلد اس میں چھپ جائیں کبھی

اپنے کسی زخمی ساتھی کو تلاش کرتے ہیں، کبھی خوف زدہ ہو کر "غوطہ لگاتے ہیں" جیسے کوئی گولہ آرہا ہو یا اسی طرح کی دوسری حرکتیں کرتے ہیں جن کا تعلق جنگ کے کاموں سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گرنکر کہتے ہیں کہ مریض کی بعض حالتیں دیکھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مثلاً وہ دہشت زدگی جب کہ اس کے پہلو میں کوئی بم پھٹا ہو، یا وہ منظر جب کہ مریض کی آنکھوں کے سامنے کوئی سپاہی زخمی ہو کر گرا ہو اور تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو، یا یہ کہ ہوائی بمباری ہو رہی ہو اور اس کو چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ملتی ہو۔ مریض کا جسم بہت سخت اور بے لوچ ہو جاتا ہے۔ اس کے اعضا میں شدید تناؤ پیدا ہوتا ہے، آنکھیں پھیل جاتی ہیں، پتلیاں کشادہ ہو جاتی ہیں، بدن پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے ہاتھوں میں تشنج کی سی حرکت پیدا ہوتی ہے جیسے وہ کوئی حربہ تلاش کر رہا ہو۔ بعض وقت اس کے جذبات اتنے شدید اور گہرے ہو جاتے ہیں کہ وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ بستر پر گر پڑتا ہے اور چند منٹ تک بالکل خاموش ہو جاتا ہے، اور کبھی کبھی پھر اپنا افسانہ زیادہ پرسکون طریقے پر بیان کرنے لگتا ہے۔"

بعض مریض بار بار کسی خاص واقعہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کے زخمی ہونے کا مختصر مگر ہولناک منظر، وہ چند باتوں کے بعد پھر اسی بات کی طرف لوٹتے ہیں، جیسے کہ ٹوٹے ہوئے گراموفون ریکارڈ پر چلتی ہوئی سوئی ایک ہی جگہ پر آکر بار بار رکتی ہے۔ ایسے حالات میں مریض کو تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد دوبارہ "نفسیاتی تجزیہ" کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی اسے ایک سے زیادہ مرتبہ سچائی کا سیرم دیا جاتا ہے اور ہر مرتبہ اس کے دماغ میں چھپے ہوئے یا دبے ہوئے واقعات کے نئے نئے ٹکڑے حاصل کیے جاتے ہیں۔

راقم تحریر نے خود کئی مرتبہ "سوڈیم پنٹوتھل" کے ذریعے دماغی مریضوں کا علاج ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ واشنگٹن کے سینٹ الیزابتھ ہسپتال میں، جو دماغی و نفسی امراض کے علاج کے لیے ایک سرکاری ادارہ ہے۔ میں نے دو آدمیوں پر اس عمل کے مخصوص اثرات کا مطالعہ کیا ہے۔ دونوں کا یہ حال تھا کہ وہ بالکل خاموش تھے۔ نہ کچھ بات کرتے تھے اور نہ سوال کا جواب دیتے تھے۔ ایک مریض تو اپنے ماحول ہی سے بالکل بے خبر تھا۔ ڈاکٹر نے جو دماغی علاج کا ماہر تھا، دونوں میں سے ہر ایک کو مذکورہ بالا دوا کا انجکشن آہستہ آہستہ دیا۔ مریض پر غنودگی سی حالت طاری ہو گئی، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہلے سے زیادہ بشاش اور مستعد بن گیا ہے۔

اس کے بعد انجکشن بند کر دیا گیا اور ڈاکٹر نے نرمی کے لہجے میں سوالات کرنے شروع کیے۔ میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کہ وہی مریض جو چند منٹ پہلے بالکل گم سم اور خاموش تھا، اپنی نیند بھری آواز میں نہایت صفائی سے جواب دینے لگا۔ گویا اس کے دماغ کے بند دروازے کھل گئے۔

"پنٹوتھل" اور "ایمیٹل" (Amytal) دونوں دواؤں کو ایسے مریضوں کے لیے مفید پایا گیا ہے جو نسیان میں مبتلا ہو گئے ہوں اور یہ بھی یاد نہ رہا ہو کہ وہ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں،

(بقیہ صہ ۳۰ پر)


ایسے حسین رخسار
جن سے خون ٹپکتا معلوم ہو
شربت
اکسیر
خاص
SYRUP
IKSIR
KHAS
FORMULA
Hamdard
DELHI (INDIA)
شربت اکسیر خاص (رجسٹرڈ) سے بن سکتے ہیں
تن درست اور جوان رہنا آپ کا فرض ہے
ہمدرد دواخانہ، دہلی

اپنے حافظے کو "یاد رکھنے کے کرتب" سکھائیے

کیا آپ کو باتیں یاد نہیں رہتیں ؟ کیا آپ چیزوں کو کہیں رکھ کر بھول جاتے ہیں یا اپنے ارادوں کو فراموش کر دیتے ہیں ؟ کیا آپ کو نسیان کی بیماری یا عادت سی ہو گئی ہے ؟ کیا آپ جو چیز یاد رکھنا چاہتے ہیں اس کی حالت بقول غالبؔ یہ ہو جاتی ہے کہ ؎

وہ اک گل دستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یاد رکھنے کا عمل دشوار نہیں بلکہ آسان ہے۔ تاہم اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا حافظہ اچھا رہے اور صحیح خدمات انجام دے، تو آپ کو یہ سمجھنا پڑے گا کہ حافظہ اپنے فرائض کس طرح ادا کرتا ہے۔ سب سے پہلے اس سلسلے میں چند غلط فہمیوں کا دور کر دینا ضروری ہے۔

(۱) کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جو لوگ ذہین ہوتے ہیں ان کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کا حافظہ بھی اچھا ہو۔ یہ خیال غلط ہے۔ جرمنی کے ڈاکٹر کارل منجر نے اپنی تقریباً پوری زندگی انسانی دماغ کے متعلق تحقیقات میں صرف کر دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر وہ شخص جو معقول ذہانت رکھتا ہے، اچھا حافظہ بھی رکھتا ہے۔ اگر اسے یہ خیال ہو کہ میرا حافظہ ناقص ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے حافظے کے استعمال کا صحیح طریقہ معلوم نہیں کیا ہے۔

(۲) ایک خیال یہ ہے کہ مردوں کا حافظہ عورتوں سے زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے، اور سائنٹی فک جانچوں کے ذریعے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔

(۳) خیالات کو ایک نقطے پر جمانے سے کسی بات کے یاد رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے، اس سے حافظے کے عمل میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ دماغ کو آرام و سکون کی حالت میں رہنے دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی بات کو یاد رکھنا یا نہ رکھنا صرف دو چیزوں پر منحصر ہے۔ ایک نقش (Impression) کی گہرائی، دوسرے رابطہ یا تلازم (Association) کی قوت۔

کسی چیز کا جتنا گہرا نقش آپ کے دماغ پر ہوگا اتنی ہی زیادہ وہ چیز آپ کو یاد رہے گی۔ مزید برآں آپ اس وقت تک کوئی چیز یاد نہیں رکھ سکتے جب تک کہ وہ کسی دوسری چیز سے "وابستہ" اور متعلق نہ ہو یا رابطہ و تلازم نہ رکھتی ہو۔

آپ کو اگر یہ یاد نہیں ہے کہ آپ کی عینک کہاں ہے، تو اس کا سبب صرف یہی ہے کہ عینک کو رکھتے وقت آپ نے اس امر کا "خیال" نہیں کیا کہ آپ اسے کہاں رکھ رہے ہیں۔ جس وقت آپ اپنی عینک کو اپنی میز کی کسی دراز کے گوشے میں کاغذات کے نیچے ڈال دیتے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ

آپ کو یہ بھی چاہیے کہ اس عمل کا ایک "دماغی نوٹ" تیار کرلیں۔ اس سے آپ کے حافظے کو دو نوں آسانیاں حاصل ہو جائیں گی۔ پہلے تو اس کو یہ موقع ملے گا کہ اس واقعہ کا ایک نقش یا ریکارڈ تیار کرلے دوسرے یہ کہ "عینک" اور "میز کی دراز" اور "کاغذات والے گوشے" کے درمیان ایک رشتہ اور رابطہ قائم کرلے۔ بعد میں جس وقت آپ کو عینک کی ضرورت ہوگی، آپ کا حافظہ فوراً ایک ترتیب دکھائیگا پہلے تو عینک کی تصویر بنائے گا، پھر اس کے بعد دراز اور کاغذات اس کے سامنے آجائیں گے۔

اگر آپ اس اصول کو یاد رکھیں گے تو پھر آپ کوئی چیز کسی جگہ پر رکھ کر بھول نہ جائیں گے یا کسی شخص کے نام کو فراموش نہیں کریں گے۔ مثلاً جب کسی نئے آدمی سے آپ کی ملاقات ہو تو اس کے نام کی طرف "توجہ" رکھیں۔ اس کے نام سے اسے چند بار مخاطب کریں۔ مثلاً یوں باتیں کریں کہ "رشید صاحب! میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں" "رشید صاحب! آپ کی بات ...... کا جواب یہ ہے" "ہاں تو رشید صاحب! آپ کا یہ فرمانا بجا اور درست ہے" وغیرہ وغیرہ۔ نام کو اس طرح مکرر زبان پر لانے کا اثر یہ ہوگا کہ دماغ پر اس کا "نقش" گہرا ہوگا۔ اس کے بعد اس نام کا کسی جگہ یا چیز یا کسی دوسرے شخص کے نام سے واسطہ یا رابطہ اپنے دماغ میں قائم کرلیں۔ ایسی حالت میں بھولنے کا امکان باقی نہیں رہے گا، یا کم سے کم ہو جائے گا۔

بہت سے لوگ جو کچھ پڑھتے ہیں اسے یاد رکھنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔ اس کے دو سبب ہیں۔ یا تو ان کو اس مطالعے سے اتنی دل چسپی نہیں ہے کہ جو کچھ پڑھیں اس کی طرف توجہ دیں، یا یہ کہ وہ موضوع یا بحث کو اچھی طرح سمجھتے ہی نہیں۔ ان دونوں حالتوں میں یاد رکھنے کا فعل بھی عبث ہی ہوگا۔ لیکن جو چیز آپ پڑھ رہے ہیں اگر آپ اسے سمجھتے بھی ہیں اور یاد بھی رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی طرف اپنے خیال کو متوجہ کیجیے، اس کی اہمیت پر غور کیجیے، اور یہ تصور پیدا کیجیے کہ دوسرے متعلقہ موضوعات سے اس کا کیا رشتہ ہے بلکہ یہ کوشش کیجیے کہ خود آپ کی ذات اور اس کتاب کے معانی و مطالب کے درمیان کوئی تعلق پیدا ہو جائے اس کے بعد آپ اس کو کبھی نہ بھولیں گے اس لیے کہ آپ اس سے چند در چند رابطہ پیدا کر چکے ہوں گے۔

اگر آپ کسی بات کو مستقل طور پر حافظے میں رکھنا چاہتے ہیں تو ایسی یادداشت تیار کرنے کا بہترین وقت وہ ہے جب کہ آپ رات کو سونے کے لیے بستر پر لیٹتے ہیں۔ سائنٹی فک ذرائع سے جانچ کرنے کے بعد یہ ثابت ہوا ہے کہ نیند سے پہلے آپ جن خیالات کو دماغ میں "جذب" کر لیتے ہیں وہ کم از کم تیس فی صدی زیادہ موثر طور پر یاد رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ "ناکام وقت" صبح کا وقت ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب کسی امر کا گہرا خیال کرنے اور اس کی یادداشت تیار کرنے کے بعد آپ سو جاتے ہیں، تو اس خیال کے "جمنے" اور اس کے نقش کی تعمیر ہونے کے لیے کافی وقت مل جاتا ہے۔ اور جب آپ کسی خیال یا ارادہ یا مطالعہ کے بعد روزمرہ کے کاموں کی سرگرمیاں شروع کر دیتے ہیں تو غیر متعلقہ خیالات اور تجربات ایک دوسرے کے بعد اور تہ بہ تہ جمع ہوتے رہتے ہیں اور پہلے خیال کے قائم رہنے یا جمنے میں رکاوٹ ڈال دیتے ہیں۔

اگر آپ کوئی بات بھول جائیں تو یہ خیال نہ کریں کہ آپ کو مرض نسیان لاحق ہو گیا ہے۔ دنیا میں جس شخص کا بہتر سے بہتر حافظہ ہوتا ہے وہ بھی کبھی نہ کبھی چوک جاتا ہے اور کوئی بات بھول جاتا ہے۔ مزید برآں صرف حافظے پر بہت دور تک اور حد سے زیادہ اعتبار کرنا بعض حالات میں خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً ایک عورت نے اپنے سونے ہوئے بچے کو بستر پر لٹا کر کمرے کا "گیس ہیٹر (آلۂ حرارت) کھول دیا تھا تاکہ کمرہ گرم ہو جائے، اور یہ ارادہ کیا تھا کہ چند منٹ کے بعد پھر گیس کو بند کر دے گی۔ مگر اس اثنا میں وہ ایک ناول پڑھنے میں اس قدر منہمک ہو گئی کہ گیس بند کرنا بھول گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گیس سے بچے کا دم گھٹ گیا اور وہ مر گیا۔

"حافظے کا بیمہ"

خوش نصیبی سے ایک ایسی ترکیب بھی ہے جسے "حافظے کا بیمہ" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ چوں کہ اس ترکیب کو کام میں لانے سے خود بہ خود خیالی رابطہ اور تلازم پیدا ہو جاتا ہے اس لیے یہ آسان بھی ہے اور یقینی بھی۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ لیجیے۔ آپ رات کو سونے کے لیے بستر پر جاتے ہیں۔ یکایک آپ کو کسی خاص کام کا خیال آتا ہے جسے صبح ہوتے ہی انجام دینا ضروری ہے۔ آپ کے لیے سب سے آسان صورت یہ ہے کہ آپ اپنے پلنگ کے پاس پڑے ہوئے سلیپروں کو اس طرح رکھ دیں کہ ایک سلیپر دوسرے سلیپر کے اندر آ جائے۔ اب جب آپ صبح کو اٹھیں گے اور سلیپروں میں پیر ڈالنا چاہیں گے تو آپ کا دماغ ایک فوری کرتب دکھائے گا۔ اس کے سامنے یہ سوال آئے گا کہ ایک سلیپر دوسرے کے اندر کیوں گھسی ہوئی ہے۔ پھر ایک برقی تیزی کے ساتھ آپ کا حافظہ اس کا جواب دے گا اور آپ کو اپنا ضروری کام یاد آ جائے گا۔

یہ طریقہ ہمیشہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ ایک دوسری مثال لیجیے۔ شام کو جب آپ اپنی موٹر کار گراج (موٹر خانہ) میں داخل کرتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ پٹرول کا خزانہ تقریباً خالی ہے، اور اگر آپ سویرے پٹرول خریدنا بھول جائیں گے تو گاڑی راستے میں کہیں پر دھوکا دے دے گی۔ اس موقع پر بھی آپ کو سلیپروں کی قسم کا کوئی کرتب عمل میں لانا ہوگا۔ آپ پورے "اسٹیرنگ وہیل" پر ایک بڑا سا کپڑا لپیٹ دیں یا چابی کے سوراخ میں کپڑا ٹھونس دیں۔ پھر آپ صبح کو قریب ترین "پمپ اسٹیشن" سے پٹرول ضرور خرید لیں گے۔

اسی طرح بعض آدمی آئندہ کسی بات کو یاد کرنے کے لیے اپنے جیبی رومال (دستی) کے ایک گوشے میں بڑی سی گرہ ڈال لیتے ہیں۔ اس سے صحیح وقت پر ان کا حافظہ کرتب دکھاتا ہے اور بات یاد آ جاتی ہے۔ اوپر کے بیان کردہ واقعے میں جو عورت گیس بند کرنا بھول گئی تھی، اس کے لیے بہترین صورت یہی تھی کہ وہ اپنے سامنے ایک کرسی یا اسٹول الٹ کر رکھ دیتی۔ اگرچہ الٹی ہوئی کرسی ایک مضحکہ انگیز صورت پیدا کرتی مگر حافظے کو کام میں لانے کے لیے یہ ترکیب یقیناً کامیاب ثابت ہوتی اور بچے کی جان بچ جاتی۔

(باقی صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ فرمائیے)



گھر میں، ہسپتال میں، سفر میں اور
شکار میں بھی ہمدرد مرہم ساتھ رکھنا
ضروری ہی، ہر حادثے کے وقت
کام آنے والا ہی، ہر تکلیف کو
رفع کرنے والا ہی۔
خالص نباتی چیز ہی،
اسے ہمدرد ـــــ بناتا ہی
HAMDARD OINTMENT
ہر جگہ ملتا ہی ـــــ آج ہی خرید کر اپنے پاس رکھیے

شکر کی صفائی

آج سے تقریباً ایک صدی پہلے مغرب میں شکر کی صفائی (Sugar Refining) کے لیے مغربی ممالک میں جانوروں کا خون استعمال کیا جاتا تھا۔ مشرق میں اور خصوصاً متحدہ ہندوستان میں شکر کو شفاف اور چمکیلی بنانے کا رواج ہی نہ تھا، اور جو دانہ دار چینی یہاں کے بازاروں میں ملتی تھی وہ زیادہ تر جاوا وغیرہ سے آتی تھی، جہاں شکر سازی کے ڈچ کارخانے تھے۔ ہندوستان کی "دیسی شکر" مشہور تھی جسے "سفید کھانڈ" کہتے ہیں۔

اب تکلفات اور نفاست پسندی کی ترقی کے باعث (جو اکثر حالتوں میں مخرب صحت ہے) دانہ دار چینی کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے، اور جدید سائنس نے شکر کی صفائی کے لیے جانوروں کے خون کی جگہ نئے نئے ذرائع اور مخصوص مشینری پیدا کر دی ہے۔ شکر سازی کے کارخانہ میں آج آپ دیکھیں گے کہ "ویکیوم پین" (Vaceum Pan) یعنی ہوائی خلا پیدا کرنے والے بڑے بڑے ظروف "برودت آفریں سرنگیں" اور بہت سے دوسرے لوازم موجود ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہر کارخانے میں ایک لیبورٹری بھی ہے جو جانچ اور تحقیقات کا کام کرتی رہتی ہے۔ کچھ دنوں سے دانہ دار چینی کے علاوہ شفاف "کیوب شوگر" (شکر کے مکعب ٹکڑے) بھی تیار کیے جاتے ہیں جن کو نفاست پسند سوسائٹی چائے میں ڈالتی ہے۔ انگلستان میں شکر سازی کا سب سے بڑا کارخانہ دریائے ٹیمز کے شمالی ساحل پر ہے۔ جہاں زیادہ تر دوسرے ممالک سے آئی ہوئی خام شکر اور کچھ انگلستان میں پیدا کی ہوئی چقندر کی شکر کو صاف بنا کر دانہ دار شفاف چینی میں تبدیل کیا جاتا ہے۔

بہت کم لوگ ان جدید پیچیدہ طریقوں سے واقف ہیں جو کچی شکر کو دانہ دار چینی یا مکعب ٹکڑے بنانے میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ شکر کی صفائی کے ہر جدید کارخانے میں "لیبورٹری" ایک "کنٹرول روم" کا کام دیتی ہے۔ صاف کرنے کے ہر واحد عمل سے پہلے اور دوران میں اور بعد میں شکر کے تمام نمونوں کی جانچ پڑتال ہوتی ہے، اور ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے، اور انھی سے درج شدہ ریکارڈ کے مطابق صفائی کے نازک ترین مرحلے طے کیے جاتے ہیں۔

تمام علاقوں کے گنّوں کی کچی شکر ایک جیسی نہیں ہوتی۔ بعض کے اجزا بھی مختلف ہوتے ہیں کسی میں کثیف مادّے زیادہ ہوتے ہیں اور کسی میں کم۔ بعض کا میلا پن آسانی سے دور کیا جا سکتا ہے، بعض کی صفائی کے لیے شدید جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ ایکھ اور چقندر کی شکر کی صفائی کے طریقے الگ الگ ہیں۔ لیبورٹری کے ماہرین کیمیا ان تمام نکتوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور صفائی کے ہر عمل کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ فیکٹری میں جتنی چیزیں استعمال کی جاتی ہیں وہ بھی پہلے ان کی جانچ سے گزرتی ہیں۔ یہاں تک کہ کاغذ اور کارڈ بورڈ کے جن ڈبوں میں تیار شدہ شکر رکھی جاتی ہے وہ بھی اچھی طرح جانچ لیے جاتے ہیں۔ الغرض جہاز جنگ کے فوجی ہیڈ کوارٹر کی طرح

لیبورٹری کو شکر کی صفائی کی تمام منزلوں اور کارخانے کی ہر نقل و حرکت اور عمل کی تفصیلی کاروائیوں پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔

صفائی کے عمل کی مختلف منزلوں کو دیکھیئے۔ کیمیا دانوں کی جانچ اور تجزیہ کے بعد کچی شکر ذخیرے کے "ایک سقفی دروازے" سے نیچے کی طرف گرائی جاتی ہے۔ یہ شکر ایک حرکت کرنے والی بڑی پٹی پر گرتی ہے، اور اسی کے ذریعے کارخانے کے اس حصے تک پہنچ جاتی ہے جسے صنعتی اصطلاح میں "لائم اینڈ" (Lime End) یعنی "چونے والا سرا" کہتے ہیں۔ یہاں صفائی کا ابتدائی عمل ہوتا ہے، اور چینی ایک ایسی شکل اختیار کرتی ہے جسے "براؤن لیکر" یا صاف "فلریٹ" (Filerate) کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو کام ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حرکت کرنے والی بڑی پٹیاں کچی شکر کو لے جا کر بڑی بڑی بالٹیوں میں ڈال دیتی ہیں اور یہ بالٹیاں اس شکر کو لمبی لمبی ٹنکیوں میں گرا دیتی ہیں، جہاں اسی عمل کے ساتھ خام شربت کا چھڑکاؤ بھی ہوتا رہتا ہے۔ یہ شربت اس راب کو جو شکر کی قلموں سے لپٹی ہوئی ہوتی ہے، نرم کر دیتا ہے، اور اب ایک ایسا مرکب پیدا ہو جاتا ہے جسے "میگما" (Magma) یعنی قطیر کہتے ہیں۔

اب اس "میگما" کو آگے بڑھا کر سنٹری فیوگل مشینوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ ان مشینوں میں دھات کے بنے ہوئے بڑے بڑے سوراخ دار ٹوکرے ہوتے ہیں جو انتہائی تیزی سے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "سنٹری فیوگل" قوت کے ذریعے ٹوکروں کے سوراخوں سے "شربت" باہر نکل جاتا ہے، اور اندر شکر کی ایک "دیوار" رہ جاتی ہے، جس سے لپٹا ہوا شربت پانی کی ایک تیز دھار سے دُھل جاتا ہے۔

اب سوراخ دار ٹوکروں میں وہ شکر ہے جسے اصطلاح میں (Affined) شکر یعنی چینی سے رشتہ یا مشابہت رکھنے والی شکر کہا جاتا ہے۔ اس کا رنگ اصل کچی شکر سے ہلکا ہوتا ہے، اور صفائی بھی بڑھ جاتی ہے، لیکن ابھی ان میں سنگ ریزوں یا ریت کے ذرات یا مٹی یا ایکھ کے ٹکڑوں وغیرہ کے موجود ہونے کا امکان ہوتا ہے، اس لیے ان کو نکال دینا ضروری ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے شکر کو بڑے بڑے ٹنکوں میں جو بھاپ سے گرم کیے ہوئے ہوتے ہیں، اور جن کو "میلٹرز" (Melters) کہتے ہیں، پانی میں حل کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس شکر کا اصطلاحی نام (Raw Liquor) یعنی "خام سیال" ہو جاتا ہے۔

اب اس خام سیال کو صاف کرنے کے لیے "چھاننے" اور "مقطر" کرنے کا عمل کام میں لایا جاتا ہے۔ اس کی چھلنی دھات کی ایک بہت بڑی چادر ہوتی ہے جس میں بہت باریک سوراخ ہوتے ہیں، اس سے تمام کثافتیں الگ ہو جاتی ہیں، اور اس کے بعد بہت باریک تقطیر کے ذریعے اس سیال کو مزید صاف کیا جاتا ہے، پھر اس چھانے ہوئے مقطر سیال کو چونے کے پانی سے مدبّر کر کے گاڑھا بنایا جاتا ہے، اور "کاربن آمیز" بنانے والی ٹنکیوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہاں کاربن ڈائی اوکسائڈ گیس کے بلبلے پیدا کیے جاتے ہیں، اور چونکہ سیال پر چونا چھایا ہوا ہوتا ہے اس لیے وہ کھریا مٹی جیسے

رسوب کی شکل اختیار کرلیتا ہے، اور اس میں باقی کثافتیں لپٹی ہوئی ہوتی ہیں۔

اسی منزل پر پہنچ کر "شکر کی صفائی" کا اصل کام شروع ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ بھی حیرت انگیز اور قابلِ دید ہوتا ہے۔ ابری رنگ کا یہ سیال اب شدید دباؤ والے فلٹروں (آلۂ تقطیر) سے بذریعہ کعب گزارا جاتا ہے۔ ہر مکعب میں ایک تار کی جالی ہوتی ہے جس میں بہت باریک بنے ہوئے پچاس سوتی گول ٹکڑے تہ بہ تہ لگے ہوتے ہیں، اور جب سیال پر دباؤ ڈالا جاتا ہے تو اس کے گزرنے کے لیے ان کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ الغرض جو بھدے اور بھورے رنگ کا سیال مادہ ان فلٹروں میں پمپ کیا جاتا ہے وہ چمکتی ہوئی محلول شکر کی صورت میں خارج ہوتا ہے، اور کھریا مٹی اور باقی کثافتیں فلٹروں میں رہ جاتی ہیں۔

یہ چمکیلا شفاف سیال "شامپین" شراب کی طرح ہلکے رنگ کا ہوتا ہے۔ اس رنگ کو خارج کرنے کے لیے سیال کو اسطوانی شکل کے حوضوں میں سے جو کئی ٹن وزنی ہڈیوں کے کوئلوں سے بھرے ہوتے ہیں، گزارنا پڑتا ہے۔ یہ سیال ان کوئلوں کے باریک مسامات کے ذریعے کئی کئی گھنٹوں تک مقطر ہوتا رہتا ہے اور اس کا رنگ جب ان میں جذب ہو جاتا ہے تو "سیلنڈروں" سے بیس فٹ نیچے، یہ پانی جیسا صاف اور بے رنگ ہو کر نکل آتا ہے۔

تیاری کی اس منزل تک شکر سیال حالت میں رہتی ہے۔ اس کے بعد "ویکیوم پین" یعنی خلا پیدا کرنے والے ظروف کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان برتنوں کا مقصد یہ ہے کہ سیال کو جوش دینے کے بعد اس میں سے عنصر مائی کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں باہر نکال دیا جائے تاکہ اس محلول سے شکر قلموں (Crystals) کی صورت میں خارج ہو جائے۔ لیکن اس شکری سیال کو اُبالنا اور جوش دینا معمولی کام نہیں ہے۔ یہ ایک نازک مرحلہ ہے جو ماہرین کی نگرانی میں طے ہو سکتا ہے۔ اگر درجۂ حرارت میں ذرا بھی نقص ہو گا تو چینی کا رنگ بھورا ہو جائے گا۔ اگر سیال کو ظروف میں داخل کرنے کی رفتار میں فرق آئے گا تو "دانوں" کی جسامت میں بھی فرق آ جائے گا۔ اگر کنٹرول کے آلات غلط لگا دیے جائیں گے تو شکر کے دانے یکجا ہو کر اور آپس میں مل کر برف کے تودوں کی شکل اختیار کرلیں گے۔ اس عمل کے دوران میں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ مشینیں رکنے نہ پائیں یعنی سیال اوپر سے آتا رہے اور نیچے کی مشینوں کو مسلسل طور پر مخصوص مقدار میں ملتا رہے۔ ان "ظروف" کی جسامت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ انگلستان کی "ٹاٹے اینڈ لائل" فیکٹری میں صرف ایک "اُبال" میں ۳۰ سے ۴۰ ٹن چینی تیار ہو جاتی ہے۔

یہ صاف سیال عنصر مائی سے پاک ہونے کے بعد ظروف میں شکر کے دانوں کے ایک تودے کی جیسے "ماسی" (Masse) کہتے ہیں، اور جس میں شربت کا تھوڑا سا باقی حصہ موجود ہوتا ہے، شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے بعد دانہ دار چینی کی تیاری میں ایک اور منزل پیش آتی ہے، یعنی شکر سے شربت کو الگ کرنے کے لیے پھر "سنٹری فیوجل مشینیں" کام میں لائی جاتی ہیں، اور شربت کی علیحدگی کے بعد چینی کی ایک سفید دیوار سی بن جاتی ہے، جسے "گرینولیٹرز" (Granulators) یعنی دانے بنانے

والے ظروف میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ گرینولیٹرز عمودی شکل کے ڈھول ہوتے ہیں جو بڑی تیزی سے چکر لگاتے ہیں۔ اس کے بعد اس میں سے شکر ایک گرم پائپ سے گزرتی ہوئی نہایت صاف و شفاف، اور خشک و سخت قلموں کی شکل میں باہر آجاتی ہے، یعنی دانہ دار چینی بن جاتی ہے۔

مکعب شکر: شکر کے مکعب ٹکڑوں کی تیاری ایک مختلف اور زیادہ ماہرانہ عمل کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے "ویکیوم پین" اپنے تودۂ شکر کو خاص سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ ان میں سے ہر سانچہ تقریباً ۲۴ سلیاں بنا دیتا ہے جن کو "برودت آفریں سرنگوں" میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ ۲۴ گھنٹے تک ایک ہی ساتھ تقریباً سات سو سانچوں کی "پیداوار" ٹھنڈی ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعد سلیاں ایک صاف سیال سے دھو ڈالی جاتی ہیں۔ پھر ان کو گرم ہوا والے کمروں سے گزارا جاتا ہے جہاں یہ خشک اور سخت ہو جاتی ہیں۔ اب مشینوں کے ذریعے ان سلیوں کے چھوٹے چھوٹے مکعب ٹکڑے کاٹ لیے جاتے ہیں۔

یہ تو گویا شکر کی صفائی کا مختصر افسانہ ہے، لیکن ظاہر ہے کہ مختلف قسم کی چینیاں بنانا اور کارخانے کو آرگنائز کرنا، اور ملازموں کا تقرر اور تنظیم، اور لیبوریٹری کے ماہروں کی فراہمی، اور پورے کارخانے کی نگرانی اور کارکردگی کے لیے اسٹاف کا کنٹرول وغیرہ ایک خاص قسم کی ماہرانہ سرگرمی کا طالب ہوتا ہے۔

(رسالہ فوڈ مینوفیکچر کے شکریہ کے ساتھ)

(بقیہ ص ۳۹ "سچائی کا سیرم")

اور کیا کر رہے تھے؟ "یہ سچائی کا سیرم" دوسری عالمگیر لڑائی کے فوجی کاموں اس لیے بھی استعمال کیا گیا ہے کہ جو سپاہی رخصت لینے کے لیے بیماری کا بہانہ کرتے ہوں، اُن کی حقیقت معلوم کر لی جائے۔

پچھلے دنوں اس "سیرم" کا حیرت انگیز استعمال سنہ ۱۹۴۲ء میں سنگ سنگ قیدخانے میں دو بھائیوں پر کیا گیا جو نیویارک کے ایک شخص کو قتل کرنے کے جرم میں ماخوذ تھے۔ قیدخانے کے ڈاکٹر نے ان کو "سوڈیم امیٹل" اور بنزیڈرین سلفیٹ" کا مرکب انجکشن کے ذریعے سے دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے قتل کے تمام واقعات من و عن بیان کر دیئے اور اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ بعد میں عدالتی کارروائی کے بعد دونوں بھائیوں کو پھانسی دی گئی۔

"سچائی کے سیرم" کے زیرِ اثر جو بیانات دیے جاتے ہیں، ان کو عدالتوں میں قانونی شہادت کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اس کے استعمال کے سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے، یعنی سوال یہ ہے کہ کوئی طبیب کبھی کسی دوا یا ذریعہ علاج کو مریض کے معالجے کے سوا کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟ یا کسی طبیب کا یہ عمل اخلاق کے معیار پر پورا اترے گا کہ وہ اپنے طبی ذرائع کو بیماروں کے علاج کے علاوہ مجرموں کی جانچ کے لیے استعمال کرے؟

(بقیہ ص ۴۴ "اپنا حافظہ یاد رکھنے کے کرتب سکھلائیے")

اس بات کا آپ ہمیشہ خیال رکھیے کہ اگر آپ کے پاس معمولی ذہانت کی کمی نہیں ہے تو قوتِ حافظہ کی بھی کمی نہیں ہو سکتی۔ آپ کا فرض یہی ہے کہ اپنے حافظے کو کام میں لانے کا طریقہ سیکھیں۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ جو کچھ آپ نے اس مضمون میں پڑھا ہے اگر اسے یاد رکھیں گے، تو آپ کو "بھول جانے" کی شکایت بہت کم ہوگی۔


ہمدرد
ہیئر آئل
ہمدرد کوسمیٹکس
کراچی

فلسطین میں پھلوں کی کاشت

مسٹر ایرک آر ڈی، ایف، زیڈ، ایس

"مشرقِ قریب" اور بحیرۂ روم کے آس پاس کے ممالک میں فلسطین اچھے صحت بخش اور خوش ذائقہ پھلوں کے لیے بہت مشہور ہے۔ اب وہاں پھلوں کی پیداوار بہت بڑھا دی گئی ہے اور یہ انڈسٹری اتنی ترقی کر گئی ہے کہ پھلوں کا کاروبار اور پھلوں کی بڑی مقدار برآمد کرنے کے اعتبار سے فلسطین کا درجہ بحیرۂ روم کے ممالک کی صفِ اوّل میں ہے۔ چوں کہ گزشتہ جنگ کے اثرات نے اسپین اور اٹلی کو پیچھے ڈال دیا ہے اس لیے جنگ کے بعد فلسطین کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اور اس ملک میں انار، انگور، بادام، خوبانی، سیب، انجیر، زیتون، سنترے اور خربوزے کی کاشت کو بہت زیادہ ترقی دی گئی ہے۔ پھلوں کے علاوہ روغنِ زیتون اور نمک سائیدہ خلیا ریں بھی بڑی مقدار میں دوسرے ممالک کو بھیجے جاتے ہیں۔

اس مضمون میں فلسطین کی اس نفع بخش کاشت کاری اور کاروبار پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ (ہمدردِ صحت)

یروشلم کی زرعی وزارت نے بہتر پھلوں کی کاشت کی ترقی کے لیے آٹھ ریسرچ اسٹیشن قائم کیے ہیں، جہاں پھلوں کی نئی نئی نسل اور گرم ممالک کے پھلوں کی نئی نئی قسمیں پیدا کرنے کے لیے تحقیقات کی جاتی ہے، اور ان کی کاشت و پیداوار کے مسائل پر غور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہودیوں کی "ایجنسی" کے علاقے میں بھی مقام رہووآت پر ایک بڑا ریسرچ اسٹیشن موجود ہے، جو اس صنعت کی تمام شاخوں پر غور کرتا ہے، اور مختلف یہودی نو آبادیوں کے لیے پھلوں کی فراہمی کا کام بھی کرتا ہے۔

گورنمنٹ کے ریسرچ اسٹیشنوں میں ماہرین کے زیرِ نگرانی طریقۂ باغبانی اور بڑی بڑی اراضی فصلوں کی پیداوار کے کاموں کے متعلق ہر وقت تحقیقات جاری رہتی ہے۔ ان میں انار، انگور، کھجوریں، زیتون اور معتدل گرم ممالک کے پھل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جیریکو میں ایک ریسرچ اسٹیشن ہے، جو خاص طور پر انگور، کیلے، اور کھجور کی کاشت پر ماہرانہ مشورے دیتا ہے۔

فلسطین میں تین قسم کے "میلن" (Mellon) ہوتے ہیں۔ تربوز، میٹھے خربوزے جن کا رس "شہد و شبنم" کے مشابہ ہوتا ہے، اور "گرمک" (Cantaloup) اوّل الذکر کے لیے کسی بڑے برآمدی (ایکسپورٹ) بازار کی توقع نہیں کی جاتی ہے۔ موخرالذکر کی مانگ سب سے زیادہ ہے۔ اب وہاں اناروں کی کاشت بھی بہت ترقی کر گئی ہے، اور ناصریہ، ایکر، "تلکرام" اور حیفہ کے قریب و جوار میں بڑے پیمانے پر انار کی فصل ہوتی ہے۔ فلسطین سے سنہ ۱۹۳۰ء میں سب سے پہلے برطانیہ کو انار بھیجے گئے۔

ہر پھل کو الگ الگ باریک کاغذ میں لپیٹا گیا تھا، اور لکڑی کے باریک "اون" کے اندر انھیں بکسوں میں رکھا گیا تھا۔ یہ ایک امتحانی برآمد تھی جس کے نتائج زیرِ غور تھے۔ چونکہ یہ انار توڑنے کے وقت پورے پکے ہوئے تھے اس لیے راستے میں خراب ہونے لگے۔ ناکافی پیکنگ نے انھیں مجروح بھی کیا، اور کیڑوں کے حملوں سے بھی یہ محفوظ نہ رہے۔

انگور اور انجیر:

یروشلم، راملا، بیتھلیہم اور ایکر کے علاقوں میں بہترین انگوروں کی کاشت کی ایک خاص انڈسٹری ہے۔ "سفطی" "نسل" کے مشکبو انگوروں کو ڈبوں میں بند کر کے بھی بھیجتے ہیں۔ اور جو انگور بچ رہتے ہیں ان کو خشک کر کے کش مش بنائی جاتی ہے۔ فلسطین میں انگوروں کا "جام" (مربّی) بھی کثرت سے بنایا جاتا ہے۔ اور اب امید کی جاتی ہے کہ انگور کا "افشردہ" بھی برآمدی تجارت کے لیے تیار کیا جائے گا۔

فلسطین میں انجیر کی بہت نفیس قسمیں ہوتی ہیں۔ اور ان مختلف قسموں کی کاشت عربوں کے دیہات میں اور پہاڑی علاقوں میں کی جاتی ہے۔ دمشق کی خوبانیوں کی طرح ایک خاص قسم کی انجیر ہے، جسے تجارت کے لیے ڈبوں میں بند کرتے ہیں۔ اور مزید برآں گوندیا مادا بنا کر بسکٹوں کے اندر بھرتے ہیں۔ انجیر کی فصل کا بہت بڑا حصہ برآمدی تجارت کے لیے خشک کیا جاتا ہے، اور جزیرہ سمرنا کے مشہور انجیروں کے مقابلے میں دوسرے ممالک کو بھیجا جاتا ہے، فلسطین میں سمرنائی نسل کے انجیر بھی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی مگر یہ کوشش بارآور نہ ہوئی۔

نرم گودے والے پھل:

فلسطین میں خوبانی کی کاشت بھی کثرت سے ہوتی ہے، اور ان پھلوں کو ہسپانوی اور فرانسیسی پھلوں کے مقابلے پر دوسرے ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔ خوبانیاں جب گہرے سنہرے رنگ کی ہوتی ہیں تو انکو ڈبوں میں بند بھی کیا جاتا ہے۔ بالخصوص "امریکی" اور "مسقطی" قسموں کی خوبانیاں ڈبوں میں بند کر کے باہر بھیجی جاتی ہیں۔ اور بازاروں میں ان کا مقابلہ کیلی فورنیا، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کی ان خوبانیوں سے ہوتا ہے جو ڈبوں کے اندر شیرے میں رکھی جاتی ہیں۔ خوبانی کے گودے کو آئس کریم بنانے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور دمشق میں اس کا مربّہ بڑی مقدار میں فروخت ہوتا ہے۔

آڑو اور بیر کم مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی پیداوار اتنی نہیں ہے کہ ڈبوں میں بند کرنے والی صنعت (Canning Industry) کے لیے ان کو کام میں لایا جا سکے۔ اس لیے بیری کی کاشت روزافزوں ترقی کر رہی ہے۔

بادام:

فلسطین میں بادام کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے لیکن بعض جنوبی علاقوں میں بادام کے باغوں کو سنترے کے باغوں میں مبدل کر دیا گیا ہے۔ شمالی علاقوں میں کیڑے اس کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں۔ بالعموم فلسطین کے باداموں کے چھلکے سخت ہوتے ہیں۔ لیکن پیداوار کا تقریباً ½ حصہ کاغذی یعنی نرم چھلکے والے باداموں پر مشتمل ہے۔ "یونانی" قسم کے بادام زیادہ اور "کوٹریہ" قسم کے بادام

تقریباً ۴۰ فی صدی ہوتے ہیں۔ اوران کی مانگ دمشق اور مصر کے بازاروں میں زیادہ ہے۔
یوروپین بازاروں کے لیے صرف مغز بادام کی مانگ زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے فلسطین کو اٹلی اور مراکش کے باداموں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، جہاں اس میوے کی پیداوار کثرت سے ہوتی ہے لیکن فلسطین کے بادام زیادہ لذیذ اور میٹھے ہوتے ہیں۔ جنگ سے قبل فرانس میں یہ اچھے داموں بکتے تھے۔ اب انھیں امریکا ہندوستان و پاکستان اور چین بھی بھیجا جانے لگا ہے۔

سنترے، لیموں، چکوترے:

قدیم روایات کی رُو سے سنترے کا درخت ہندوستان سے براستہ عُمان ایک ہزار سال پہلے فلسطین لایا گیا تھا، لیکن مقامی مٹی اور پانی نے اس کے ذائقے اور خوشبو میں تبدیلی پیدا کر دی۔ "وینشیا" قسم کے علاوہ سنتروں کی تین قسمیں فلسطین میں پیدا کی جاتی ہیں۔ شامی۔ بلدی۔ فرانسیسی۔ اول الذکر ایک جدید قسم کا سنترہ ہے، جو جافا اور اس کے قرب وجوار کے سنترے سے بہت ملتا جلتا ہے۔ فلسطین میں عام طور پر سنترے کو "پرتگال" کہتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سولھویں صدی میں پرتگال کے تاجروں نے ہندوستان کے میٹھے سنترے کی کاشت اپنے ملک میں کی تھی، اور وہاں سے وہ یورپین ممالک کو سترھویں صدی میں بھیجتے تھے۔

فلسطین میں لیموں بھی غالباً ترش سنتروں کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ بارھویں صدی میں ایک یہودی طبیب نے لیموں اور اس کے فوائد پر ایک مکمل رسالہ تصنیف کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مصر اور فلسطین اور شام میں لیموں کی کاشت زمانہ قدیم سے ہوتی ہے۔ اور چکوترے وغیرہ امریکا اور چین کے بعد داخل کیے گئے۔ اب فلسطین کے سنترے اور "میٹھے لیموں" وغیرہ برطانیہ اور امریکا کو کافی مقدار میں بھیجے جاتے ہیں۔ اوران کی روانگی منحصر ہے ایسے جہازوں کی دست یابی پر جن میں "تبرید" کے آلات اور کمرے ہوتے ہیں اب فلسطین گورنمنٹ کے ڈائرکٹر زراعت مسٹر الیف، آر، میسن نے اطلاع دی ہے کہ ریسرچ اسٹیشن کے ڈاکٹر ٹومکنس نے سنتروں کو موم کاغذ میں لپیٹ کر بھیجنے کا طریقہ ایجاد کیا ہے، جس سے دوران سفر میں سنترے خراب نہیں ہوتے۔

پھلوں کی بیماریاں اور کیڑے وغیرہ:

ڈاکٹر ریچرٹ نے جو زرعی ریسرچ اسٹیشن میں نباتی امراض کے ماہر ہیں اُن بیماریوں اور دُوسری خرابیوں کی ایک فہرست تیار کی ہے جو ٹرانسپورٹ کے دوران میں سنتروں، چکوتروں اور لیموں وغیرہ کو لاحق ہو جاتی ہیں۔ اس سے پہلے ایکسپورٹ اور پیکنگ کے تمام مسائل پر غور کیا گیا تھا۔ ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ سنترے وغیرہ جب ساحل سے ہلکی کشتیوں میں لاد کر جہاز تک بھیجے جاتے ہیں تو سمندر کے پانی کے چھینٹوں سے خراب ہو جاتے ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے علاوہ جہاز پر سنتروں کو رکھنے کی جگہ کا ٹمپریچر وغیرہ بھی دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔

پچھلے دنوں ایک دوسری صورت حال یہ پیدا ہوگئی کہ ان نازک پھلوں کے باغوں کی عمر جوں جوں زیادہ ہوتی جا رہی ہے ان پر کیڑوں کے حملے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ان میں بحیرۂ روم کی "پھلوں والی مکھیاں"

(بقیہ صفحہ ... پر ملاحظہ)

ہیرنگ مچھلیاں پکڑنا اور فروخت کے لیے تیار کرنا

برطانی ساحلوں کی ایک نفع بخش تجارت!

ہیرنگ مچھلیاں پکڑنے کے متعلق اس مضمون سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ برطانیہ اپنی غذائی حالت اور ساتھ ساتھ تجارت کو مستحکم تر بنانے کے لیے کس طرح کوشاں ہے۔

اگر برطانیہ اور ہندستان (ہندوپاکستان) کا موازنہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ جزائر برطانیہ کی آبادی اس برعظیم کی آبادی کا محض ایک جزو ہے۔ برطانیہ صنعتی ترقیوں کے لحاظ سے اس نقطۂ عروج پر ہے کہ اس کے لیے غیر ممالک سے فراہمی غذا کا سوال زیادہ پیچیدہ نہیں۔ اس کے مقابلے میں اس برعظیم کی روز افزوں آبادی ارباب فکر کے لیے ایک مستقل توجہ طلب مسئلہ بنتی جا رہی ہے۔ قومی معیشت کا ۹۰ فیصد انحصار زراعت پر ہے اور زراعت کے جو طریقے عام طور پر اختیار کیے جاتے ہیں وہ بھی ایسے نہیں ہیں جن پر اطمینان کیا جا سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندستان (ہندوپاکستان) اپنی ضروریات کے مطابق غلہ پیدا نہیں کر سکتا، اور خاص کر جنگ عظیم کے اثرات مابعد کے علاوہ ہندستان کی تقسیم، انتقال آبادی، پنجاب اور دہلی کے وحشیانہ کشت و خون، فصلوں کی تباہی اور لاکھوں انسانوں کی خانماں بربادی نے پاکستان اور ہند کی غذائی حالت بہت نازک کر دی ہے۔ لیکن قدرت بھی کس قدر ستم ظریف ہے کہ برطانیہ جس کی غذائی حالت ہندستان کی طرح نازک اور خطرناک نہیں، وہ تو وسائل غذا کی فراہمی کے نت نئے سائنٹفک طریقے اختیار کر رہی ہے، لیکن ہندوپاکستان جن کے سر پر غذائی مشکلات کا عفریت اپنی پوری ہیبت ناکیوں کے ساتھ مسلط ہے، اب تک خواب غفلت میں گرفتار ہیں۔ ہمارے برعظیم کا ساحل ہزاروں میل طویل ہے اور سمندروں میں ہر قسم کی مچھلیاں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اگر پاکستان و ہند کے ارباب اختیار ماہی گیروں کی صنعت کو جدید طریقوں پر سرانجام دینے کا تہیہ کر لیں تو دونوں ملکوں کو فراہمی غذا کا ایک نیا غیر محدود ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔

انڈین یونین نے تو اس جانب کچھ توجہ شروع بھی کر دی ہے۔ بمبئی اور مغربی بنگال کی حکومتوں نے مرکزی حکومت کی امداد سے ٹرالروں کے ذریعے ماہی گیری کی اسکیم مرتب کر لی ہے۔ ٹراونکور میں ریاست کی زیر سرپرستی ماہی گیری کا ایک نیا ادارہ قائم ہوا ہے، اور کلکتہ میں بھی ایک کمپنی نے جزائر انڈمان کے سواحل پر جدید طریقوں سے ماہی گیری شروع کر دی ہے، لیکن حکومت پاکستان اس اہم مسئلے کی جانب سے

اب تک غافل ہے، حالانکہ بحیرۂ عرب اور خلیج بنگال کے سواحل پر اس کے لیے
صنعت مذکور کو ترقی دینے کے وسیع ذرائع موجود ہیں۔ ہم نے مانا کہ حکومتِ پاکستان
نے ماہی گیری کے متعلق ایک مستقل شعبہ قائم کر رکھا ہے، لیکن ہم یہ معلوم کرنا چاہتے
ہیں کہ اس محکمے نے پیشہ ور ماہی گیروں کی حوصلہ افزائی کرنے، انھیں ضروری
معلومات بہم پہنچانے اور صنعت ماہی گیری کو سائنٹفک سانچے میں ڈھالنے کے
لیے اب تک کیا قدم اٹھایا ہے۔ پرانی طرز کی ماہی گیری ہمارے قومی درد کا مداوا نہیں
بن سکتی۔ پیشہ ور ماہی گیر اب تک کشتی نوح کی جن یادگار کشتیوں سے کام لینے کے
عادی رہے ہیں وہ چوں کہ موسمی شدائد اور سمندر کی طوفانی لہروں کا مقابلہ نہیں
کر سکتیں، لہٰذا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ماہی گیری کا سلسلہ صرف سازگار موسم ہی تک
محدود رہتا ہے، اور سال کے باقی حصوں میں ہمارے ماہی گیر بے کار رہتے ہیں۔
اگر حکومت پاکستان فہم و تدبر سے ناآشنا نہیں ہے اور صنعت ماہی گیری کو صدق
دل سے ملک کی غذائی مشکلات کے ازالہ کا ایک مفید ذریعہ بنانا چاہتی ہے تو
اسے لازم ہے کہ اپنی سرگرمیوں کو محض ایک محکمہ کے کاغذی قیام تک محدود نہ رکھے
بلکہ اس کے لیے عملی قدم اٹھائے۔ ضرورت ہے کہ دقیانوسی طرز کی مروّجہ کشتیوں کے
بجائے جدید طرز کی آہنی کشتیاں اور ٹرالر وغیرہ فراہم کیے جائیں، اور مچھلیوں کی
اقسام و عادات کا مطالعہ کرنے کے لیے باقاعدہ ریسرچ شروع کر دی جائے۔ (ہمدرد صحت)

ماہی گیری کی مختلف قسموں میں "ہیرنگ" مچھلیاں پکڑنے کی "صنعت" نے اس فقدان غذا کے
زمانے میں اہل برطانیہ کے لیے قابلِ قدر اور تغذیہ بخش غذا بہم پہنچانے میں بڑی مدد کی ہے، اور ایک نفع بخش
تجارتی مال کی حیثیت سے کافی مقدار باہر بھی بھیجی ہے۔ چوں کہ جنگ کے بعد ماہی گیروں کو ان کی کشتیاں
واپس کر دی گئی ہیں، اور اب ماہی گیری پر کوئی پابندی نہیں ہے، اور تجارتی ماہی گیری کا پیشہ کرنے والے
پھر اس کام کی طرف واپس آ گئے ہیں، اس لیے برطانیہ میں یہ صنعت پھر قبل از جنگ کی سطح کے قریب
پہنچ گئی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ جس زمانے میں زیادہ غذائیں بازار میں موجود رہتی ہیں اور سستے داموں پر
ملتی ہیں، اس کے مقابلے میں موجودہ غذائی کمی نے مچھلیوں کے ملکی استعمال میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔
ماہی گیری کے صنعتی حلقے کا خیال ہے کہ وہ زمانہ پھر واپس آ سکتا ہے جب بازار پیداواروں سے بھر جائیں گے
قیمتیں گر جائیں گی، اور کساد بازاری کے باعث بے روزگاری پیدا ہو گی۔

ماہی گیری کے کاروبار میں روایتی طور پر یہ صورتِ حال اکثر پائی جاتی ہے کہ وقتی طلب کی گرم
بازاری اور پھر کساد بازاری سے مچھلی کی قیمتوں میں نشیب و فراز پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ماہروں نے یہ تسلیم بھی
کر لیا ہے کہ اس انڈسٹری میں "چانس" یعنی اتفاق کا عنصر زیادہ تر غالب رہتا ہے۔ گہرے پانی میں مچھلیوں
کے گزرنے کے مخصوص راستے اور ہر جھنڈ میں مچھلیوں کی کثرت یا قلت معلوم کرنا، اور پھر فیصلے کا اتنا
صحیح ہونا کہ ان جھنڈوں کو جال میں پکڑ لیا جائے، یہ ایسے موضوعات ہیں جن کے لیے اب تک صحیح

سائنٹی فک کنٹرول کا کوئی طریقہ معلوم نہیں کیا گیا ہے کسی حد تک صرف روایات اور افسانوں اور عقائد سے اس انڈسٹری کی رہنمائی ہوتی ہے۔لیکن اب یہ عقیدہ مضبوط ہو رہا ہے کہ تمام دوسری جدید صنعتوں کی طرح یہ صنعت بھی سائنٹی فک اصول پر چلائی جاسکتی ہے۔

گرم بازاری اور کساد بازاری کے عناصر:

حکومتِ برطانیہ نے جو "ہیرنگ انڈسٹری بورڈ" قائم کیا تھا اس کا مقصد یہی تھا کہ اس مخصوص صنعتِ ماہی گیری کو پوری ترقی دینے کی کوشش کرے، اور اس نظریہ کو تسلیم کرکے کہ یہ سائنٹی فک کنٹرول میں لائی جاسکتی ہے اس کے تمام مسائل پر غور اور عمل کرے۔گزشتہ زمانے میں یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہیرنگ مچھلیوں کے تجارتی میدان سے گرم بازاری اور سرد بازاری کے عناصر کو نہیں خارج کیا جاسکتا۔مگر اب ایسا نہیں کہا جاسکتا۔بورڈ کی پالیسی یہ ہے کہ ان مچھلیوں کی پیداوار بھی پوری ہو اور مانگ بھی پوری ہو۔بورڈ کو یقین ہے کہ یہ دونوں مقاصد حاصل ہوسکتے ہیں یعنی زیادہ سے زیادہ پیداوار اور زیادہ سے زیادہ فروخت۔اس طرح ایک ہی موسم میں گرم بازاری اور کساد بازاری کے جو عناصر پائے جاتے ہیں ان کو خارج کیا جاسکتا ہے۔

اصل مسائل:

ہیرنگ انڈسٹری کی ترقی کی راہ میں مندرجہ ذیل مسائل رکاوٹ بنے ہوئے ہیں:۔

(۱) یورپ کے دوسرے ممالک میں اس کی مانگ کی کمی، جس کا سبب یہ ہے کہ ان میں اقتصادی نیشنلزم ترقی کر رہا ہے، اور اس کے علاوہ ان کی طاقتِ خرید میں کمی ہوگئی ہے۔

(۲) ہیرنگ مچھلیوں کی فراہمی میں کمی، و، زیادتی، جس سے قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔

(۳) یہ انڈسٹری ایسے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی "اکائیوں" یعنی مختلف واحد جماعتوں پر مشتمل ہے جو جداگانہ مقاصد رکھتے ہیں، اور دُور دُور پر مختلف علاقوں میں رہتے ہیں۔ان میں اس کے علاوہ کوئی چیز مشترک نہیں ہے کہ سب کے سب ہیرنگ مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں۔

(۴) جنگ کے باعث بہت سی چھوٹی جماعتوں کا ختم ہو جانا۔تازہ سرمایہ کی کمی اور منظم سائنٹی فک ریسرچ کا فقدان۔

جنگ کے ختم ہونے کے بعد "ہیرنگ انڈسٹری بورڈ" نے جس کا ہیڈ کوارٹر اڈنبرگ میں ہے اور جس میں محکمہ زراعت و ماہی گیری اور ہوم آفس اور چیمبر آف کامرس کے نامزدہ تین ماہرین شامل ہیں عملی ترقی کا ایک بڑا پروگرام پیش کیا ہے۔اور یہ بھی اس صنعت کی خوش نصیبی ہے کہ یہ کام ایسے وقت میں شروع کیا گیا ہے جب کہ ہیرنگ مچھلیوں کی مانگ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔یہ بورڈ اس بنیادی نظریہ پر کام کر رہا ہے کہ اس کی مجموعی پیداوار اور اس کے ذریعے مجموعی آمدنی جتنی بڑھ جائے گی، اسی قدر یہ صنعت ترقی و خوش حالی کی طرف بڑھے گی۔یہ نظریہ ترک کردیا گیا ہے کہ مانگ اور قیمت کو بڑھانے کے لیے پیداوار محدود کردی جائے۔پہلے چوں کہ نکاس کے راستے کم تھے، اس لیے پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی پالیسی پر عمل نہیں کیا گیا۔اب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ نکاس کے راستے بڑھائے

اور فروخت کے لیے نئے نئے بازار پیدا کیے جائیں۔

نکاس کی راہیں اور پیداوار کی مقدار:-

بورڈ نے اپنے قیام کے وقت سے اپنا پہلا مقصد یہ رکھا تھا کہ ہیرنگ مچھلیوں کی فروخت کا بازار وسیع تر کرنے کے لیے سائنس اور تجربات کے ہر طریقے کو استعمال کیا جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بورڈ نے ماہی گیری کو ترقی دینے اور ہیرنگ مچھلیوں کی پیداوار بڑھانے کے متعلق تحقیقات اور نئے نئے تجربات شروع کر دیے ہیں۔ ان دونوں مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے بہت سے افراد اور جماعتوں نے اپنا تعاون پیش کیا ہے۔

"سریع انجماد" (Quick Freezing)

اس بورڈ نے ان ساحلی علاقوں میں جہاں ہیرنگ مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں سنہ ۴۵-۱۹۴۴ء میں مچھلیوں پر "سریع انجماد" کا عمل کرنے کے لیے مشینیں نصب کی تھیں، ان مشینوں کے ذریعہ ۱۹۴۶ء میں مچھلیوں کی ایک بڑی مقدار تیزی سے منجمد کی گئی۔ اس عمل تبرید و انجماد کا نتیجہ یہ ہوا کہ چار پانچ ماہ بعد بھی جو ہیرنگ مچھلیاں جنوبی انگلستان کے دکان داروں تک پہنچیں وہ بالکل تازہ حالت میں تھیں اور خریداروں نے موسم کے بہت دنوں بعد ان کو ایسی اچھی حالت میں پاکر بہت پسند کیا۔

ضمنی پیداوار:

چند سال سے بورڈ "ہیرنگ آئل" (تیل) اور "ہیرنگ میل" (سفوف) کی طرف بھی توجہ کرتا ہے اور اسے یقین ہے کہ ان چیزوں کی فروخت کے لیے بھی ایک وسیع بازار پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے بھی مشینری اور آلات کام میں لائے جا رہے ہیں۔ اور مچھلیوں کی "فصل" (ہارویسٹ) میں ہیرنگ مچھلیوں کی فاضل مقدار کو کھتیوں (Pits) میں رکھنے کے طریقے اختیار کیے گئے ہیں تاکہ "روغن ساز" اور "سفوف ساز" کارخانوں کی مشینیں بے کار نہ ہو جائیں۔ بورڈ نے ابھی ان کاموں کے متعلق تفصیلات پیش نہیں کی ہیں۔ وہ ابھی وزارت غذا کے ساتھ مشوروں میں مشغول ہے۔ اور اس نے یہی ارادہ ظاہر کیا ہے کہ ان ضمنی پیداواروں کی سپلائی بھی زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے گی۔

"کیننگ" اور "مارکیٹنگ":

"کیننگ" (ٹین کے ڈبوں میں بند کرنا) اور "مارکیٹنگ" (یعنی فروخت کے لیے بازار پیدا کرنا) یہ دو کام ایسے ہیں جو دوسری صنعتوں کی طرح ہیرنگ انڈسٹری میں بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈبوں میں بند کرنے سے پہلے مچھلیوں کو صاف کرنا، ان میں نمک ملانا اور ان کو دھوئیں کے ذریعہ خشک کرنا اور دوسرے چند ابتدائی کام ضروری ہوتے ہیں، جن سے ہیرنگ مچھلیوں کو ایک معیاری غذا بنایا جا سکتا ہے۔ ان کاموں کے لیے اور پھر مچھلیوں کو پیک کرنے اور بند کرنے کے لیے جدید قسم کی مشینریاں استعمال کی جا رہی ہیں اور مچھلیوں کو بہترین حالات میں بازاروں تک پہنچانے اور ان کے لیے نئے نئے بازار فراہم کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ الغرض اس صنعت کو تمام سائنٹفک اور فنی اعتبارات سے ایک مکمل انڈسٹری بنایا جا رہا ہے۔


AKHLAQ

ہماری غذائیں

دودھ

اور اس سے بنی ہوئی چیزیں

(حکیم اقبال حسین ایم، اے ، رکن ادارہ)

دودھ سے ہماری غذائی ضرورتیں ہی پوری نہیں ہوتیں۔ بلکہ اصلاح جسم کے لیے بھی اس کا استعمال غایت درجہ مفید ثابت ہوا ہے۔ بعض معالجین تو بہت سی بیماریوں کا علاج دودھ ہی سے کرتے ہیں، اور بطور دوا اس سے بہت زیادہ مفید کام لے لیتے ہیں۔ مثلاً جسم پر گوشت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے دُودھ کی غذا سب سے بہتر ثابت ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ دودھ کی اور بھی معالجاتی افادیتیں ہیں۔ اس کا آزادانہ استعمال چونے اور کیلشیم کی کمی کی وجہ سے جو عوارض لاحق ہو جاتے ہیں، انھیں رفع بھی کر دیتا ہے اور آئندہ کے لیے ان بیماریوں کے امکان کو بھی ختم کر دیتا ہے۔

گائے کا دُودھ نہایت خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ اس کا استعمال نہ صرف عمر، حافظہ اور جسمانی قوت کو بڑھانے والا ہے بلکہ صنفی غدد کی رطوبات کی پیدائش میں بھی مدد دیتا ہے۔ اس کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ بعض لوگوں کے لیے ذرا قابض ثابت ہوتا ہے۔

بھینس کا دودھ اس سے ذرا زیادہ بھاری اور میٹھا ہوتا ہے۔ گائے کے دُودھ کے مقابلے میں اس میں دُہنیت اور چکنائی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اِس کے کثرتِ استعمال سے نیند زیادہ آتی ہے اور بھوک کم ہو جاتی ہے۔ بعض لوگوں کو اس کے استعمال سے دست آنے لگتے ہیں۔ بے خوابی کی شکایت میں رات کو سونے سے پہلے ایک پیالی گرم دودھ نہایت مفید نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تنفس اور غذا کی نالی میں تیزابیت کی وجہ سے جو سوزش اور جلن ہو جاتی ہے، اس کو بھی اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔

بکری کا دُودھ شیریں، سرد اور قابض ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی مقوی، مشتہی اور ہاضم بھی ہوتا ہے۔ تپِ دق، کھانسی، اسہال مزمن اور بچوں کی قے میں نہایت نفع بخش ثابت ہوا ہے۔ ضیق النفس اور قصبی دمہ کے علاج میں بھی بکری کا دودھ تجویز کیا جاتا ہے۔ اگر بکری کو چالیس روز تک برابر آکھ کے پتے کھلائے جائیں تو اس کے بعد اُس کا دُودھ دیوانگی اور پاگل پن کے علاج میں نہایت درجہ مفید ثابت ہوا ہے۔

بھیڑ کا دُودھ نمکین، گرم اور روغن لیے ہوتا ہے اور اسی وجہ سے دیر ہضم ہوتا ہے۔ بالوں کی نشوونما کے لیے تجویز کیا جاتا ہے۔ سوزاک، بادی اور ریاحی تکلیفوں میں اس کا استعمال غایت درجہ نفع بخش ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ اس کے زیادہ استعمال کرنے والے کو تنفس اور آنکھ کے کسی عارضے میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ زبان، ہونٹ اور مسوڑھوں پر بھی زخم ہو جاتے ہیں۔

گھوڑی کا دُودھ تیزابیت لیے ہوئے، نمکین، مقوی و مسکن ہوتا ہے۔ یہ ہاتھ پیروں کی انگلیوں کی گٹھیا میں بہت مفید ثابت ہوا ہے۔

گدھی کا دودھ نمکین اور زود ہضم ہوتا ہے۔ یہ عام جسمانی کم زوری اور پیشاب کی کمی میں نہایت مفید نتائج کا حامل ہے اور کھانسی اور خرابی جگر کی شکایات میں، خاص طور پر بچوں اور بوڑھوں میں اس کا استعمال بہت زیادہ عام ہے۔ مزمن قصبی ورم اور تپ دق میں بھی اس کے استعمال کی سفارش کی جاتی ہے۔

اونٹنی کا دُودھ ہلکا شیریں مگر قدرے نمکینی لیے ہوتا ہے۔ یہ ملین ہوتا ہے اور استسقاء، ضیق النفس اور خنازیری حالت میں مفید ہوتا ہے۔ اسے عام التہابی کیفیت، سرطان، بواسیر، کرم امعاً اور جلدی شکایات میں غایت درجہ مفید بتایا جاتا ہے۔

ہتھنی کا دُودھ مٹھاس لیے ہوئے ذرا قابض ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی عضلاتِ جسم کو بنانے، فربہ کرنے اور طاقت بخشنے میں بھی مشہور ہے۔ لطف یہ ہے کہ صبح کا دوہا ہوا دُودھ بھاری، قابض اور بارد ہوتا ہے، اور شام کا نکالا ہوا دودھ، آنکھوں کی شکایات، گٹھیا اور تھکن کے لیے بہت مفید بتایا جاتا ہے۔

انسان کا دُودھ، ہلکا، بارد، مقوی اور جسم کو پرورش کرنے والا ہے۔ اطباء اسے آنکھ اور ناک دھونے کے لیے بھی تجویز کرتے ہیں۔ آنکھوں کی جملہ شکایات میں اس کا سر پر ملنا مفید بتایا جاتا ہے۔ دق اور ضیق النفس جیسی دیر میں آرام ہونے والی بیماریوں میں تو اسے اکسیر بتاتے ہیں۔ اطباء قدیم نے بھی اس کی بڑی تعریف کی ہے چینی تو پھیپھڑے کے مریضوں کو عورتوں کی چھاتیوں سے براہِ راست دودھ پلاتے ہیں۔ فرانس میں بوڑھے اور صنفی کم زوری میں مبتلا نوجوانوں کے لیے نوجوان اور تن درست عورتوں کا دودھ تجویز کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہاں تو انسان کا دودھ بوتلوں میں بھی فروخت کیا جاتا ہے، لیکن بہتر اور مفید تر یہی سمجھا جاتا ہے کہ مریض براہِ راست چھاتی سے منہ لگا کر دودھ پیئے۔

مکھن، نباتی روغنوں سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا ہے، اس لیے کہ اس میں وہ سب حیاتین ہوتے ہیں جو دُودھ میں پائے جاتے ہیں۔ گائے کے دودھ کا مکھن مفرح قلب، محرک، مقوی اور ہاضم ہوتا ہے۔ لال کھنڈ ملا کر اسے تپ دق، بواسیر، مزمن پیچش اور لقوے کے مریضوں کو استعمال کراتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں بھینس کے دودھ کا مکھن مٹھاس لیے ہوئے قابض، بارد، مسکّن اور مولد منی ہے۔

بکری کے دودھ کا مکھن، مفرح قلب اور ہاضم ہوتا ہے۔ نزکھانسی اور دق میں بھی مفید ہے۔

مٹھا یا چھاچھ، دُودھ کی نسبت زیادہ جلد ہضم ہوتی ہے۔ یہ قدرے قابض تو ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ ٹھنڈی، زود ہضم، اور مقوی غذا ہے جس میں حیاتین ج بھی ہوتا ہے۔ یہ نظام ہضم کی جملہ شکایات کے لیے بہت اچھی دوا کا کام کرتی ہے اور خاص طور پر جب کہ بخار بھی ہو۔ ان لوگوں کے لیے جنھیں وقتاً فوقتاً التہاب زائدۂ اعور کے دورے پڑتے رہتے ہیں، ان کے لیے تو اس سے بہتر کوئی دوا ہی نہیں ہے۔ سوء ہضمی میں بھی اسے مفید پایا گیا ہے۔

دہی: بڑی خوش گوار غذا ہے۔ یہ ٹھنڈا، مشتہی اور ہاضم ہوتا ہے۔ گرمیوں میں بڑھی ہوئی حدت کو اعتدال پر لاتا ہے اور خون اور صنفی غدد کی رطوبات کو پیدا کرتا ہے۔ اس کا کثرتِ استعمال صفراویت اور نزلے کی پیدائش کا موجب ہوتا ہے۔ اس کا استعمال، بھوک کی کمی، امتلا، استفراغ، یرقان، گٹھیا اور پیشاب کی شکایات میں مفید ہے۔ سانپ کے کاٹے کو کالی مرچوں میں ملا کر دہی کھلانا تریاق کا کام کرتا ہے۔

توڑ یا دودھ کا پانی دودھ کو پھاڑ کر حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ پانی دودھ سے پنیر بناتے وقت خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ اس پانی میں سوائے اجزاء لحمیہ اور روغنیہ کے دودھ کے دوسرے تمام اجزائے غذائیہ موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً اس میں حیاتین، شکر لبنی (ملک شوگر) اور معدنی نمکیات وغیرہ سب ہی پائے جاتے ہیں۔ یہ تپ دق، پچش، بواسیر، قولنج، نزلہ، اسہال، عسر البول (قطرہ قطرہ پیشاب آنا)، بادی، ریاحی اور یرقان کے عوارض میں بہت زیادہ مفید ہے۔ یورپ میں تو دودھ کے پانی سے علاج کرنے کا طریقہ بہت کافی قدیم ہے۔ دودھ کے پانی کو ایسی دوسری غذاؤں کے ساتھ بھی استعمال کیا جاتا ہے جن میں گوشت نہیں ہوتا توڑ سے علاج اس طرح کیا جاتا ہے کہ شروع میں اس کا ایک گلاس صبح پلاتے ہیں اور ایک رات کو۔ روزانہ اس کی مقدار میں تھوڑا تھوڑا اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ روزانہ دس گلاس تک کی مقدار پلانے لگتے ہیں۔ توڑ کو ٹھنڈا اور نیم گرم دونوں طرح پیا جاتا ہے۔ میعادی بخار کے مریضوں کو اسے دودھ کے بجائے پلانا نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ توڑ کی حراری افادیت کم ہوتی ہے۔ اسے بڑھانے کے لیے اس میں شکر لبنی ملا کر استعمال کرتے ہیں۔ آدھ سیر توڑ میں تین اونس شکر لبنی ملانے سے اس کی حراری افادیت کافی بڑھ جاتی ہے۔

کریم: خوش ذائقہ، مسکن اور جسم کو پرورش کرنے والی غذا ہے۔ کریم کی روغنیت چوں کہ سیال حالت میں ہوتی ہے اس لیے مکھن، تیل اور گھی وغیرہ کے مقابلے میں یہ بہت جلد ہضم ہو جاتی ہے۔ مکھن نکلا ہوا دودھ اور کریم اگر ہم وزن ملائے جائیں تو معدے کی تیزابیت اور سینہ جلنے کی شکایت کے لیے بہترین غذائی علاج ہے۔

گھی: بارد، ہاضم اور جلد کو ملائم کرنے والا ہے۔ اس کے استعمال سے جسم میں فربہی آتی ہے۔ آواز اور دماغی قوتیں کھلتی ہیں اور چہرے کا رنگ نکھرتا ہے۔ شہد اور گھی کا مرکب بچوں کی جملہ معمولی شکایات کے لیے بہت مفید ہے۔ زکام کی حالت میں اسے ناک میں ٹپکانا بہت نفع بخش ہے۔ اور چہرے کی کریم کے بجائے اگر اسے چہرے پر ملا جائے تو چہرے کی رونق اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ بھینس کے دودھ کا گھی مولد منی اور مفرح قلب ہے۔ اسے بواسیر اور اسہال میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ جس گھی کا یہاں ذکر ہو رہا ہے وہ گائے اور بھینس کے خالص دودھ سے بنتا ہے۔ نباتی یا کسی دوسرے مصنوعی گھی میں یہ خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔

شکر لبنی یا لیکٹوز:- تمام قسم کی شکروں میں سب سے زیادہ دیر ہضم ہوتی ہے یعنی اگر اس کا استعمال کیا جائے تو یہ دیر تک نظام ہضم میں رہتی ہے اور کافی دیر کے بعد اس کا مکمل ہضم عمل میں آتا ہے۔ اس کی یہ خصوصیت آنتوں کے بعض عوارض میں نہایت کارآمد ہے۔ جن لوگوں کی آنتوں کا ہضم خراب ہوتا ہے اور قولون میں فضلہ دیر تک تغیر کر کے سڑنے لگتا ہے، ان لوگوں کے لیے لبنی شکر کا استعمال بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ اگر کوئی ایسا مریض تین اونس لبنی شکر تین خوراکوں میں تقسیم کر کے کچھ دن تک روزانہ استعمال کرے تو اس کی اجابت میں سے عفونت جاتی رہے گی اور جب عفونت ختم ہو جائے گی تو وہ جراثیم بھی پیدا نہ ہوں گے جو فضلے کے رک جانے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف آپ دیکھیں گے کہ اس مریض کی اجابت کا قوام بالکل صحیح ہو گیا ہے اور اب عفونتی جراثیم کے بجائے حفاظتی جراثیم پیدا ہو گئے ہیں۔

لبنی شکر کا سب سے زیادہ مفید طریقِ استعمال یہ ہے کہ اسے کھانا کھانے سے ایک گھنٹہ پہلے استعمال کیا جائے. اس کی تین اونس کی ایک خوراک کو تھوڑے سے پانی میں گھول کر جلدی سے نگل لیا جائے اور دن میں تین مرتبہ کھائی جائے. ایک ہفتہ یا دس روز کے لگاتار استعمال کے بعد چھوڑ دیا جائے۔ ایسے لوگوں کو جنھیں بار بار یہ شکایت ہو جاتی ہو، دس پندرہ روز چھوڑ دینے کے بعد ایک ہفتے کے لیے پھر اس کا استعمال شروع کر دینا چاہیے۔ دوسری مرتبہ دن میں دو خوراکیں کافی ہوں گی۔ اس کے بعد انشاءاللہ آنتیں بالکل صاف رہنے لگیں گی۔

لبنی شکر کے استعمال سے شروع میں اجابت بہت زیادہ ملین ہو جاتی ہے۔ اگر دو تین روز تک اتنی ہی پتلی اجابت آتی رہے تو اس کی مقدار خوراک ایک اونس کر دی جائے۔ اس تخفیف سے اجابت کے قوام میں فوراً ہی اصلاح ہو جائے گی، اس کے بعد پھر مقدار خوراک وہی تین اونس کر دی جائے۔ پھر اسہالی کیفیت نہیں پیدا ہوگی۔ ہاں یہ خیال رہے کہ شروع میں لبنی شکر کے استعمال سے ریاحیں بھی بہت زیادہ بنیں گی، اس لیے کہ جب فضلے کو تحلیل کیا جائے گا تو وہ کچھ ریاحوں کی شکل اختیار کرے گا اور کچھ باہر خارج ہو جائے گا۔ یہ صورت کچھ ہی روز بعد خود بہ خود ٹھیک ہو جائے گی، لیکن ریاحوں کی تکلیف اگر زیادہ ہو جائے تو اس صورت میں گرم پانی کا اینما (حقنہ) لے لیا جائے، فوراً سکون ہو جائے گا۔ اینما کا پانی ڈیڑھ سے دو سیر تک لیا جا سکتا ہے اور اس کی حرارت ۱۰۵ سے ۱۲۵ فارن ہیٹ تک ہو سکتی ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو اینما دن میں دو سے تین مرتبہ تک لیا جا سکتا ہے۔ رات کو سوتے وقت اینما لینا زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک دو روز کے بعد جب ریاحوں کی تکلیف جاتی رہے تو اینما بند کر دیا جائے۔

لبنی شکر کی بڑی خوراک کھا لینے سے بسا اوقات بھوک کم ہو جاتی ہے، اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہ خود بھی اچھی خاصی مقوی غذا ہے۔ اس کی سارے دن کی پوری خوراک ایک دماغی کام کرنے والے آدمی کے نصف کھانے سے کچھ کم قوت نہیں رکھتی۔ موٹے اور زیادہ وزن رکھنے والوں کو اس کے استعمال کے ساتھ غذا میں کمی کر دینی چاہیے، اور غذا میں کرم کلا، گوبھی، سبز لوبیے کی پھلیاں، سلاد وغیرہ ترکاریوں کے ساتھ موسمی تازہ پھل ہونے چاہییں۔ اس کے علاوہ بے چھنے آٹے کی روٹی، آلو، دال، چاول اور چھاچھ میں سے بھی جو چیزیں چاہیں کھا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو دُبلے پتلے ہیں اور وزن بڑھانا چاہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ لبنی شکر کھانا کھانے کے تین گھنٹے بعد کھائیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ انھیں غذا میں کمی نہیں کرنی پڑے گی۔

درد قولنج میں بھی لبنی شکر بذریعہ مقعد داخل کرنے سے خاطر خواہ فائدہ ہو جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تو گرم پانی کا اینما (حقنہ) لیا جائے۔ جب قولون اچھی طرح صاف ہو جائے تو کوئی نصف پائنٹ پانی لے کر اس میں نصف اونس چاولوں کی پیچ اور نصف اونس لبنی شکر ملا کر قولون میں داخل کر لیا جائے۔ بہت جلد سکون ہو جائے گا۔



آپ کا نونہال

تن درست اور سب میں ممتاز رہے



ہوشیار مائیں اپنے بچوں کو ہمیشہ نونہال (رجسٹرڈ) دیتی ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتی ہیں کہ "نونہال" ان کے معصوم بچوں کے لیے ایک بہترین ٹانک ہے جو ان کی جسمانی ضرورتوں اور کیلیسم کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ نونہال آپ کے بچوں کو ہمیشہ تن درست رکھتا ہے۔ بدہضمی، سبز دست پیچش، بخار وغیرہ نہیں ہونے دیتا۔ اور اگر یہ مرض ہو جائیں تو ان کو فوراً آرام کر دیتا ہے۔



دانت نکالنے کے زمانے میں ماؤں! آپ کے بچوں کو
نونہال سے بہتر چیز نہیں ملے گی

نونہال پینے والے بچے دوسرے بچوں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں
کئی شیشیاں گھر میں رکھنی چاہییں۔

ہمدرد دواخانہ دہلی

آپ بیتی

(حکیم اقبال حسین ——— ایم اے)

سنہ ۱۹۴۹ء میں تقریباً تمام جاڑے میری صحت بہت اچھی رہی۔ میرا وزن بھی اس وقت ایک سو چالیس پونڈ سے کم نہ تھا۔ صبح کی پیدل ہواخوری اور پندرہ بیس منٹ کی جسمانی ورزش میرے معمولات میں شامل تھی۔ میں امریکا کے ایک مشہور پہلوان چارلس اٹیلس کا شاگرد تھا۔ اس نے مجھے اپنا ایک کورس بھیجا تھا جس میں غذا اور ورزش کے متعلق مکمل ہدایات تھیں۔ میں نے چارلس کی ورزشوں کو دیسی اور دوسری تمام انگریزی ورزشوں سے بہتر پایا۔ شروع کرنے کے ایک ہفتے کے بعد ہی سے میرے جسم میں نشوونما و بالیدگی کے نمایاں آثار پیدا ہو گئے تھے، اور میرا خیال تھا کہ ایک سال کے اندر اندر میرا جسم چارلس اٹیلس کے نمونے کے مطابق ڈھل جائے گا۔ مگر اپریل کے مہینے میں کچھ ایسی مصروفیات نے گھیرا کہ نہ سیر پابندی سے کر سکا اور نہ ورزشی پروگرام پر کاربند رہا۔ اپریل تو اس طرح گزرا ہی تھا، مئی اس سے بھی زیادہ مصروفیت میں گزرا۔ حتیٰ کہ اس مہینے میں تو غذا کے لگے بندھے پروگرام میں بھی فرق آگیا۔ کام کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ ان دو تین ماہ صحت کی اہمیت بھی اس میں گم ہو کر رہ گئی۔ مجھے بھروسا تھا کہ تین ماہ بعد میں اپنی جسمانی حالت پر توجہ کروں گا تو پھر ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ایسے مواقع پہلے بھی آچکے تھے، میری جمع شدہ قوت اور انرجی ہمیشہ ساتھ دے جاتی تھی، مگر اس بار میں بڑے مغالطے میں رہا۔ کام تو زوروں پر اس امید پر کرتا رہا کہ بعد میں صحت کو بحال کر لوں گا۔ لیکن جب کام سے فارغ ہوا تو معلوم ہوا کہ قوت بالکل ختم ہو چکی ہے، نظام ہضم خراب ہو چکا ہے، اور قبض نے مستقلاً گھیر لیا ہے۔ سیر شروع کی اور غذا کی طرف بھی توجہ کی۔ مگر وہ فائدہ نہ ہوا جو ہونا چاہیے تھا، بلکہ سیر سے آنے کے بعد طبیعت ہشاش بشاش ہونے کے بجائے اور گرنے لگی۔ میں نے معدے کا علاج کیا اور کبھی کبھی انیما سے آنتوں کی صفائی بھی کی، کچھ دن کے لیے اس سے سکون ہو گیا مگر چند روز بعد پھر وہی کیفیت عود کر آئی۔ اس زمانے میں حکیم حاجی عبدالحمید صاحب کے مطب سے فارغ ہونے کے بعد میں شام تک آرام ہی کرتا تھا، مگر طبیعت کی گرانی نہ جاتی تھی نہ گئی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ میرے لیے مطب میں دیر تک بیٹھنا مشکل ہو گیا، اور میں وقتاً فوقتاً مریضوں کے معائنے والے کمرے میں جا کر آرام کرنے لگا۔ حکیم صاحب سے میں نے اب تک کچھ نہیں کہا تھا، لیکن میری حالت سے وہ بے خبر نہ معلوم ہوتے تھے۔ چناں چہ ایک روز باہر کے تمام مریضوں سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے خود ہی مجھے اپنے پاس بلا کر باقاعدہ معائنہ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے حسب [illegible] نبض دیکھی۔ تین چار منٹ تک دونوں ہاتھوں کی نبض اپنے مخصوص انداز سے دیکھتے رہے۔ پھر کہا: "تو میاں ایک ماہ سے بخار لیے پھر رہے ہو اور ذکر نہیں کرتے، اب بھی تمھیں ۱۰۲ سے کچھ اوپر ہی بخار ہے۔" میں نے کہا مجھے آج تو بخار کا احساس بھی نہیں۔ میں تھرمامیٹر لگا کر دیکھوں گا۔ چناں چہ اسی وقت تھرمامیٹر لگایا گیا تو منہ کا درجۂ حرارت ۱۰۲ نکلا۔ اس کے بعد انھوں نے میرے معدے، آنتوں

اور پھیپھڑوں کا بغور معائنہ کیا۔ کھانسی کا کھٹکا مجھے کوئی مہینہ بھر سے تھا، مگر اب ایک ہفتہ سے کھانسی نے کافی زور پکڑ لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ حکیم صاحب کے چہرے سے تشویش و فکر کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ کہنے لگے "غضب کر دیا، اس مرتبہ تو اپنی صحت کو تم نے بالکل تباہ کر لیا۔ بے پروائی کی کچھ حد بھی ہے! ابھی ڈاکٹر سین کے ہاں جاؤ اور اپنے پھیپھڑوں کا ایکس رے کراؤ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ دائیں پھیپھڑے میں اوپر کی جانب زخم آگیا ہے۔"

حکیم صاحب کے توجہ دلاتے ہی مجھے اس کا یقین ہو گیا کہ اس مرتبہ مجھے ضرور دق نے گھیر لیا ہے۔ دن بہ دن دُبلا اور کم زور ہونے کی یہی وجہ ہے۔ مگر اس کے باوجود نہ مجھے کوئی خوف تھا اور نہ گھبراہٹ، اس لیے کہ میرے نزدیک دق ایک قابلِ علاج مرض ہے، محض توجہ اور صحیح قسم کے علاج کی ضرورت ہے۔

ایکس رے کی رپورٹ آئی تو اس میں وہی نکلا جو بڑے حکیم صاحب نے بتایا تھا، ریڈیو موجسٹ نے دائیں پھیپھڑے کے بالائی حصے میں جنبیت (Breaking down and Infiitration) کی نشان دہی کی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ صاحبِ فراش ہو گیا اور سوائے حوائج ضروریہ کے کسی کام کے لیے بھی پلنگ سے نیچے پاؤں نہیں اتارتا تھا، بخار مجھے ۱۰۲ سے ۱۰۴ درجے تک ہونے لگا تھا۔ میری والدہ، بھائیوں اور بیوی کو معلوم ہوا تو مایوس ہو گئے اور میری طرف اس طرح حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے جیسے کسی مرنے والے کو دیکھتے ہیں۔ میں نے انھیں تسلی دی اور بتایا کہ یہ مرض لاعلاج نہیں ہے۔ صحیح طریق پر علاج کیا گیا تو انشاء اللہ ۶ ماہ کے اندر اندر صحت یاب ہو جاؤں گا۔ میں نے یہ بھی سمجھایا کہ میرے سامنے رنج و سوگ ہرگز نہ منانا کہ اس سے میری صحت پر نہایت خراب اثر پڑے گا۔ الحمد للہ کہ میرے بھائی، بیوی اور والدہ نے میری باتوں کا یقین کر لیا اور بہت جلد سارے گھر کی فضا درست ہو گئی۔

تشخیصِ مرض ہو جانے کے بعد دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ اپنے چھوٹے بھائی عزیزی اعجاز حسین کو بھوالی سینی ٹوریم بھیج دیا تاکہ وہاں جا کر وہ میرے ایک عزیز دوست قاضی شجاع الحسن صدیقی سے ملیں اور میرے لیے سینی ٹوریم میں داخلے کی کوئی مناسب سبیل نکالیں۔ صدیقی صاحب کو سنہ ۴۴ ۱۹ء میں دق ہو گئی تھی اور اب وہ بحمد للہ صحت یاب ہو کر دو تین ماہ میں ہسپتال سے آنے والے تھے، ان کے تفصیلی حالات انشاء اللہ میں آئندہ سطروں میں لکھوں گا۔

اس دوران میں حکیم صاحب کے مشورے سے میں نے کھانسی اور بخار کے لیے دواؤں میں سعالین صدوری اور ماء الحیات تجویز کیا۔ سعالین کی ٹکیاں دن میں دو تین مرتبہ منھ میں ڈال کر چوسا کرتا (صدوری کھانسی کا شربت) رات کو سوتے وقت دو چمچے چاٹتا اور ماء الحیات صبح آدھ سیر دودھ میں بوزن ۵ تولہ حل کر کے پیتا۔ اس کے فوراً ہی بعد ایک نیم برشت انڈے کی زردی کھاتا، اور یہی میرا صبح کا ناشتہ ہو جاتا دوپہر اور شام کے کھانے میں شوربا چپاتی اور پھلوں کا استعمال زیادہ کرتا تھا۔

مکمل جسمانی آرام، صحیح غذا اور مناسب دوا کا اثر یہ ہوا کہ دس ہی روز میں کھانسی جاتی رہی اور بخار ۱۰۲ سے اتر ۹۹ درجے پر آگیا۔ میرا وزن بھی ایک آدھ پونڈ بڑھ گیا تھا۔

اس زمانے میں مجھے اور میری بیوی کو دوسرے قریبی عزیزوں کے ہاتھوں اچھی خاصی تکلیف پہنچی۔ بیماری کے ابتدائی دنوں میں رشتہ داروں اور دوستوں کا میرے ہاں تانتا بندھا رہتا تھا، جس نے سنا کہ مجھے دق ہو گئی ہے، وہی بھاگا چلا آیا۔ دوستوں سے جب میں ہنس ہنس کر باتیں کرتا اور کسی طرح کی بھی بے اطمینانی اور پریشانی کا اظہار نہ کرتا تو وہ سمجھتے کہ مجھے دق نہیں ہے۔ یوں ہی نزلے کے بگاڑ سے بخار آنے لگا ہے۔ مجھ سے دریافت کرتے تو میں صاف صاف بتا دیتا کہ ہاں مجھے دق ہو گئی ہے، مگر پریشانی اور خوف کی کوئی بات نہیں ہے۔ جس طرح دوسری بیماریوں سے انسان صحت یاب ہو سکتا ہے، دق سے بھی ہو سکتا ہے۔ جب وہ مجھ سے دریافت کرتے کہ کس ڈاکٹر کا علاج ہے تو میں کہتا کسی کا نہیں۔ بس اپنا ہی علاج ہے، تو اسے اور بھی تعجب ہوتا۔ بہر حال جب وہ مجھے ہشاش بشاش پاتے تو وہ خود بھی مجھ سے نہایت دل خوش کن باتیں کرتے، اور اس طرح میرا وقت نہایت اچھی طرح گزر جاتا۔ لیکن عزیزوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ ہمارے عزیزوں میں جب عورتوں کو معلوم ہوا کہ نصیب دشمناں اقبال کو بڑی بیماری ہو گئی ہے تو وہ بیچاریاں تو مجھے اس طرح دیکھنے آئیں جیسے کسی قریب المرگ عزیز کو دیکھنے آتے ہیں۔ چہرے پر مایوسی کے آثار ہویدا، طبیعت کبھی کبھی، خاموشی سے ایک طرف آن بیٹھتیں اور جب مجھے چپ چاپ پلنگ پر چت لیٹا دیکھتیں تو انھیں اور بھی ہول چھوٹتا۔ ایک آدھ مرتبہ ان کے سامنے میرے کھانے کا وقت آیا تو میں نے مشکل سے ایک یا آدھا پھلکا شوربے کے ساتھ کھایا۔ یہ دیکھ کر تو ان کی رہی سہی آس بھی جاتی رہتی کہ جب اس کا کھانا ہی تھک گیا تو یہ جیے گا کیا۔ میری بیوی سے سب ہی پوچھتے کہ آخر یہ اس قدر کم کیوں کھاتا ہے۔ میری اس کیفیت کو یہ لوگ بُری علامت بتاتے اور بیسیوں ایسے قصے سناتے جن سے یہ ثابت کرنا مقصود ہوتا کہ مریض کا کھانا تھکتا ہی اس وقت ہے جب اس کی قوتِ حیات جواب دے چکی ہے۔ میں نے دیکھا کہ میری خوش دامن اور ان کی والدہ اور بہنیں ایک طرف کو ہو کر میری بیوی اور بچوں کو دیکھ دیکھ باقاعدہ روتیں کہ دیکھیے اب ان بچوں کا کیا ہوگا۔ عجیب تر بات یہ تھی کہ جب میں ان کی یہ حالت دیکھتا تو مجھے بے ساختہ ہنسی آجاتی۔ میری بیوی نے انھیں کئی مرتبہ علیحدگی میں لے جا کر سمجھایا اور کہا کہ خواہ مخواہ قبل از مرگ واویلا کر کے آپ لوگ مجھے بھی پریشان کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی۔ وہ تمھیں روتا دیکھیں گے تو کس قدر مایوس ہوں گے۔

پندرہ روز کے بعد معلوم ہوا کہ میرے لیے بی کلاس وارڈ میں کمرہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ یوپی والوں کے لیے اس کا کرایہ چالیس روپے ماہوار ہے۔ ہم جیسے اور غیر یوپی والوں کے لیے بہتر روپے ماہوار۔ اس کمرے کے ساتھ ساتھ ایک غسل خانہ، ایک بیت الخلا اور باورچی خانہ بھی ملتا ہے، اور مریض کو باورچی کے علاوہ ایک اور تیماردار رکھنے کی بھی اجازت ہے۔ اسی وارڈ میں میرے کرم فرما قاضی شجاع الحسن صدیقی صاحب بھی یورپین وارڈ سے منتقل ہو کر آگئے تھے، ان کے پاس کمرہ نمبر ۲ تھا۔ سینی ٹوریم میں یورپین وارڈ کے علاوہ جہاں یورپین غذا سینی ٹوریم کے کچن سے تیار ہو کر ملتی ہے، اور مریضوں سے دو سو دس یا اس سے کچھ زائد رقم بابت کرایہ کمرہ اور خوراک ماہوار وصول کیا جاتا ہے، دوسرے پرائیویٹ وارڈ بھی ہیں جو اے۔ بی۔ سی۔ ڈی اور ایف ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔

الیف جنرل وارڈ کو کہتے ہیں۔ یہاں نادار مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ یہ ایک لمبا کمرہ ہوتا ہے جس میں ہر مریض کو لکڑی کے پارٹیشن سے علیحدہ سا کر دیا جاتا ہے، اور اس میں ایک چھوٹی سی میز اور ایک کرسی اور ایک تھوک دان رکھا ہوتا ہے۔ یہاں مریضوں کو کھانا سینی ٹوریم کی طرف سے ملتا ہے۔ وہ چاہیں تو دودھ مکھن وغیرہ کا ناشتہ بطور خود بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی خاص روک ٹوک نہیں ہوتی

اس سے اوپر ڈی کلاس ہے۔ اس درجے میں ایسے مریضوں کو رکھا جاتا ہے جو کچھ نہ کچھ ادا کر سکتے ہوں۔ یہاں ایک مریض سے چالیس رُپے ماہوار لیا جاتا ہے۔ اس رقم میں اس کے لیے طعام و قیام دونوں کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ اس کلاس میں کمرہ تو بے شک علیحدہ ملتا ہے، مگر پاخانہ اور غسل خانہ کئی کئی مریضوں کے لیے مشترک ہوتا ہے۔ تقریباً وہی فرنیچر اس کلاس کے مریضوں کو بھی ملتا ہے جو ایف کلاس میں ہوتا ہے۔ اس سے اونچا درجہ سی کلاس ہے۔ یہاں خوراک کا انتظام مریض کو بطور خود کرنا پڑتا ہے، ہر مریض کا کمرہ علیحدہ ہوتا ہے، مگر باورچی خانہ، غسل خانہ اور پاخانہ دو مریضوں کا مشترک ہوتا ہے۔ اس کا کرایہ یوپی والوں سے پچیس رُپے اور غیر یوپی والوں سے پچاس رُپے ماہوار لیا جاتا ہے۔ اس سے اوپر بی کلاس ہے۔ یہاں بھی خوراک کا انتظام مریض کو بطور خود کرنا پڑتا ہے، مگر یہاں علیحدہ کمرہ ہونے کے ساتھ ساتھ باورچی خانہ، غسل خانہ اور پاخانہ بھی ہر مریض کا علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ اس کلاس کے مریض باورچی کے علاوہ ایک تیماردار بھی رکھنے کے مجاز ہوتے ہیں۔ اس کا کرایہ یوپی والوں کے لیے چالیس رُپے اور غیر یوپی والوں کے لیے بہتر رُپے ماہوار ہوتا ہے۔

بی کلاس سے اوپر اے کلاس کے کمرے ہوتے ہیں جنھیں کاٹج بھی کہا جاتا ہے۔ یہ علیحدہ قطع زمین پر دو کمروں، دو باورچی خانوں، دو غسل خانوں اور دو پاخانوں پر مشتمل ایک مختصر سی کاٹج ہوتی ہے۔ اس کلاس کے مریضوں کو دو نوکر اور ایک تیماردار رکھنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اے کلاس کاٹج کا کرایہ سو روپے ماہوار یوپی والوں سے لیا جاتا ہے، اور ایک سو پچاس رُپے ماہوار غیر یوپی والوں سے لیا جاتا ہے۔

بی کلاس وارڈ علا سب سے زیادہ بلندی پر واقع ہے۔ میرے نزدیک اس کا جائے وقوع اے کلاس کاٹجوں سے بھی بہتر ہے۔ دہلی سے میری روانگی کے لیے ۱۹ جولائی سنہ ۴۶ء جمعہ کا دن مقرر کیا گیا۔ سینی ٹوریم میں میرے ساتھ ایک ملازم اور ایک تیماردار جا سکتا تھا۔ تیمارداری کے لیے تو میں نے اپنے ہمراہ کسی کو نہیں لیا، البتہ کھانا پکانے اور خدمت گزاری کے لیے میں نے اپنے محلے کے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جو ان دونوں کاموں کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا تھا ان صاحب کا نام حاجی ضیاءالدین عرف چتا ہے۔ بازار لال کنواں محلہ رودگراں دہلی کے رہنے والے ہیں اور سارا محلہ انھیں حاجی چتے ہی کے نام سے جانتا اور پکارتا ہے۔ انھیں میں نے اپنی ملازمت میں ۱۶ جولائی سنہ ۴۶ء ہی سے لے لیا تھا۔ یہ شخص طبعاً نیک، مخلص اور نہایت مستعد قسم کا آدمی ہے۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ میں اس کی مستعدی اور اخلاص ہی کو دیکھ کر تنہا اس کے ہمراہ سینی ٹوریم جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ورنہ مجھ جیسے مریض کے لیے بغیر کسی قریبی عزیز کے گھر سے باہر نکلنا مشکل

تھا۔ ہرچند جسمانی اعتبار سے میں ابھی تک بہت زیادہ کمزور نہیں ہوا تھا، مگر میری ٹانگوں میں اتنا دم نہ تھا کہ میں گھر کے صحن میں بھی بغیر لڑکھڑائے چل سکتا۔ پاخانہ، پیشاب کے لیے بھی مجھے تکلیف کیساتھ اٹھنا بیٹھنا پڑتا تھا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق ۱۹ جولائی کی شام کو سات بجے ڈیرہ دون ایکسپریس سے حاجی چوسے صاحب کے ہمراہ میں کاٹ گودام کے لیے روانہ ہوگیا۔ مرادآباد پر ڈیرہ دون ایکسپریس سے میرا ڈبہ کٹ کر لکھنؤ والی گاڑی میں لگ گیا جس نے ہمیں رات کو کسی وقت بریلی پہنچا دیا۔ وہاں سے اتر کر میں کاٹ گودام کی چھوٹی گاڑی میں بیٹھ گیا جس نے صبح سات بجے روانہ ہوکر ایک بجے دن تک کاٹ گودام پہنچا دیا۔ یہاں سے بھوالی سینی ٹوریم موٹر روڈ سے ۱۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور سطح سمندر سے پانچ ہزار آٹھ سو فیٹ کی بلندی پر ہے۔ کاٹ گودام سے بھوالی سینی ٹوریم تک کے لیے میں نے بیس روپے میں پوری ٹیکسی کرایہ پر کرلی جس نے ہمیں صرف ڈیڑھ پونے دو گھنٹے میں سینی ٹوریم کے دروازے پر پہنچا دیا۔

اس کے بعد کے دلچسپ حالات، میری مرضی کیفیت، سینی ٹوریم کا نظام اور اس پر جو تنقید و تبصرہ میں کرنا چاہتا ہوں، خوش قسمتی سے وہ تمام و کمال میرے ان خطوط میں محفوظ ہے جو میں نے سینی ٹوریم پہنچنے کے بعد اپنے عزیز دوست حکیم محمد سعید ایڈیٹر ہمدرد صحت کو لکھے۔ اس لیے مجھے اس کے بعد کے حالات اسی تسلسل میں لکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ آئندہ جو کچھ میں لکھنا چاہتا ہوں، اس کے لیے ان خطوط کا شائع کر دینا بالکل کافی ہوگا۔ (باقی آئندہ)

کجلی بن میں گلدار کا شکار

(حکیم اقبال حسین ایم اے)

اتوار[1] پارٹی

۱	حکیم عبدالحمید صاحب	مالک ہمدرد دواخانہ، دہلی
۲	حکیم محمد سعید	ایڈیٹر ہمدرد صحت
۳	حکیم حافظ محمد یحییٰ صاحب	جنرل منیجر ہمدرد دواخانہ، دہلی
۴	مولوی سجاد حسین صاحب کرتپوری	حکیم صاحبان کے ایک دوست اور مدرسہ عالیہ عربیہ دہلی کے مدرس اعلیٰ
۵	حکیم ظہیر علی صاحب	ایڈیٹر رسالہ تن درستی
۶	مسٹر ضیاء الدین	حکیم صاحبان کے ایک عزیز جو سہ وقت گورنمنٹ آف پاکستان میں ملازم ہیں
۷	محمد اقبال حسین	معاون ایڈیٹر ہمدرد صحت۔

اتوار پارٹی کے مندرجۂ بالا اراکین حکیم صاحب کے مکان پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ مولوی سجاد صاحب کچھ ناراض سے معلوم ہوتے ہیں۔ سبب ناراضی دریافت کرنے پر وہ منشی وحید خاں کا خط جو ان کے پاس دھیرپور سے آیا ہے، میرے سامنے ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں "ذرا آپ بھی اسے دیکھ لیجیے۔ ہمارے حکیم صاحب (حکیم حاجی عبدالحمید) کی بھی عجیب کیفیت ہے۔ ایک مہینے سے جب بھی مجھے ملتے ہی کہتے تھے "میاں مولوی صاحب شکار کو نہیں چلتے، کچھ بنائیے نا پروگرام، اب کی مرتبہ تو کہیں دہلی سے باہر چلنے کو جی چاہ رہا ہے۔ ذرا خاں صاحب کے لڑکے منشی وحید خاں کو نجیب آباد (ضلع دھیرپور) لکھ کر معلوم کر لیجیے کہ آیا فروری کا وسط شکار کے لیے موزوں رہے گا؟ دو چار دفعہ تو میں ان حضرت کی بات کو یوں ہی ٹالتا رہا۔ لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ حکیم صاحب واقعی سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں تو میں نے منشی وحید خاں کو ایک خط اس مضمون کا بھیج دیا۔ اور پرسوں ۷ فروری کو ان کا جواب بھی آگیا۔ منشی جی نے بڑی تاکید سے حکیم صاحب اور ان کی پارٹی کو بلایا ہے، جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اب ان حضرت کی یہ کیفیت ہے کہ خط تو خیر کسی طرح ——— وہ بھی نہ معلوم کیونکر ——— پڑھ لیا، مگر اس کے بعد جو گونگی سہڑپ کی ہے، تو آج تک کوئی معقول جواب نہیں دیا۔ محض یوں ہی ہوں ہاں، ہوں ہاں کر کے بات ٹال دیتے ہیں۔ آپ ہی غور فرمائیے کہ وہاں قیام و طعام کا معقول بندوبست کرنے کے لیے ان لوگوں کو کم سے کم ایک ہفتے قبل تو لکھنا ہی پڑے گا۔"

یہ کہہ کر مولوی صاحب تو خاموش ہو گئے۔ حکیم صاحب نے کہا "میں تو انکار نہیں کر رہا۔ میری بھی رائے میں تو ۱۷ فروری، ۳۲ء کو یہاں سے چل کر ۱۸ کو وہاں پہنچ جاؤ۔ میں اس وقت تک اپنے سب کام نپٹ

---

[1] حکیم محمد سعید اپنے مخصوص احباب کا اجتماع اتوار کے دن اپنے مکان پر کیا کرتے تھے اس لیے اتوار پارٹی کہا جاتا ہے۔

فارغ ہو جاؤں گا۔ آپ بھائی جواد حسین صاحب اور منشی وحید خاں صاحب کو منڈاولی اور واحد خاں صاحب کو نجیب آباد علیحدہ علیحدہ خط لکھ دیجیے۔ مولوی صاحب! میں نے آپ سے کل کہہ تو دیا تھا، اور کیا ناک کان کی شرطیں لکھوائیے گا۔"

حکیم صاحب کے اس جواب پر مولوی صاحب مطمئن ہو گئے اور اگلے ہی روز یعنی پیر کو اس سلسلے میں ضروری اطلاعات جن جن آدمیوں کو دینی تھیں دے دیں۔

مولوی سجاد ہماری پارٹی میں نہایت دل چسپ مگر مسلمان قسم کے آدمی ہیں اس لیے کہ انگریزی نہ پڑھنے کی وجہ سے یہ بیچارے اس قسم کی ہوشیاری اور چالاکیوں سے کچھ طبعاً محروم ہیں جو ایک انگریزی خواندہ مسلمان کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے اور ادھر ہمارے حکیم صاحب اور پارٹی کے دوسرے افراد کی خاص ان کے معاملے میں یہ کیفیت ہے کہ جب تک انھیں کبھی نہ کسی طرح پریشان نہ کیا جائے، لطف ہی نہیں آتا (یہ دوسری بات ہے کہ مولوی صاحب قبلہ بھی جب چاہتے ہیں تو ہمیں خوب پریشان کر دیتے ہیں) چناں چہ یہ تقریب شکار پارٹی کے سلسلے میں بھی منائی گئی۔ یہاں حکیم صاحب نے ہماری سب کی ملی بھگت سے یہ طے کر لیا کہ پارٹی کا انتظام اور جو جو چیزیں یہاں سے لے جانی ہیں، ان سب کا بندوبست اس طرح کر لیا جائے کہ حضرت مولوی صاحب کے علم میں کچھ نہ آئے اور وہ یہی سمجھتے رہیں کہ ابھی کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ سعید صاحب کو چھوڑ کر کہ انھیں دواخانے کے کچھ اہم کام کرنے تھے، پارٹی کے تمام افراد کے لیے نجیب آباد کے سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ بھی منگوا لیے گئے، مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ مولوی صاحب کے کان میں اس کی بھنک بھی نہ پہنچنے پائے۔

چناں چہ آخر وقت تک مولوی صاحب کو کچھ نہیں بتایا گیا اور سارے انتظامات مکمل ہو گئے۔

مختصر یہ کہ ۷ ر فروری پیر کو جو ہمارے چلنے کا دن تھا، حکیم صاحب نے صبح ہی مولوی صاحب کو ایک پرچہ لکھ دیا کہ آپ تیار ہو کر شام کو چار بجے تک دواخانے کے گودام میں تشریف لے آئیے۔ ہم لوگ یہیں سے کوئی پونے سات بجے اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔ مولوی صاحب وقت مقررہ پر تو آ گئے، مگر یہ سمجھ کر کہ نہ معلوم ان لوگوں نے کیا غلط سلط بندوبست کیا ہے، کچھ پژمردہ سے رہے۔ ایک تانگے میں سامان تو پہلے ملازم کے ہاتھ بھجوا دیا اور ہم بعد میں موٹر میں اسٹیشن پہنچ گئے۔ اب مولوی صاحب نے اسٹیشن پہنچ کر دیکھا کہ ہمارے بستر سکنڈ کلاس میں لگے ہوئے ہیں اور کھانے پینے کا بھی خاطر خواہ بندوبست ہے تو کھل گئے اور ان کی ساری کوفت جو انھیں اب تک ہوئی تھی، دور ہو گئی۔ صبح چار بجے کے قریب ہم لوگ نجیب آباد کے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ وہاں ہمیں حکیم صاحب کے ایک دوست واحد حسین خاں صاحب کے ہاں صبح تک قیام کرنا تھا۔ واحد حسین صاحب ہمیں اسٹیشن پر منتظر ملے۔ صبح تک سونا تو کیا تھا، ان کی کوٹھی پر جا کر یوں ہی ذرا سی دیر اُن کے اصرار پر کمر سیدھی کر لی۔ صبح نماز کے فوراً بعد مولوی سجاد صاحب کے بڑے بھائی حکیم جواد حسین صاحب تین بیل تانگے لے کر ہمیں منڈاولی لے جانے کے لیے واحد حسین خاں صاحب کی کوٹھی پر آن پہنچے، تقریباً نو بجے ناشتے سے فارغ ہو کر خوش گپیاں ہونے لگیں۔ اس میں ہماری پارٹی کے دل و جان حکیم ظہیر علی صاحب نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حکیم صاحب موصوف

اس وقت شکار کی باتیں کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔ وہ سر سے پاؤں تک شکاری لباس میں ملبوس تھے اور واقعی بہت بڑے شکاری معلوم ہو رہے تھے۔ واحد حسین خان صاحب اور حکیم سجاد حسین صاحب ان سے بہت مرعوب ہو رہے تھے کہ ان کی پارٹی میں یہ شخص بہت بڑا شکاری ہے۔ حکیم ظہیر علی صاحب آج ہر بات میں لقمہ دے رہے تھے۔ باتوں باتوں میں ذکر آیا کہ یہاں کجلی بن میں ابھی دو مہینے پہلے بہت چیتل تھا۔ آپ فوراً بولے "ہاں ہاں وہی چیتے کا بچہ نا"۔ اس جملے کا ان کی زبان سے نکلنا تھا کہ واحد حسین خاں صاحب نے ذرا حیرت سے ان کی طرف دیکھا کہ یہ ہیئت کذائی، یہ لباس اور یہ اناڑی پن کی باتیں۔ ہم سب نے بھی انھیں دیکھ کر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اب کیا تھا، حکیم ظہیر علی صاحب کا چہرہ کچھ جھینپ اور کچھ ہم پر غصہ کی وجہ سے سرخ ہو گیا۔ بگھر کر بولے "جناب معاف کیجیے، میں لطیف آپ کیا حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ کے یہ معزز مہمان بھی بالکل اناڑی ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی بندوق پکڑنے کی تمیز نہیں ہے۔ اگر اس وقت آپ کو میری بات کا یقین نہیں آتا تو جنگل میں برسر موقع دیکھ لیجیے گا"۔

حکیم ظہیر علی نے پارٹی کے دوسرے ممبروں کے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی تھی، ناانصافی ہوگی اگر اسے صحیح نہ کہا جائے۔ ہم میں سے واقعی اکثر و بیشتر تو بندوق بھی صحیح طریق پر پکڑنا نہیں جانتے تھے شکاری جانوروں کے متعلق ان کے مبلغ علم کا یہ خیال تھا کہ وہ نیل گائے اور گھوڑے میں اور جنگلی بلے اور چیتے کے بچے میں دور سے کوئی تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ اصل میں اول تو ہم لوگ اتنے بڑے جنگل میں اس سے پہلے کبھی گئے نہیں تھے، زیادہ سے زیادہ اگر شوق پیدا ہوا تو دہلی کے قرب و جوار میں ہرن یا چکارہ کا شکار کسی پیشہ ور شکاری کے ساتھ جا کر کھیل آئے اور بس۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کی شکار پارٹی سے ہمارا اپنا مقصود واقعی شکار کھیلنا کبھی نہیں ہوا، بلکہ تفریح کے خاطر تبدیلِ مقام ہوتا تھا ہم تو اس لیے جاتے تھے کہ جنگل میں کچھ روز رہنے، ادھر ادھر بندوق لیے پھرنے اور خالص قدرتی غذائیں کھانے سے نہ صرف یہ کہ شہری زندگی کی مصروفیات سے کچھ روز کے لیے چھٹکارہ مل جاتا تھا بلکہ ہماری جسمانی اور دماغی صحت پر بھی اس آؤٹ ڈور تفریح کا بہت ہی خوش گوار اثر پڑتا تھا۔ اور ہم اس قسم کی تفریح کے بعد اتنے تر و تازہ ہو کر لوٹتے تھے کہ اس کے بعد پورے ایک سال تک سخت کام کرنے کی قوت بحال ہو جاتی تھی۔ چناں چہ کجلی بن کے شکار کا مقصد بھی یہی تھا، مگر اس کے باوجود بھی بندوقیں ہمارے پاس کافی تھیں۔

۱۸ فروری سنہ ۴۷ء بروز منگل صبح دس بجے تک بیل تانگوں پر بیٹھ کر ہم لوگ منڈاولی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہمارے ساتھ حکیم صاحب کا ایک پرانا ملازم نور بھی تھا۔ یہ شخص ہمارے ساتھ پہلے بھی پارٹیوں میں جا چکا تھا اور ان سفروں کا اچھا خاصا تجربہ رکھتا تھا، اس میں دونوں صفات موجود تھیں، مزدور کا کام بھی دیتا تھا اور باورچی کا بھی۔ شروع میں تو ہم سب بیل تانگوں میں بیٹھ گئے مگر جلد ہی ہم نے محسوس کیا کہ اگر پیدل چلا جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔ چنانچہ حکیم عبدالحمید صاحب، منشی نایاب اور میں گاڑیوں سے اتر کر پیدل چلے۔ راستے میں دو ندیاں بھی پڑتی تھیں،

انھیں تو البتہ گاڑیوں ہی پر سوار ہو کر عبور کیا، باقی تمام راستے پیدل چلے۔ بارہ بجے تک ہم نے ۷ میل کی مسافت طے کر لی تھی۔ وہاں پہنچے تو کھانا تیار تھا۔ منڈاولی جیسے گاؤں میں حکیم جواد حسین صاحب نے جیسا پر تکلف اور صحت افزا کھانا کھلایا، اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ جنگلی مرغی کے گوشت کا قورمہ، پائے، شامی کباب، خالص ترین گھی میں بگھری ہوئی اڑد کی دال، گنے کے رس کی کھیر، اور گھر کے دودھ کی خانہ ساز نہایت ہی خوش ذائقہ مٹھائی اور ان سب سے بہتر ——— جسے میں انسانی صحت کے لیے ایک نہایت ہی ضروری اور اہم چیز سمجھتا ہوں ——— یہ کہ خالص گیہوں کے گھر میں پسے ہوئے بے چھنے آٹے کی تازہ تازہ روٹی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ کیا لطف دے رہی تھی۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور تھوڑی دیر قیلولے کے لیے لیٹ گئے۔ سہ پہر کو چار بجے پھر تانگوں میں بیٹھ کر منشی وحید خاں کی طرف دیبہ پور کو روانہ ہو گئے۔ منشی جی ہمارے منتظر ہی تھے، بڑے تپاک سے ملے۔ ہمارے پہنچنے پر انھوں نے چائے سے ہماری تواضع کی، اگرچہ ہم نے اور حکیم صاحب نے تو ان کے کھیت کے گنے منگوا کر کھائے۔ کوئی مغرب کے لگ بھگ ہمارا قافلہ دیبہ پور سے گوجیا کی طرف چلا، یہاں جنگل میں ہمارے قیام کے لیے منشی وحید خاں کا ایک ڈیرہ تھا۔ جنگل کے دروازے ہی پر سہیل گڑھ ایک گاؤں ہے، یہاں سے منشی وحید خاں کے دو شکاری دوست، ملا شبراتی اور ننھے خاں بھی پارٹی کے ساتھ ہو لیے۔ شکار کھیلنے کھلاتے، کوئی دس بجے ہم سب گوجیا اپنے ڈیرے پر پہنچے اور ساڑھے گیارہ بجے تک ہم لوگ کھانا کھا سکے۔ حکیم جواد صاحب روٹی اور شامی کباب تو اپنے ساتھ ہی لائے تھے، اور آلو کا بھرتہ انھوں نے وہاں پہنچ کر بنا لیا۔ ہم اس وقت اس قدر بھوکے تھے کہ اگر بغیر کچھ پیٹ میں ڈالے سونے کا بھی قصد کرتے تو شاید رات بھر نیند نہ آتی۔ اس وقت روٹی، آلو اور شامی کباب نے بھی وہ لطف دیا کہ شاید ہی کبھی آیا ہو۔ اس رات ½ ۱۲ بجے سے پہلے ہم نہ سو سکے۔

۱۹ فروری بروز بدھ ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے شکار کے لیے نہ نکل سکے۔ اس روز ہمارا ناشتہ دودھ، چار، ڈبے کا مکھن اور رسک پر مشتمل تھا۔ ملا شبراتی، بابو یحییٰ اور مولوی صاحب ایک تانگے میں، ننھے خاں، حکیم صاحب اور منشی وحید خاں دوسرے تانگے میں مولوی جواد حسین، مسٹر نایاب الدین اور یہ خاکسار تیسرے تانگے پر۔ یہ تینوں پارٹیاں علیحدہ علیحدہ سمتوں میں شکار کے لیے روانہ ہو گئیں۔ مگر افسوس کہ اس روز دوپہر تک سوائے ایک تیتر، ایک مرغ اور ایک قاز کے کچھ بھی ہمارے ہاتھ نہ آیا۔ شام کے وقت میرے، حکیم صاحب اور مولوی سجاد کے علاوہ پھر یہ تمام لوگ دو علیحدہ علیحدہ تانگوں میں سوار ہو کر نکل گئے۔ ہم تینوں کچھ دیر تو اپنے ڈیرے میں رہے، لیکن عصر کے بعد منشی وحید خاں کے ایک ملازم کو لے کر چشمے کے کنارے کچھ موروں کا شکار کرنے نکل گئے۔ موروں کا قاعدہ ہے کہ یہ غروب کے وقت درختوں پر بسیرے کے لیے آتے ہیں۔ ہم تینوں میں مولوی سجاد کو بندوق چلانے کا نسبتاً بہتر سلیقہ معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے وہ آگے آگے اور ہم پیچھے پیچھے سیر و تفریح کرتے ہوئے اپنے ڈیرے سے ایک دو فرلانگ کے قریب جہاں چشمہ بہتا تھا، پہنچے۔ مغرب کی نماز ہم نے وہیں چشمے پر وضو کر کے پڑھی۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے ایک مور چشمے کے دوسری طرف بھانپ لیا، ملازم کی پیٹھ کر چھوڑ کر انھوں نے چشمہ

پار کیا، اور موقع پر پہنچ کر فائر کیا، مگر ولے قسمت کہ وہ مور "پانی پینے چلا گیا" اور مولوی صاحب ہماری ہی طرح بندوق اور ہاتھ ہلاتے ہوئے واپس آگئے

سورج غروب ہونے کے بعد فضا میں تاریکی کا دور دورہ شروع ہو رہا تھا۔ مجھے گھبراہٹ شروع ہوئی اور میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ یہ جنگل کا معاملہ ہے، یہاں رات کے وقت اندھیرے میں پھرنا مناسب نہیں ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ ہم واپس ڈیرے کو چلیں، مگر حکیم صاحب بولے کہ "میاں آپ کو بہت ڈر لگتا ہے۔ دیکھتے نہیں مولوی صاحب کے ہاتھ میں بندوق ہے! یہ اس وقت شیر تک کو نہیں چھوڑیں گے!" میں نے کہا "جی ہاں مور اور مرغ کے چھرّوں سے ہی تو تیس مار خاں ہیں جو شیر کا شکار کریں گے!" ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ مولوی صاحب ایک مور کو بھانپ کر ہم سے ساٹھ گز کے فاصلے پر دو ایک فٹ یا اس سے ذرا کم اونچائی کے پتھروں پر پیر رکھے نشست لگانے کی سوچ رہے تھے۔ انکی دونوں ٹانگوں کے درمیان کوئی ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ ہوگا پتھروں پر غالباً وہ اس لیے کھڑے ہوئے تھے کہ وہاں سے ان کی نظر میں جو مور تھا، اس پر نشست ٹھیک طریق پر لگائی جا سکتی تھی۔ میں اور حکیم صاحب کچھ دوسرے موروں کی طرف متوجہ تھے کہ اتنے میں کسی جانور کی ایک عجیب قسم کی ڈراؤنی سی آواز پیدا ہوئی۔ منشی وحید خاں کے ملازم نے یہ آواز سنتے ہی کہا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے قریب ہی چشمے پر گلدار اور سوئر کا مچیٹا ہوا ہے (مچیٹا = نوک جھونک)، گلدار نے اُسے چھیڑا ہے اور اس کے جواب میں سوئر نے یہ ڈراؤنی آواز نکالی ہے۔ اب یہاں سے چل پڑیے، وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک جانور نہایت تیزی سے اس سمت سے بھاگتا ہوا آیا، جس سمت سے کہ آواز آئی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ وہ جانور سوئر ہے اور اس کا رخ مولوی صاحب کی طرف ہے۔ ہم مولوی صاحب کو خبردار کرنا ہی چاہتے تھے کہ آناً فاناً میں وہ سوئر ان کی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں سے مع تہ بند کے نکل گیا اور مولوی صاحب چاروں شانے چت پڑے ہوئے تھے۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے مولوی صاحب گھبرا کر وہاں سے اٹھے اور ڈیرے کی طرف بھاگے، ہم تینوں بھی ڈیرے کی طرف لپکے، اس لیے کہ ہمیں خوف تھا کہ کہیں گلدار سوئر کے پیچھے نہ آرہا ہو۔ ہم ابھی آدھے راستے میں ہوں گے کہ شیر کے دہاڑنے کی آواز آئی ——— اس پر منشی وحید خاں کے ملازم نے کہا کہ یہ تو شیر ہے، گلدار نہیں، ذرا جلدی چلے آئیے، ہانپتے، کانپتے ہم ڈیرے میں پہنچے، مولوی صاحب کے چوٹ تو کہیں نہیں آئی تھی، مگر خوف کی وجہ سے ان کے قلب کا برا حال تھا، مولوی صاحب تو جاتے ہی بستر پر دراز ہو گئے، میں اور حکیم صاحب کوئی رسالہ اور اخبار دیکھنے لگے۔ کوئی ساڑھے آٹھ بجے ملا شبراتی اور بابو بھی اپنی مہم پر سے واپس آگئے، میں نے دیکھا کہ ملا شبراتی اور بابو بھی دونوں غیر معمولی طور پر خاموش ہیں، میں نے یوں ہی مذاق سے کہا "کہیے بابو! راستے میں شیر تو نہیں ملا۔ ڈرا بتاؤ تو سہی اس قدر چپ چپ کیوں ہو؟" اس پر بابو نے بتایا کہ "یہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر چشمے سے گزر کر جو راستہ آرہا ہے، ایک بڑے درخت کی جڑ میں ہم نے شیر کو بیٹھے دیکھا ہے۔ چشمہ پار کرنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہمارے بیلوں نے پھنکارنا شروع کر دیا اور وہ راستے سے ہٹ کر آڑی کاٹ رہے ہیں، ہم جتنا انھیں راستے پر لانا چاہتے

ہیں اتنا ہی دور ہٹ رہے ہیں، ملا شبراتی نے کہا کہ وہاں آس پاس ضرور کوئی درندہ ہے، ورنہ بیل کبھی راستہ نہ چھوڑتے، ہم نے چاروں طرف ٹارچ ڈالنا شروع کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ راستے میں ہم سے دس پندرہ قدم پر جو درخت تھا اس کی اوٹ میں ایک شیر بیٹھا ہوا ہماری طرف دیکھ رہا ہے، شبراتی نے شیر کو دیکھ کر مجھے گاڑی میں دبک جانے کا اشارہ کیا اور وہ خود بھی دبک گیا، کچھ دیر تو ہم شیر کی آنکھوں سے اپنا ٹارچ لڑاتے رہے، بالآخر ہم نے فوراً ہی گھبرا کر ٹارچ بند کر لیا کہ کہیں اس روشنی ہی پر یہ حضرت جست لگا کر ہمیں نہ آلیں۔ خدا خدا کر کے ہم ڈیرے میں پہنچے ہیں۔ یہاں تو ہماری شیر سے مڈبھیڑ ہوئی۔ کوئی ڈیڑھ میل پرے ان ملا صاحب نے ہمیں دلدل میں پھنسا دیا تھا، اس وقت مغرب کا وقت ہو چکا تھا، اور میں ڈر رہا تھا کہ دیکھیے آج جنگل میں کس درندے سے مڈبھیڑ ہوتی ہے، وہاں سے تو اللہ اللہ کر کے نکل گئے، مگر یہاں عین ڈیرے کے قریب شیر مل گیا۔ آج تو اللہ ہی نے فضل کیا"

بابو کی کہانی سننے کے بعد ہم نے بھی اپنی سرگزشت سنائی۔ ننھے خاں وغیرہ کی پارٹی بھی نو بجے تک واپس آگئی تھی، مگر خالی، انھیں بھی اس روز کوئی شکار نہ ملا۔ رات کو دس بجے کھانے سے فارغ ہوکر اس روز سوتے وقت شیروں، ہاتھیوں اور گلداروں ہی کے قصے ہوتے رہے۔ ہماری پارٹی میں ننھے خاں شیر کے شکار میں بہت مشہور بتلائے جاتے تھے۔ انھوں نے ہمیں شیروں کے بہت سے قصے سنائے، جن میں سے دو تین میں بھی نقل کروں گا کہ ان سے ہمارے ناظرین کو دلچسپی کے علاوہ ان درندوں کے متعلق عجیب و غریب سچے واقعات معلوم ہوں گے۔

ننھے خاں شکاری نے سنایا کہ ایک روز سہیل گڑھ میں ایک گلدار آگیا، سارے گاؤں میں غل مچ گیا۔ میں تو گھر میں تھا نہیں، میرے والد صاحب کمرے میں بیٹھے تھے، اور بہن باورچی خانے میں کچھ پکا رہی تھیں، گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گاؤں والوں کے غل سے گلدار بھاگا۔ ہمارے گھر کا دروازہ جو کھلا دیکھا تو پناہ لینے کے لیے اس میں گھس آیا۔ والد اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور اس کے سامنے بانس کر دیا، اس نے غرّا کر بانس پر پھپٹا مارا۔ میری بہن نے جو دیکھا کہ گلدار نے اب والد کو کھایا، تو وہ پیچھے سے اس کی طرف دوڑی۔ ادھر وہ بانس سے الجھ رہا تھا کہ اس نے پیچھے سے اس کے سر پر دوپٹہ ڈال دیا، اور لگی بانس سے اس کی خبر لینے۔ میری والدہ پڑوسن کے ہاں گئی ہوئی تھیں، اتنے میں وہ بھی آگئیں، اور میری والدہ اور بہن دونوں نے اس کے سر پر بانس بجانے شروع کر دیے۔ گلدار کے سر پر جو دوپٹہ پڑا تو وہ کچھ ایسا گھبرایا کہ ساری توجہ اس کو نوچنے میں صرف کر دی، لطف یہ رہا کہ ابھی وہ میری بہن کے دوپٹہ سے فارغ نہ ہوا تھا کہ میری والدہ نے بھی آتے ہی اس کے سر پر دوپٹہ ڈال دیا، اس وجہ سے وہ خاصی دیر تک دوپٹہ ہی کے ساتھ الجھتا رہا۔ اس کے علاوہ یہ دونوں عورتیں پیچھے سے بانس برسا رہی تھیں، اور والد نے سامنے سے اس کی سرکوبی شروع کر دی تھی اس کا سر بہت جلد چکرا گیا، پھر کیا تھا سارا محلہ ٹوٹ پڑا اور گلدار کا وہیں تیا پانچہ کر دیا۔

ننھے خاں نے بہت سے اس قسم کے واقعات سنائے جنھیں سن کر طبیعت میں سے شیر کا خوف نکلنے لگا اور یہ شوق پیدا ہوا کہ یہاں سے واپسی سے ایک دن پہلے شیر کے شکار کے لیے مچان

بند ہوا جائے۔ لیکن ان حضرت نے آخر میں ایک ایسا واقعہ بھی سنایا جسے سُن کر شیر کی ہیبت دل میں بیٹھتی تھی، وہ واقعہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک انگریز انجینیر منشی وحید خاں کے والد کالے خاں مرحوم کے ساتھ شیر کے شکار کے لیے کجلی بن میں آیا، وہ ہاتھی پر سوار تھا، اور نہایت عمدہ قسم کی رائفلوں اور دوسرے شکار سے متعلق آلات سے مسلح تھا اس نے کالے خاں سے کہا "میں مچان پر بیٹھ کر شکار نہیں کھیلوں گا۔ تم تو مجھے دن کے وقت شیر دکھاؤ، میں تو اس مرتبہ بغیر مچان کے ہی شکار کھیلنا چاہتا ہوں؛ چناں چہ وہ کالے خاں اور ننّے خاں ہاتھی پر سوار ہوکر نکلے، کالے خاں انھیں ایک ایسے موقع پر لے گئے جہاں عام طور پر شیر ملتا تھا، خوش قسمتی سے اس وقت بھی وہاں شیر موجود تھا کوئی پچاس گز کے فاصلے پر دور تک ایک مٹی کے ٹیلے کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ شیر اس وقت ٹیلے کے برابر جا رہا تھا، کالے خاں نے شیر کو دکھا کر انگریز انجینیر کو اس پر فائر کا اشارہ کیا۔ انجینیر نے شیر کو دیکھا اور دیکھ کر بالکل خاموش ہو گیا——— ہوں، نہ ہاں کچھ بھی نہیں کی، نہ بندوق سنبھالی۔ شیر نے ایک نگاہِ غلط انداز ان پر ڈالی اور غرّا کر دوسری طرف چلا گیا۔ جب شیر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو انجینیر صاحب میں دوبارہ جان آئی، اور انھوں نے ادھر ادھر دیکھا، ہاتھی آگے کی جانب چلنے لگا، میں نے کہا "صاحب! ہم نے آپ کو شیر دکھایا، آپ نے فائر کیوں نہیں کیا؟" کہنے لگا "اچھا مین! تم پھر شیر دکھاؤ، ہم اب کی بار ضرور فائر کرے گا" کالے خاں گھوم پھر کر پھر ایسے ایسے موقع پر لے گئے جہاں وہی شیر پھر نظر پڑا۔ خاں صاحب نے پھر اشارہ کیا۔ مگر اس مرتبہ پھر وہ انگریز بے حس و حرکت ہو گیا، اور بندوق نہ چلائی——— معلوم ہوا کہ شیر کو دیکھ کر اس پر ایسی ہیبت طاری ہوتی تھی کہ وہ بے حس و حرکت ہو جاتا تھا، اس وقت اس کی قوّتِ ارادی تک جواب دے بیٹھتی تھی۔ ہر چند یہ قصہ سُن کر ہمارے دلوں میں بھی خوف پیدا ہوا، مگر مچان بند ہوا کر شیر کا شکار کھیلنے کے شوق میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ رات زیادہ ہو گئی تھی، بارہ بجے تک ہم سب سو گئے۔

۲۰ فروری بروز جمعرات، ہم نے نہایت صحت بخش ناشتہ کیا۔ کریم، بسکٹ اور نہایت عمدہ دودھ پینے کو ملا۔ آٹھ بجے تک فارغ ہو کر مختلف ٹولیوں میں بیل تانگوں میں سوار ہو کر شکار کے لیے چل دیے۔ اس روز شام کا پروگرام یہ تھا کہ سہ پہر کو گوجیا سے 'ٹاٹ والا' جو گوجیا سے پانچ میل کے فاصلے پر تھا، جائیں اور رات وہیں قیام کریں۔ جو کچھ راستے میں چلتے چلاتے ملے، اسے مار لیں، اور وہاں علی الصباح اٹھ کر شکار کریں۔ 'ٹاٹ والا' میں بھی منشی وحید خاں کا ایک ڈیرہ تھا، ہمارے قیام کا وہیں انتظام ہونا تھا۔ اس لیے ہمیں صبح کے شکار سے ذرا جلد ہی واپس آنا تھا، تاکہ وہاں کے لیے بستر وغیرہ بندھوا کر خود اور منشی وحید خاں کے دوسرے ملازموں کے ساتھ دو تین گھنٹے پہلے تانگے پر لدوا کر بھجوا دیے جائیں۔

اس روز صبح میں، حکیم صاحب اور مولوی سجاد۔ ملا شبراتی کے ساتھ تانگے میں بیٹھے۔ اب تک ہمیں ان کے متعلق بڑا حسنِ ظن تھا، اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص بہت اچھا شکاری ہے۔ مگر دوپہر تک ان حضرت کی بھی قلعی کھل گئی، شروع میں ڈیرے سے آدھے میل کے فاصلے پر انھوں نے مور کو گرایا تو اس شخص کی مہارت اور جنگل دانی کے ہم اور بھی قائل ہو گئے، مگر آگے جو چلے تو ہر ایک میل کے فاصلے پر یہ

کہہ دے کہ یہاں تو ہم غلط آ گئے۔ میں نے کہا جناب اس میں ہمارا کیا قصور ہے، آپ ہی رہنمائی کر رہے ہیں۔ خیر کوئی چھ میل کا چکر کاٹنے کے بعد بھی ہمیں کچھ نظر نہیں پڑا تو مولوی سجاد صاحب نے جو ہم دونوں کی نسبت اس جنگل سے زیادہ واقف تھے، ایک دوسری سمت تانگے کو چلوایا۔ اس سمت ہمیں سبھی قسم کے جانور ملے۔ مور، تیتر، مرغ، جھانک، چیتل۔ مگر ان حسرت سے یہاں بھی کچھ نہ بن سکا۔ مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس کوئی بندوق نہ تھی، حکیم صاحب کی بندوق مسٹر نایاب لے دوڑے تھے، ورنہ ہم ہی قسمت آزمائی کرتے۔ ملا شبراتی میں یہ عیب تھا کہ یہ تانگے سے اترتے ہی نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے کہہ سن کر انھیں تانگے سے اتارا۔ انھیں دو جھانکوں پر بندوق چلانے کا نہایت ہی اچھا موقع ملا اور انھوں نے فائر بھی کیا۔ مگر کوئی نہ مرا۔ وہ وہاں سے بھاگ کر ہمارے تانگے کے سامنے جو جھاڑ کھڑا تھا وہاں آ کر کھڑے ہو گئے اور لگے چرنے۔ مگر ہمارے پاس بندوق نہ ہونے کی وجہ سے کچھ دیر تو ہم خیر حسرت سے دیکھتے رہے، بالآخر میں تانگے سے اتر کر جھاڑ کے اندر نہایت ہی آہستگی سے گھسا اور جھاڑ کی اوٹ لیتے ہوئے جھانک کے قریب پہنچ کر اس کی ٹانگوں پر ہاتھ مارا، اتفاق سے ٹانگوں پر بھرپور ہاتھ پڑا اور جھانک اچھلا، مگر اس سے اسے کوئی نقصان پہنچا، بلکہ اس کے جھٹکے سے میں گرا، اور منھ اور جسم پر خاصی خراشیں آئیں۔ خوب دل لگی رہی اور اس کا ارمان نہ رہا کہ ہم سے کچھ نہ ہو سکا، ملا شبراتی چاروں طرف احمقوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہے اور فقط ایک عدد مور لیکر ½ ۱۲ بجے ڈیرے پر پہنچے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ دس بجے تک منشی وحید خاں ایک جھانک اور ایک مرغ مار کر دے گئے ہیں اور اس کا گوشت اور کلیجی پک رہی ہے۔ ننے خاں اور مولوی جواد حسین وغیرہ خالی ہاتھ آئے۔

ایک بجے تک کھانا کھایا، کھانے میں گوشت کی فراوانی تھی، جنگل سے عمدہ قسم کی کریم بھی منگائی تھی، اور چھاچھ تو اتنی اچھی تھی کہ ہم نے یہاں شہروں میں کبھی دیکھی بھی نہیں۔ خوب سیر ہو کر کھایا۔ دو گھنٹے قیلولہ کیا اور پھر ٹاٹ والے کے لیے روانگی کی تیاری شروع ہو گئی۔ نورا اور دوسرے ملازم ایک بیل تانگے میں بیٹھ کر ہم سے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ پونے چار بجے کے قریب ہم بھی روانہ ہو گئے راستے میں بڑا لطف رہا، تین تانگے ہمارے ساتھ تھے، مگر سوائے حکیم ظہیر علی اور مولوی سجاد حسین کے ہم سب پیدل چل رہے تھے۔ ہمارے ساتھ جنگل سے ایک تانگہ کنجڑوں کا بھی اس امید پر ساتھ ہو لیا تھا کہ اگر جنگلی سور کا شکار ہو گا تو اسے وہ اٹھا لیں گے، اس راستے میں ان کا بھی بھلا ہو گیا اور منشی وحید خاں نے ایک جنگلی سور شکار کر لیا۔ یہ اس طرح ہوا کہ ہمارے بڑے حکیم صاحب پارٹی سے بچھڑ کر تھوڑی دور اندر گھنے جنگل میں چلے گئے، وہاں کہیں ان کی نظر جنگلی سور پر پڑی، دیکھتے ہی وہاں سے لپکے، اور منشی وحید خاں کو خبر دی، خاں صاحب نے گھات لگا کر ایسی جگہ سے کہ جہاں سے وہ اسے خوب اچھی طرح دیکھ لیں مگر وہ انھیں نہ دیکھ سکے رائفل کا نہایت کارگر فائر کیا، گولی کھاتے ہی سور گرا، خانصاحب نے دو گولیاں اور ماریں اور اسے اٹھنے نہ دیا۔ قریب جا کر دیکھا تو ابھی بچہ ہی تھا، پورا سور نہیں ہوا تھا، کنجڑوں نے اسے اپنے تانگے سے باندھ لیا اور ہم لوگ پھر روانہ ہو گئے۔

چلتے چلاتے اور شکار کھیلتے کھلاتے ہم لوگ کوئی رات کے دس بجے کے بعد ٹاٹ والا پہنچے،

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ نورا اور دوسرے ملازمین جو ہمارا کھانا اور بستر وغیرہ لے کر گوجیا سے چلے تھے ابھی نہیں پہنچے، سخت تشویش ہوگئی اور جب گھنٹہ بھر اور گزر گیا تو یہ شبہ قوی ہونے لگا کہ ان لوگوں کی مڈبھیڑ ہاتھیوں کی ڈار سے ہوگئی اور انھوں نے ان سب کو چیر پھاڑ کر ڈال دیا۔ ہاتھیوں کے پاؤں کے تازے تازے نشان اور لید ہم نے بھی اس راستے میں دیکھی تھی۔ گاؤں سے ایک لالٹین لے کر دو آدمیوں کو رات ہی کو ان لوگوں کی تلاش کے لیے بھیجا گیا۔ اور ہم لوگ وہاں ڈیرے میں باہر آگ کا الاؤ جلا کر اس کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ وہاں گاؤں میں ہمارے کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہ ملا۔ محض چھوٹے چھوٹے آلو میسّر آئے۔ انھی کو راکھ میں بھُل بھلا کر کھا لیا۔ بھوک میں ان آلوؤں نے بھی بڑا لطف دیا۔ غرض ساری رات یوں ہی، بیٹھے بیٹھے کاٹ دی، صبح ہوتے ہوتے وہ دونوں آدمی جنھیں ہم نے بھیجا تھا، گوجیا سے لوٹ کر یہ خبر لائے کہ نورا اور دوسرے ملازم تو وہیں سو رہے تھے، انھیں جگا کر معلوم کیا کہ تم تو "ناٹ والا" گئے تھے، واپس کیسے آگئے۔ انھوں نے بتایا کہ خشک ندی میں داخل ہونے کے بعد بیلوں نے آگے چلنے سے انکار کر دیا، بہتیری کوشش کی مگر وہ کسی طرح بھی چل کر نہ دیے، واپس لوٹایا تو چلنے لگے۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا، ہاتھیوں اور درندوں کے ڈر سے مجبوراً واپس آگئے۔

ویسے آرام کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ رات نہایت خراب گزری، لیکن اگر آوٹ ڈور پک نِک کے خیال سے دیکھا جائے تو اس رات جیسا کبھی لُطف بھی نہیں آیا۔ ساری رات شیر و شکار کے قصے ہوتے رہے۔ ننّے خاں شکاری نے بے شمار قِصّے سُنا ڈالے اور ساری رات جاگتے ہی گزری۔

۱۲ر فروری کی صبح کو خاں صاحب نے دُودھ اور خالص تازہ مکھن کا ناشتہ کرایا اور ساڑھے آٹھ بجے تک ہم وہاں سے گولیا کے لیے روانہ ہوگئے۔ تین "تانگوں" میں شکاریوں کے مختلف گروپ علیحدہ علیحدہ سمتوں میں روانہ ہوگئے۔ اس دوران میں بندوقوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ چار میل کا فاصلہ طے ہو جانے کے بعد تینوں تانگے مل گئے۔ اس مرتبہ ننّے خاں شکاری کی بندوق نے ایک جھانک سر کر لیا تھا۔ دوسرے شکاریوں کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ حکیم جواد حسین کو مسٹر نایاب سے بڑی سخت شکایت رہی۔ ان کا بیان ہو کہ "میں نے کئی جانوروں پر بندوق چلائی، جانور زخمی ہو کر گرا اور انھوں نے چاقو لاؤ، چاقو لاؤ کا غل مچایا۔ حالاں کہ ان صاحب بہادر کو بہت مرتبہ سمجھایا کہ یہ حرکت شکاریوں کے لیے سخت تکلیف دہ ہے، مگر یہ ایک بار بھی نہ مانے۔ آئندہ میں تو انھیں اپنی پارٹی میں نہ رکھوں گا۔" نایاب صاحب کا کہنا یہ تھا کہ "ان حضرت سے ایک جانور بھی نہیں مرا، غل ہمیشہ مچاتے تھے، میں نے بیسیوں جنگلی مرغ، مور اور تیتر انھیں دکھائے، مگر انھوں نے اوّل تو گولی نہیں چلائی، اور اگر چلائی تو بس گاڑی میں بیٹھے بیٹھے۔ کچھ دور پیدل چل کر داؤں گھات لگا کر گولی چلانے کی محنت تو کبھی انھوں اُٹھائی ہی نہیں۔" میں یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ ان دونوں صاحبان میں سے کس کا بیان زیادہ صحیح تھا، مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس جنگل کے شکاری خواہ وہ ننّے خاں ہوں، مُلا شبراتی ہوں یا منشی وحید خاں، بیل تانگوں میں ہی بیٹھ کر شکار کھیلنے کے عادی تھے، میں نے تو بہت کم ان کو اُتر کر شکار کھیلتے ہوئے دیکھا۔ اور جب شکار ان کے ہاتھ سے نکل جاتا تو ان میں سے ہر شخص ایک دوسرے

پر ذمہ داری ڈال کر خود کو بری الذمہ کر لیتا۔

گیارہ بجے تک ہم لوگ گوجیا پہنچ گئے تھے، روٹی تو منشی وحید خاں کے ملازمین نے پہلے ہی سے پکا رکھی تھی، سالن ہمارے پہنچنے پر پکنا شروع ہوا اس لیے کہ شکار تو ہمارے ہمراہ تھا۔ دو بجے تک ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے آرام کرنے کے بعد ہم لوگ مختلف ٹولیوں میں تقسیم ہو کر پھر شکار کو نکل گئے، اس طرح کہ منشی وحید خاں اور مولوی جواد حسین، ٹکیوں میں مننے خاں اور مسٹر نایاب گینڈی کھاتے میں، اور ملا شبراتی (سیابڑھ میں، اور میں بابو بھی اور حکیم صاحب لہاڑپور کی لیک سے متوں میں گئے۔ مولوی سجاد اس روز ڈیرے ہی میں کھانا پکانے میں لگ گئے۔ ہمارے مولوی صاحب کھانے کے ذرا زیادہ شوقین ہیں۔ خود اپنے ہاتھ سے اچھا سالن پکا لیتے ہیں۔ دو روز سے سالن ان کی مرضی کے مطابق نہیں پکا تھا، اس لیے آج وہ قصداً رک گئے اور اپنی ذاتی نگرانی میں کھانا پکوایا۔

یہ دن ہماری پارٹی کے لیے بہت اچھا رہا، ہر ٹولی اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ شکار لائی۔ مگر ہماری ٹولی جو تمام تر غیر شکاریوں پر مشتمل تھی، سب پر بازی لے گئی۔ اپنے ڈیرے سے ہم کوئی ایک ڈیڑھ میل گئے ہوں گے کہ بہت دور سے بابو بھی نے ایک جانور دیکھا جو جنگلی بلا معلوم ہوتا تھا، ہم سب اسے بلا ہی سمجھے۔ میں نے بابو بھی سے کہا کہ میاں معلوم نہیں کہ آگے کوئی جانور ملے یا نہ ملے تم تو لگے ہاتھوں اس پر رائفل کی مشق کر لو، حکیم صاحب نے بھی کہا "ہاں ہاں بھئی مارو" اس جانور کی دم ہماری طرف تھی اور منھ دوسری طرف تھا۔ بابو نے خاصی دیر شست لگا کر جو گولی چلائی تو وہ جانور گرا اور تڑپنے لگا اس کے گرتے ہی ہم تینوں تانگے سے اتر کر اس کی طرف بھاگے۔ بابو کو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ انھوں نے کافی فاصلے سے رائفل کا نشانہ لگایا، اور وہ صحیح بیٹھ گیا۔ ہم قریب جو پہنچے تو دیکھا کہ وہ جانور جنگلی بلا نہیں، چھوٹا گلدار ہے، ہم تینوں فوراً رک گئے اور پھر الٹے پاؤں بھاگے اور تانگے میں جا بیٹھے۔ تانگہ ہانکنے والے نے کہا "چلیے اب کوئی ڈر کی بات نہیں" یہ کہہ کر ہمارے تانگے والے نے بیلوں کو مرے ہوئے گلدار کی طرف ہانک دیا اور کہا "گلدار مر گیا ہے اسے جلدی سے اٹھا کر تانگے میں رکھ لیجیے۔ بابو جی نے بڑا اچھا نشانہ لگایا، مجھے تو نظر بھی نہ آیا تھا کہ بابو مار کدھر رہے ہیں" اتنی دیر میں ہمارا تانگہ گلدار کے قریب پہنچ گیا۔ تانگے والے نے دیکھ کر بتایا کہ ابھی بچہ ہے۔ پورا گلدار نہیں ہوا یہی وجہ ہے کہ دور سے آپ کو جنگلی بلا نظر آیا۔ معاف کیجیے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی گلدار دیکھا نہیں جو اسے جنگلی بلاؤ سمجھے، ورنہ جاننے والا تو دور سے بھی دیکھ لیتا کہ یہ گلدار ہے۔ ہم نے خوشی خوشی اٹھا کر اسے تانگے میں بوریوں سے چھپا لیا اور آگے چل دیے۔ آگے جو چلے تو ایک جھانک نظر پڑا، بابو نے شست لگا کر جو رائفل چلائی تو وہ بھی وہیں رہ گیا۔ پھر کیا تھا ہم لوگ خوشی کے مارے اچھل پڑے۔ اس وقت پانچ بج چکے تھے، ہم لوگ اسی وقت ڈیرے کی طرف لوٹ آئے۔

نّنے خاں اور منشی وحید خاں کو جب معلوم ہوا کہ بابو نے نہ صرف یہ کہ جھانک مارا بلکہ ایک عدد گلدار بھی مار لیا تو انھوں نے بڑی داد دی اور غالباً اپنی جھینپ مٹانے کی خاطر یہ تجویز کی کہ ہم آج رات

چشمے پر مچان باندھیں گے۔ گلدار یا شیر آج ہمارے ڈیرے کے آس پاس ہی ہوگا۔ چناں چہ جنگل سے ایک بکری کا بچہ منگا یا گیا تاکہ رات کو اسے درخت کے نیچے باندھ کر اوپر شیر کا انتظار کریں۔ باقاعدہ مچان باندھنے کا تو کوئی بندوبست نہ ہو سکا، بکری کا بچہ درخت کے نیچے باندھ کر ننے خاں، وحید خاں، ملا شبراتی اور مولوی جواد حسین دو درختوں پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ بکری کے بچے نے چیخ چیخ کر سارا جنگل سر پر اٹھا لیا۔ ننے خاں کا بیان ہے کہ ہم نے آس پاس کی جھاڑیوں میں کھڑ کھڑاہٹ سنی اور محسوس کیا کہ شیر اپنے مخصوص انداز میں گھات لگاتا ہوا آ رہا ہے کہ اتنے میں مولوی جواد حسین کی حالت بگڑنے لگی اور وہ حضرت کھنکار دئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا ادھر تو بکری کا بچہ یہ سمجھ کر خاموش ہو گیا کہ اس کے پاس آدمی ہے اور ادھر شیر ہوشیار ہو گیا اور وہیں رُک گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ دو گھنٹے تک بیٹھے، مگر نہ بکری کا بچہ ہی بولا اور نہ شیر ہی پھر آیا۔ یہ لوگ تنگ آ کر نیچے اتر آئے۔ ہم نے ان کا بڑا مذاق اڑایا کہ میاں کہیں یوں شیر مرتے ہیں۔ تم کھلاڑیوں سے تو ہم اناڑی ہی اچھے ہیں کہ یوں ہی کھیل کود ہی میں ایک گلدار مار لیا۔ رات کو جب ہم سونے لگے تو ان شکاریوں نے ہمارے ساتھ خاصا مذاق کیا جسے ہم لوگ اس وقت نہ سمجھ سکے۔ کوئی دس بجے کے قریب جب ہم لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر دراز ہو چکے تو مولوی جواد حسین آئے اور انھوں نے کہا "آپ کے ڈیرے کے برابر بکری کا بچہ بندھا ہوا ہے۔ رات کو ذرا ہوشیار سوئیے گا۔ شیر اس کی بُو پر آئے گا۔ چوں کہ ہم نے کھنکار کے شیر کو بھگا دیا ہے، اس لیے وہ جھنجھلایا ہوا پھر رہا ہوگا، اور بکری کے بچے کی بُو پاتے ہی اِدھر آئے گا۔" ہمارے ڈیرے کی دیواریں سرکنڈے کی تھیں۔ انھیں دیکھ کر کہا: "شیر انھیں اپنے پنجوں سے چیر کر اندر آ جائے گا۔" یہ سُن کر ہم سب کچھ گھبرا سے گئے، مگر جلد ہی ہم نے اپنے اپنے پلنگ پر ایک ایک بندوق بھر کر رکھ لی کہ اگر ایسا موقع پیش آیا تو بندوق پاس رکھ کر سونے کی صورت میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے جو سوئے تو پھر صبح ہی کی خبر لائے۔ صبح اُٹھے تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ ہمارے ڈرنے پر خوب ہنس رہے ہیں۔ میں نے کہا معاف کیجیے مولوی صاحب نے تو ہم سے مذاق نہیں کیا تھا، یہ حضرت تو سنجیدہ ہی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ لوگوں نے مولوی جواد حسین کو بھی بنایا ہو۔

۲۲ فروری سنہ ۴۸ء کو ہفتے کا روز تھا، پروگرام کے مطابق اسی روز ہمیں جنگل سے واپس جانا تھا ہمارے قافلے کی روانگی دن کا کھانا کھانے کے بعد ہونی تھی، اس لیے صبح کا وقت ابھی ہمارے پاس شکار کے لیے تھا، یوں تو ہم تقریباً ہر روز ہی کبھی نہ کسی وقت قریب کے چشمے پر جا کر نہاتے تھے، مگر اس روز ہمارا پروگرام گنگا پر جا کر نہانے کا تھا، ہمارے ڈیرے سے گنگا کوئی کچھ فرلانگ کے فاصلے پر تھی صبح سات بجے تک ہم ناشتے پر بیٹھ گئے۔ آج ہم نے بسکٹ، تازہ مکھن اور خالص دودھ کا نہایت لذیذ ناشتہ کیا۔ ہم ناشتہ کر رہے تھے کہ ہمارے بالکل ہی قریب بندوق چلنے کا دھماکا ہوا، ہم نے سوچا کہ کسی نے قریب ہی سے مور مار لیا۔ مگر ایک ہی لمحے بعد ہمارے سونے کے ڈیرے میں سے ملا شبراتی بابو جی کی بندوق لیے چلے آ رہے تھے، کہنے لگے: "کیا یہ بھری ہوئی تھی؟" ہم نے کہا کہ "کیا یہ بندوق تم نے چھوڑی تھی؟" کہنے لگے "ہاں! میں بندوق کے لیے اندر آیا تھا،

بابو جی کے پلنگ پر بندوق رکھی تھی۔ میں نے یوں ہی لبلبی دبا کر دیکھا تھا کہ وہ چل پڑی تھی ـــــ اس روز خدا کا بڑا فضل ہو گیا۔ بندوق کی نال ڈیرے کی چھت کی طرف تھی، اگر کہیں ہماری طرف ہوتی تو نہ معلوم اس روز کون کون جیتا۔ ہمارے اور گولی کے درمیان بس ایک سرکنڈے کی دیوار ہی تو تھی! بابو نے ملا شبراتی کو بڑا ڈانٹا کہ میاں تم نے یہ کیا اناڑی پن کیا۔ تمھاری تو غلطی ہو جاتی اور ہم لوگ ختم ہو جاتے۔ یہ وہی بندوق تھی جو بابو نے شیر کے ڈر سے اپنے سرہانے رکھی تھی۔

آٹھ بجے تک ناشتے سے فارغ ہو کر میں، بابو جی، ناپاب اور مولوی صاحب اور ایک ملازم گنگا کی طرف نہانے چلے۔ دو بندوقیں بھی ہمارے پاس تھیں۔ راستے میں مسٹر ناپاب نے بھی بڑے بڑے کرتب دکھائے۔ ان حضرت نے ایک کلدم (بلبل) پر فائر کیا، وہ مرا تو نہیں، یوں ہی چھترے کی چھپیٹ سے نیچے گر گیا اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی، اس کے بعد اس سے اُڑا نہ گیا اور وہ زمین ہی پر بھاگتا پھرا۔ انھوں نے بہتیرا چاہا کہ اسے ماریں، مگر دو تین فائروں پر بھی وہ ان کے نشانہ کی زد میں نہ آیا۔ کچھ ان کے اناڑی پن کا بھی اس میں دخل تھا۔ گنگا کے کنارے جو پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ گنگا کے خشک حصے میں کوئی دو سو گز کے فاصلے پر کچھ گھوڑے بھاگ رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ جو ملازم تھا، اُس نے کہا "مولوی صاحب فائر کیجیے"۔ مولوی صاحب نے کہا "ارے گھوڑوں پر فائر کرا رہا ہے"۔ اس نے کہا "حضور یہ نیل گائے ہیں، گھوڑے نہیں"۔ اتنی دیر میں چاروں کی چاروں نیل گائیں جنگل کے اندر غائب ہو چکی تھیں۔ مولوی صاحب ملازم کے ساتھ جنگل میں گھس گئے مگر وہاں شیر کے تازہ تازہ پنجوں کے نشان دیکھ کر آگے جانا مناسب نہ سمجھا اور واپس آ گئے۔

گنگا پر خوب نہائے اور ساڑھے دس بجے تک واپس ڈیرے پر پہنچ گئے۔ اسی دن شام تک مولوی جواد حسین کے گاؤں منڈاذلی پہنچ گئے۔ شام کا کھانا مولوی صاحب کے ہاں کھا کر گیارہ بجے رات کو بیل تانگوں میں بیٹھ کر نجیب آباد کے اسٹیشن آ گئے اور دو بجے والی گاڑی پکڑ لی جس نے ہمیں اتوار کے دن سوا آٹھ بجے دہلی پہنچا دیا۔

برگِ حنا

مغربی سوسائٹی میں

(مسٹر جان رائنی، ایم، پی، ایس)

مشرقی ممالک بالخصوص عرب، ایران، مصر، پاکستان، ہند وغیرہ میں حنا (مہندی) کو طبی، عطری، سماجی اور شعری اعتبار سے جو اہمیت حاصل ہے اس کا تذکرہ غیر ضروری ہے۔ جہاں تک حنا اور افزائش حسن کا تعلق ہے، عربی، فارسی اور اردو کے دواوین حنا کے اذکار و اشعار سے بھرے پڑے ہیں۔ میر تقی میر فرماتے ہیں ؎

جگر خوں کُن ہیں خوبانِ حنا بند
دل ان کے دستِ رنگیں کا ہے پابند

ایک دوسرا شاعر حنا کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

عجب رسائی قسمت ہے اے حنا تیری
چمن جو چھوٹ گیا دست نازنیں میں رہی

اب دیکھیے ایک مغربی سائنس داں برگِ حنا اور اس کے صنعتی استعمال کے متعلق کیا خیالات پیش کرتا ہے۔ مصنف نے حنا کی بعض تاریخی حالتوں پر روشنی ڈال کر اس کی کیمیائی ترکیب، اور اس کے رنگ و بو سے "شیمپو" اور خضاب اور خوشبودار مرکبات وغیرہ بنانے کے چند نسخے پیش کیے ہیں۔ (ہمدرد صحت)

مہندی کے درخت کا علمی نام انگریزی میں "لوزونیا البا" (Lawsonia Alba) ہے۔ یہ درخت جس کے پتوں میں بھی رنگ و بو اور پھولوں میں بڑی خوشبو ہوتی ہے، درحقیقت عرب کا "باشندہ" ہے لیکن شمالی افریقہ، ہندستان، لنکا اور منطقہ حارہ کے دوسرے ممالک میں بھی کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ نخلِ حنا کی بلندی تقریباً نو فٹ تک ہوتی ہے، اور تیسرے سال کے آخری حصے میں اس کا نشو و نما پورا ہوتا ہے۔ اس کے سبز پتے بھی پیس کر مختلف کاموں میں لائے جاتے ہیں، اور خشک پتوں کو بھی دواؤں کے لیے یا خوشبو نکالنے کے لیے یا پیس کر سفوف بنانے اور ہاتھوں پر ملنے یا رنگ نکالنے یا خضاب تیار کرنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ اچھے پیمانے پر مہندی کی کاشت کرنے سے فی ایکڑ ۱۵ سے ۱۹ ہنڈر ڈ ویٹ تک خشک پتے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ مشہور مصنف اور ماہر نباتات ہومر نے مہندی کی نباتی خصوصیات، اور تاریخ اور طریقہ کاشت پر ایک مفصل بیان پیش کیا ہے۔ تجارتی

برگِ حنا کی بڑی مقدار مغرب میں دیکھی جاتی ہے، وہ مصر سے آتی ہے جہاں اس کی کاشت کے لیے بڑی بڑی اراضی موجود ہیں۔

مصر میں حنا کا استعمال بہت قدیم زمانے سے یعنی ہزاروں سال پہلے سے ہے۔ فراعنہ مصر کے زمانے کی شہزادیوں یا عورتوں کی جو "ممیاں" (Nummies) (مومیائی میں خشک کی ہوئی لاشیں) پائی جاتی ہیں، ان کے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن مہندی سے رنگے ہوئے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ ممی کے تابوت کے اندر مہندی کے پھول بھی موجود ہوتے ہیں۔ مصریوں میں ایک رسم یہ بھی تھی کہ وہ مہندی کے پھولوں کا خوشبودار پانی نکال کر غسل کے پانی کے ساتھ استعمال کرتے تھے، اور بعض مذہبی رسوم کے وقت بھی یہ آبِ حنا کام میں لایا جاتا تھا۔

حنا کا عبرانی نام "کوفر" ہے جس کا تذکرہ انجیل کی کتابِ سلیمانی میں پایا جاتا ہے۔ انجیل کے مترجموں نے غلطی سے اس کا ترجمہ "کافور" کر دیا تھا۔ مصری قوم زمانۂ قدیم میں کافور سے واقف نہ تھی پہلی صدی عیسوی میں پلینی (Pliny) نے اور مشہور حکیم عربی بوعلی سینا نے حنا کا تذکرہ کیا ہے۔ روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ برگِ حنا سے ہاتھوں کا رنگنا مشرق میں صرف اعلیٰ سوسائٹی کی عورتوں کے لیے مخصوص تھا، لونڈیوں کو مہندی ملنے کی اجازت غالباً نہیں تھی۔

حنا کا طبی استعمال زیادہ تر اُن ہی ممالک میں ہوتا تھا جہاں مہندی کے درختوں کی کاشت ہوتی تھی، کہا جاتا ہے کہ بہت سی یا تقریباً تمام جلدی بیماریوں کے لیے حنا مفید ہے، مگر مغرب میں اس کی تفصیلات دست یاب نہیں ہیں۔ قدیم مصریوں میں حنا کا استعمال خوشبو کے لیے بھی اور تیل اور مرہم وغیرہ کو رنگین بنانے کے لیے بھی ہوتا تھا، یعنی اس کے رنگ و بو دونوں سے کام لیا جاتا تھا۔

کیمیائی اجزا :۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ برگ حنا کی کثیر مقدار ہر سال "کاسمیٹکس" میں استعمال کی جاتی ہے یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اب تک اس کے کیمیائی اجزا کے متعلق مکمل معلومات حاصل نہیں کی گئی ہیں سنہ ۱۹۲۰ء کے "جرنل آف کیمیکل سوسائٹی" میں ٹوماسی (Tomassi) نے برگِ حنا کے رنگین بنیادی عنصر کا بیان شائع کیا تھا اور اس کا نام "لوزون" (Lawsone) رکھا تھا سنہ ۱۹۳۸ء میں کوکس نے برگِ حنا کے اجزاء کے متعلق تحقیقات کی اور یہ پتہ لگایا کہ اس کا رنگین مادہ "ہائڈروکسی نیفتھا کوئنون" (Hydroxy-Naphtha-Quinone) کا مرکب ہے جو تقریباً ½ کی مقدار میں موجود رہتا ہے۔ اس کے مضمون میں جو رسالہ "اناسلٹ" (سنہ ۱۹۳۸ء) میں شائع ہوا تھا برگِ حنا میں "کوئنون" کی مقدار معلوم کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ برگِ حنا میں ۲ فی صدی گیلک ایسڈ بھی پایا گیا ہے مگر "ٹنین" (ٹینک ایسڈ) کا پتہ نہیں ہے۔ غالباً اسی تیزاب یعنی گیلک ایسڈ کی موجودگی کے باعث عبدالعزیز حاری اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ برگِ حنا میں "ٹنین" بھی موجود ہے۔

حنا سے بالوں کو رنگنا :۔

کوکس نے اپنے مضمون کے ایک حصے میں جس کا عنوان "حنا سے بالوں کو رنگنا" ہے یہ تحریر

کیا ہے:- "حنا کے آبی جوہر میں کسی قدر تیزابی تعامل پایا جاتا "پی۔ایچ" کی مقدار ۵،۵ ہے اور ہائیڈروکسی نیفتھا کوئنون صرف اس حالت میں رنگنے کا عمل کرتا ہے جب اس میں تیزابی محلول شامل ہوتا ہے۔ روئی یا سیلولوز کے دوسرے ریشوں پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی تیزابی سیال اس کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے تو بالوں کے یا اون کے پروٹین اور حنا کے "کوئنون" میں ایک خاص تعلق اور باہمی کشش پیدا ہو جاتی ہے اور اون یا بالوں پر گہرا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ اگر بالوں پر اطمینان بخش رنگ نہ چڑھے تو سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی غلطی ہوئی ہے اور قطیر پاشی کو بے اثر دبے رنگ یا القلی بنا دیا گیا ہے۔"

پچھلے دنوں "۲-ہائیڈروکسی-۱:۴-نیفتھا کوئنون" کے فارمولے سے ۹۵ فی صدی خالص ایک مرکب تیار کیا گیا ہے اور اس کا تجارتی نام "لوزون" رکھ دیا گیا ہے۔ اس کی "رنگ آفرینی یا رنگ آمیزی" کی طاقت برگِ حنا سے ۱۰۰ یا ۱۵۰ گنی زیادہ ہے۔ اور اس سے معیاری رنگوں کا تیار کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو کسی غیر القلی چیز مثلاً ریہہ (Fuller's Earth) یعنی شوردار مٹی میں ملا دیا جائے تو اس سفوف کو "کیمیائی حنا" کے طور پر فروخت کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ "گیلک ایسڈ" موجود نہیں ہوتا جس کا وجود مہندی کے رنگ میں مداخلت کرتا ہے۔

حنا کا "شیمپو"

"شیمپو" انگریزی میں اس سیال یا روغن کو کہتے ہیں جس سے بال دھوئے جاتے ہیں۔ حنا کا شیمپو صابن ملا کر بھی بنتا ہے۔ اس کا مندرجہ ذیل فارمولا سنہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا۔

حنا کا سیال شیمپو:-

سفوف برگِ حنا ۱۰ حصے — کھولتا ہوا پانی ۱۰۰ حصے

(ایک گھنٹے تک زلال نکال کر مقطر کرو، اس کے بعد مندرجہ ذیل چیزیں ملا دو)

نرم صابن ۴۰۰ حصے جسے الکحل ۲۰۰ حصے میں گھلا کر، آخر میں مقطر پانی ۱۰۰۰ حصے ملا دو۔

اب یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ برگِ حنا کا زلال صابن کے ساتھ نہیں بلکہ تھوڑا سا سائٹرک ایسڈ ملا کر تیار کیا جائے۔ حنا کا ایک اچھا مرتکز محلول مندرجہ ذیل طریقہ پر تیار کیا جا سکتا ہے:-

سفوف برگِ حنا ۱ حصہ — کھولتا ہوا مقطر پانی ۵ حصے

۱۰ گھنٹے بعد زلال نکال لیجیے۔ اور سفوف کو نچوڑیے۔

اس محلول کو کلوروفارم یا "بنزوئک ایسڈ" کے الکحلی مرکب میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ وقت ضرورت پر ایک حصے کو دس حصے ناریل کے تیل کے شیمپو میں، یا کسی بے صابن والے شیمپو میں ملا دیا جائے۔

صابن والا یا بے صابن والا شیمپو بنانے کے لیے سفوف برگِ حنا کی جگہ کیمیائی تجارتی "لوزون" بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بعض مرتبہ یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ جب بے صابن کے شیمپو کے ساتھ "لوزون" استعمال کیا جائے، تو اس میں "بورک ایسڈ" ملانا چاہیے، لیکن بہتر یہ ہے کہ "سائٹرک ایسڈ" ملایا جائے، کیوں کہ اس میں کسی قسم کی سمیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ جدید [illegible]

ریسرچ سے ثابت ہوا ہے کہ بورک ایسڈ جب جلد پر لگایا جاتا ہے تو سمیت پیدا ہوتی ہے، اس لیے "بورک ایسڈ مرہم" کی طاقت کو سرکاری طور پر کم کر دیا گیا ہے۔

حنا شیمپو پوڈر کا نسخہ مندرجۂ ذیل ہے:۔

سفوف صابن	۹ حصّے	سوڈا کاربونیٹ اکزک	۳ حصّے
سفوف بوراکس	۳ "	سفوف برگ حنا	۱٫۵ "

یہ نسخہ بھی ۱۹۴۴ء میں لندن کے "فارماسیوٹیکل فارمولاز" میں شائع ہوا تھا۔ اس سے بھی زیادہ جدید فارمولا یہ ہوگا۔ سفوف برگ حنا، یا موزوں، اور بے صابن کا شیمپو پوڈر اور ذرا سا سائٹرک ایسڈ آپس میں ملا دیا جائے۔

خضاب:۔

بالوں میں لگانے کے لیے خضاب کے طور پر سفوف برگ حنا گرم پانی میں لئی بنا کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس سفوف کو اُبلتے ہوئے گرم پانی میں دس منٹ تک رکھتے ہیں تاکہ اچھی طرح رنگ نکل آئے۔ جتنی دیر تک لسے بالوں پر لگا ہوا چھوڑ دیا جاتا ہے اُتنا ہی گہرا رنگ چڑھ جاتا ہے۔

حنا کا خضاب ہلکے بھورے رنگ سے لے کر سیاہ رنگ کے مختلف درجوں میں تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس کام کے لیے مختلف مقداروں میں مندرجۂ ذیل چیزیں ملائی پڑتی ہیں:۔

پائروگیلک ایسڈ ۵ سے ۱۵ فی صدی تک کاپرسلفیٹ ۵ سے ۱۰ فی صدی تک۔

بالوں کو پلیٹینم یا خاکستری رنگ دینے کے لیے مغربی عورتیں میگنیشیم کاربونیٹ اور امونیا اور ہائڈروجن پیروکسائڈ کا محلول استعمال کرتی ہیں جسے "سفید حنا" کا نام دیدیا گیا ہے۔ مشرق میں حنا اور نیل ملا کر خضاب تیار کرتے ہیں۔ مہندی اور وسمے کا خضاب سب سے آسان سمجھا جاتا ہے۔

بالوں کو چمکیلا بنانے کے لیے حنائی مرکب

سفوف برگ حنا ۵ اونس معدنی تیل ایک گیلن خوشبو حسب ضرورت

یہ مرکب ۱۲ گھنٹوں میں تیار ہوتا ہے اور مقطر کرنے کے بعد اس میں خوشبو ملا دی جاتی ہے۔ یہ بالوں کو رنگنے کے لیے نہیں بلکہ صرف چمکانے اور دلکش بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور مغربی سوسائٹی میں بہت ہر دل عزیز ہے۔

(بقیہ ص ۵۲ "فلسطین میں پھلوں کی کاشت")

اور سُرخ رنگ کی مکڑیاں اور چند دوسرے نباتی کیڑے ہیں جو فصلوں کو تباہ کرتے ہیں۔ یہ کیڑے سنتروں کے علاوہ انجیر اور انگور پر بھی حملہ کرتے ہیں، اور سنترے کے چھلکے میں سوراخ کرکے پھپھوندی پیدا کرتے ہیں۔ اب انھیں سیال ہائیڈروسینک ایسڈ کی دھونی سے کنٹرول کیا جانے لگا ہے۔

اپنی آنکھوں کی حفاظت کیجیے

محمد ابراہیم خلیل۔ طالب علم ایڈورڈز کالج۔ پشاور

۱ — تازہ ہوا آنکھوں کے لیے غایت درجہ مفید ہی۔ ہمیشہ دریچے کھول کر سویا کیجیے۔

۲ — ایسے کمرے میں کام کیجیے جہاں روشنی کا مناسب بندوبست ہو۔

۳ — کھڑکی کی طرف بیٹھ کر یا چہرا کھڑکی کی طرف رکھ کر کسی مطالعے میں مصروف نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ممکن ہوسکے تو روشنی کو بائیں جانب سے آنا چاہیے۔

۴ — سورج کی تیز روشنی میں اور شام کے وقت دھندلی روشنی میں پڑھنا نہیں چاہیے۔

۵ — آپ کی آنکھ اور تحریر کے درمیان نہ تو بہت کم فاصلہ ہو نہ بہت زیادہ، کیوں کہ خطرہ ہی کہ آپ "نزدیک بین" ہوجائیں۔ کم از کم چودہ انچ کا فاصلہ آنکھ اور تحریر کے درمیان ہونا چاہیے۔

۶ — آنکھوں کو ہاتھ یا غیر صاف کپڑے سے نہیں چھونا چاہیے، بالخصوص جب کہ آپ کا ربنکل یا کسی دوسری جلدی امراض میں مبتلا ہوں۔

۷ — عام اور سستے چشمے نہ خریدیے۔ یاد رکھیے کہ آنکھوں کے امراض کا خصوصی ماہر ہی یقین و صحت کے ساتھ مناسبِ حال اور تسلی بخش عینک تجویز کرسکتا ہی۔

۸ — آنکھوں کی معمولی سی تکلیف کو بھی نظر انداز نہ کیجیے۔ تکلیف کے وقت کسی اچھے حکیم سے اور ضرورت ہو تو آنکھوں کے خصوصی ماہر سے مشورہ کیجیے۔

۹ — ہمہ وقت باریک چیزوں کو نہ پڑھیے اور نہ دیکھیے۔ اگر کام کی نوعیت ایسا کرنے کے لیے آپ کو مجبور رکھے تو اس اصول کو ہمیشہ یاد رکھیے کہ ہر ۱۰ یا ۱۵ منٹ کے بعد ۲ یا ۳ منٹ کے لیے دُور کی چیزوں کو دیکھا کریں۔ باریک بینی سے مطالعہ کرنے والوں کو سبزہ زار یا کھلے میدانوں میں حدِ نظر تک نظر آسکنے والی چیزوں کو دیکھنا، آنکھوں کی تکلیف سے بچاتا ہی۔

۱۰ — اس کا خیال رکھیے کہ آپ کی غذا میں سبزیاں، ترکاریاں یا پھل اور دودھ، چھاچھ ضرور شامل ہوں۔

۱۱ — تیز روشنی اور گرد و غبار سے آنکھوں کو بچانے کے لیے حفاظتی عینک استعمال کیجیے جو اچھی قسم کی ہو۔

۱۲ — اس کا خیال رکھیے کہ آپ کو قبض نہ رہے۔

۱۳ — آنکھوں کو صبح اور رات کو صاف اور تازہ پانی سے دھونا آنکھوں کو بیمار نہیں ہونے دے گا۔

۱۴ — رات کو سوتے وقت کسی عمدہ اور باریک سرمہ کا استعمال کرنا بات تو مشرقی ہی لیکن آنکھوں کے سارے مغربی لوشنوں اور "آنکھیں دھونے والے پانیوں" سے مفید چیز ہی۔ رات کو سرمہ لگاتے وقت سستی نہ کیجیے۔

۱۵ — سنیما کا ماحول اور بعض اوقات خود سنیما بینی دونوں آنکھوں کو تباہ کرنے والے ہیں۔ ان سے بچنے کی کوشش کیجیے۔

خوشہ چینیاں

چیچک سے ڈرا کر ویکسی نیشن کا پروپیگنڈہ

شہر نیویارک میں جو چیچک کا زور ہوا تو کچھ لوگوں نے ریاست نیوجرسی کے تعلیمی بورڈوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے ہاں چیچک کا ٹیکا لگوانے کا اہتمام کریں بعض لوگوں نے ساری ریاست میں چیچک کا چرچا کچھ اس انداز سے کرنا شروع کر دیا کہ ویکسی نیشن کچھ ضروری معلوم ہونے لگا۔ مگر سمجھ دار اور تعلیم یافتہ طبقے نے چیچک کے خوف کی اس بڑھتی ہوئی لہر کا نہایت کامیابی سے مقابلہ کیا اور ریاست کے عام باشندوں اور حکومت کو بتایا کہ اس سارے پروپیگنڈہ کی تہ میں کچھ تجارتی کمپنیوں کے مفادات مضمر ہیں انھوں نے جو سیرم اور ویکسین بنا رکھے ہیں وہ انھیں ملک میں کھپانے کی خاطر ملک کے طول و عرض میں یہ خوف پھیلا رہی ہیں تاکہ ویکسی نیشن کو لازمی قرار دیا جائے مگر ریاست میں معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوا۔

وہاں اس خوف کی مہم شروع ہوتے ہی چیچک کے ٹیکے کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا اور ایک منظم گروہ ایسا اٹھ کھڑا ہوا جس نے پبلک کو ویکسی نیشن سے آگاہ کیا اور اس کے نقصانات کی لمبی چوڑی فہرست گنوا دی۔ اخبارات نے بھی ویکسی نیشن کے نقصانات پر روشنی ڈالی اور ایسے بہت سے مریضوں کے حالات سامنے آنے لگے جو محض ٹیکا لگوانے کے بعد بیمار ہوئے تھے۔

(اسٹی زنس میڈیکل ریفرنس بیورو بلیٹن)

نکوٹین اور قلبی بیماریاں

ڈیٹ رائٹ، اوہیو کے ڈاکٹر جے ڈی وارنی نے حال ہی میں بتایا ہے کہ جدید تحقیقات کی رُو سے نکوٹین قلبی عوارض اور سرطان (کینسر) ہی کی پیدائش کا موجب نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے بالواسطہ دوسری بیماریاں بھی معرض وجود میں آ رہی ہیں۔ اس نے امریکن انسٹی ٹیوٹ آف ہومیوپیتھی میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ سائنس داں "یہ ثابت کر رہے ہیں کہ دواؤں میں نکوٹین سب سے زیادہ خوفناک زہر ہے"۔

اس نے کہا تمباکو کے دھوئیں کی پھیپھڑوں میں لگاتار آرہا ہے جس سے نالیوں اور پھیپھڑے میں خراش مزمن اختیار کر لیتی ہے اور سرطان کے لیے اس سارے علاقے کی زمین ہموار ہو جاتی ہے۔

متعدد طبی تحقیقات کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر وارنی نے بتایا کہ یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ تمباکو نوشی کی کثرت سے شریانوں میں سکڑن پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس کا اثر قلب پر دباؤ کی صورت میں پڑتا ہے یہاں تک کہ وہ معمول سے پچاس گنا فی فٹ زیادہ تیزی سے خون پھینکنے لگتا ہے۔ (دی نیویارک سن)

ایک سو ایک سال کی عمر میں بیلداری کا مشقت طلب کام

جوانوں مات کر دیا

آئیس ٹیشیوگیٹن کی عمر اس وقت ۱۰۱ سال کی ہے وہ چونہ بنانے کا کرتیڈ کام اب بھی بلاتکلف کرتا ہے گیٹن ۶ ۱۸۴۶ء میں اشہر بیگی میں پیدا ہوا تھا وہ کہتا ہے کہ میری صحت اور طاقت کا راز اس میں ہے کہ میں خوب کام کرتا ہوں اور خوب ہی سوتا ہوں۔ اس کے اب بھی کچھ دانت باقی ہیں جن سے وہ خوب گوشت کھاتا ہے۔ ۱۸۹۰ء میں امریکا آیا تھا اور کنگس ولا میں پہلا فریم ہاؤس اس نے بنایا تھا۔

(سین انٹونیو لائٹ)

سوال وجواب

حکیم محمد سعید دہلوی

زنانے لباس کی پسندیدگی اور مرد:۔

سوال: میں نے علی گڑھ سے ایم۔اے کیا ہے اور انگلستان اور امریکا کی سیر بھی کر آیا ہوں۔ علی گڑھ میں میں نے ڈراموں میں اکثر عورت کا پارٹ کیا ہے۔ اس کے بعد سے مجھے عورتوں کا لباس پہننے میں ایک خاص قسم کا لطف آنے لگا۔ چنانچہ جب بھی ہمارے ہاں کالج میں کوئی تقریب ہوتی اور اس میں ڈرامہ کیا جاتا، میں نہایت خوشی سے عورت کا پارٹ لیتا اور پہلے ہی روز سے ریہرسل میں ساڑھی باندھ کر پارٹ کرتا۔ پھر میں نے اپنے اس شوق کو اس طرح پورا کیا کہ رات کو جب سونے کے لیے لیٹتا تو زنانے لباس میں سوتا، میرے چند دوستوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے میری اس حرکت کا نہ صرف مذاق اڑایا، بلکہ اسے میری آئندہ ازدواجی زندگی کے لیے خطرناک بتایا۔ میں نے امریکا میں دیکھا کہ وہاں عورتیں عام طور پر مردوں کا لباس پہن کر بازاروں میں پھرتی ہیں۔ وہ کوٹ پتلون اور ٹائی وغیرہ باقاعدہ پہن کر نکلتی ہیں اور اب ان پر کوئی انگلی نہیں اٹھاتا۔ البتہ ابھی مردوں کو عورتوں کے لباس میں پھرتا نہیں دیکھا، اگرچہ لوگوں سے ملنے اور گفتگو کرنے سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ بعض مرد عورتوں کا لباس پہن کر بازاروں میں نکلنا چاہتے ہیں، مگر معیوب سمجھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

میں نے اس مسئلے پر کافی غور کیا، میں نہیں سمجھتا کہ سماج یا حکومت کو انسان کی اس ذاتی خواہش پر پابندی لگانی چاہیے۔ کیا آپ اپنے وسیع علم اور تجربے کی مدد سے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے؟ یہ واضح رہے کہ میری شادی ہو چکی ہے اور میں دو عدد بچوں کا باپ بھی ہوں۔

(ہمدرد صحت کا ایک پرانا خریدار)

جواب: خدا کا شکر کیجیے کہ ڈراموں میں زنانہ پارٹ کی اداکاری کے اثرات زنانے لباس کی پسندیدگی ہی تک محدود رہے، ورنہ اگر کہیں اس کا اثر آپ کے نظامِ غدد پر پڑ جاتا تو کچھ عجب نہ تھا کہ چند ہی ماہ کے اندر آپ کی قلبِ ماہیت ہو جاتی اور آئندہ آپ کو مستقلاً زنانہ لباس ہی پہننا پڑتا۔ ایسی غیر معمولی اور خرقِ عادت انقلابی تبدیلیوں کو دیکھ کر تو کسی شاعر نے کہا ہے ؎

عجب نہیں کہ زمانے کے انقلاب سے ہم　　　تیمم آب سے اور خاک سے وضو کرتے

اور اب بھی مجھے تو اندیشہ ہے کہ صنفِ نازک کے لباس میں اس قدر گہری دلچسپی کے اثرات کہیں عضو کے جسم تک نہ پہنچ جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو زنانہ لباس پہننے کی خواہش تو بلاشبہ پوری ہو جائے گی، مگر کیا اس قلبِ ماہیت کی بعد کی الجھنیں اور ذمہ داریاں بھی آپ اٹھا لیں گے؟ ـــــــ اور ذاتی خواہش کے بالکلیہ آزاد ہونے کی بھی ایک ہی رہی، گویا آپ کے نزدیک اگر ایک شخص غلاظت کھانے لگے یا اپنے جسم و اعضا کو نقصان پہنچانے لگے تو کسی کو کیا حق ہے کہ اس کے اس ذاتی فعل پر کسی قسم کی روک ٹوک لگائے؟

بہت خوب! حریتِ فکر و عمل کے اس اچھوتے تصور کی ہوا بھی امریکا اور انگلستان جیسے پرانے اور قدیم قسم کے آزاد ملکوں کو نہ لگی ہوگی ـــــ کیوں نہ ہو چشمِ بد دُور، ہمارا ملک تو ابھی نیا نیا آزاد ہوا ہے اور امریکا اور یورپ تو ہمیشہ ہی کے آزاد ہیں۔ یہ کیا جانیں کہ مقید اور آزاد میں دراصل فرق کیا ہونا چاہیے۔

جو کچھ میں نے مندرجۂ بالا سطروں میں لکھا ہے آپ اسے محض تفنن اور مذاق پر محمول نہ کیجیے۔ عورتوں کا مردوں کے لباس پہننا اور مردوں کا عورتوں کے لباس زیبِ تن کرنا یا اس کی تمنا کرنا صحتِ ذوق میں بگاڑ اور خرابی پیدا ہو جانے کی صریح علامت ہے۔ حیاتیاتی اور تاریخی نقطۂ نظر سے اس مسئلے پر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ انتخابِ لباس کی تہ میں بھی جس چیز نے غیر شعوری طور پر ابتدا ہی سے کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ مرد اور عورت میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش (Sex-appeal) پائی جائے تاکہ توالد و تناسل کا مقصدی کام چلتا رہے اور نسلِ انسانی میں فرق نہ آئے۔

حیوانات اور پرندوں کے مطالعہ سے بھی ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قدرت کا یہ قانون جانوروں پر بھی اسی طرح عائد ہے جس طرح انسانی زندگی پر ہے۔ ان کے نر و مادہ کی جسمانی ساخت اور پروں کی بالائی پوشش میں قدرت کی طرف سے صنفی کشش پیدا کرنے کی پوری پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ مرغ اور مور کی کلغی، شیر کی ایال، اور اسی طرح مچھلیوں کے گوناگوں رنگ اسی صنفی کشش کو قائم رکھنے کے لیے تو ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ امریکی ہرن اور بارہ سنگھے کے سینگ بھی موسمی ہوتے ہیں۔ وہ اگتے ہی اس خاص زمانے میں ہیں جب ان کے "میل کھانے" کا وقت آتا ہے اور بعد میں خود بہ خود جھڑ جاتے ہیں۔

انسان چونکہ ذوی العقول ہے۔ اس لیے ابتدائے آفرینش ہی سے جیسے جیسے اس میں تعقل بڑھتا گیا اور وہ وحشت سے مدنیت کی طرف آتا گیا اس نے بدن ڈھکنے کے لیے مختلف چیزوں کا استعمال کیا: جانوروں کے پروں اور کھالوں، درختوں کی چھالوں اور روئی وغیرہ سے سرد ممالک کے رہنے والوں نے اپنے جسموں کو ڈھکا، اور گرم ممالک کے رہنے والوں نے سورج کی تپش اور کیڑے مکوڑوں سے بچنے کے لیے اپنے جسموں کو مٹی سے لیپا۔ ابتدائی دور کے لوگ اپنے لباسوں کے انتخاب میں جانوروں کی نقل کیا کرتے تھے۔ بعض لوگ شیر کی کھال پہنتے تھے اور سر پر شیر کی کھوپری کی ٹوپی اوڑھتے تھے۔ کچھ سانڈوں اور بھینسوں کے سینگ اپنی پیشانی پر لگاتے تھے۔ شمالی انڈین سر پر عقاب کے پر لگاتے تھے اور گلے میں ریچھ کے پنجوں کے ہار پہنتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کے استعمال سے انھیں اپنے جسموں کو سردی یا گرمی کی شدت سے محفوظ کرنا نہیں تھا بلکہ ان کا کچھ دوسرا مصرف بھی تھا۔ وہ دراصل ان لباسی زینتوں سے صنفِ نازک پر اپنی بہادری کا سکہ بٹھانا چاہتے تھے۔ وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ خوف ناک جانوروں اور درندوں سے ہمارا مقابلہ ہی نہیں ہوا، بلکہ ہم نے انھیں ہلاک بھی کیا ہے۔ چناں چہ سینگوں، کھالوں اور پروں کی جو یہ نشانیاں ہم لگائے ہوئے ہیں، یہ ان ہی ہلاک کردہ جانوروں کی تو ہیں۔ اس طرح ان کے مرد اور بہادر ہونے کا یہ گویا ایک اعلان تھا جو وہ کرتے تھے تاکہ عورت انھیں بہادری اور قوت کا مظہر سمجھ کر اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دے۔ قرونِ وسطیٰ کی یورپین معاشرت سے پتہ چلتا ہے کہ یہی حال

وہاں عورتوں کا تھا، وہ اپنی صنفی کشش کو بڑھانے کے لیے اپنے سینے اور کولھوں میں کپڑے کی گدیاں رکھ کر ان میں مصنوعی طور پر ابھار پیدا کرتی تھیں۔ یہ گویا ان کی طرف سے اس بات کا اعلان تھا کہ ہم میں بچے جننے اور ماں بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

بعد میں اپنی صنفی کشش کو دو بالا کرنے کے لیے اگر عورتوں نے خوشبو، باریک ریشمی لباس اور سونے چاندی کے زیورات کا استعمال کیا تو مردوں نے بھی زرہ بکتر، جوشن اور دیگر آلاتِ حرب اپنے جسم پر سجا کر اپنی صنفی کشش کو بڑھایا۔ غرض انیسویں صدی تک مغربی تہذیب میں بھی مرد کی حیثیت قوام ہی کی رہی۔ عورت اپنی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے مرد ہی کی طرف دیکھتی تھی، اور اسی کو اپنا نگراں و محافظ گردانتی تھی۔ مرد نے کبھی اسے گوارا نہیں کیا کہ کوئی عورت مستقلاً مردانہ لباس پہنا کرے، اور اگر کبھی کسی عورت نے ایسا کرنے کی جرأت بھی کی تو اسے سزا دی جاتی اور ہلاک تک کر دیا جاتا تھا۔ فرانس میں جون آف آرک پر سب سے بڑا الزام یہی تو لگایا گیا تھا کہ وہ مردانہ لباس پہنتی تھی۔ اسی طرح سوسائٹی میں ایسے مردوں کی کوئی وقعت نہ ہوتی تھی جو زنانہ لباس پہننا چاہتے ہوں۔ وہ زنانہ لباس میں باہر نکل کر کام ہی نہیں کر سکتے تھے۔ چناں چہ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں تو آج تک بھی مردوں کا عورتوں کے لباس اور عورتوں کا مردوں کے لباس پہننا قانوناً ممنوع ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس قانون کا نفاذ عملاً مردوں ہی پر ہوتا ہے اور عورتوں پر نہیں۔

یہ انقلاب بہ حال انیسویں صدی سے شروع ہوا ہے جب سے یورپ میں آزادیٔ نسواں کی تحریک نے زور پکڑا۔ اگر یہ تحریک اپنی جائز حدود میں رہتی تو بلاشبہ یہ ایک صحیح تحریک تھی اس لیے کہ انیسویں صدی سے پہلے کے یورپ میں عورتیں نہایت پس ماندہ حالت میں تھیں اور فی الواقع اس کی ضرورت تھی کہ ان کے جائز حقوق کی بحالی کے لیے جد و جہد کی جائے۔ مگر چوں کہ لوگوں کے سامنے صحیح نشانِ منزل اور مقصدِ زندگی نہ تھا اس لیے اس تحریک نے بھی بلا روک ٹوک پیش قدمی شروع کر دی۔ آزادی برائے آزادی کا "مقدس" جذبہ کار فرما تھا، بھلا اس پر کسی قسم کا بریک کیسے لگایا جا سکتا تھا۔ یہ بڑھا اور خوب بڑھا، اب عورت مرد کے برابر ہی نہ تھی، بلکہ بہتر سمجھی جانے لگی۔ چناں چہ انگریزی زبان میں بیوی کے "نصف بہتر" (Better half) کی اصطلاح اسی تخیل کی پیداوار ہے۔ اس کے بعد سے عورتوں نے ان سب کاموں اور کھیلوں سے دل چسپی لینی شروع کر دی جو خالص مردوں ہی کے کرنے کے تھے۔ انھوں نے موٹر چلانی سیکھی۔ مردوں کے دوش بدوش دفتروں میں کام کیا۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ ہوائی جہاز تک عورتیں نہایت شوق کے ساتھ چلاتی ہیں۔ جب کام کرنے لگیں تو لباس بھی مردانہ پہننے لگیں۔ اس وقت امریکا میں دس میں سے آٹھ لڑکیاں مردانہ لباس پہنے پھرتی ہیں، حالاں کہ قانوناً ایسا کرنا اب بھی ممنوع ہے۔

غرض یورپ اور امریکا میں ابھی تیس چالیس سال کے اندر اندر عورت زندگی کے تمام معاملات میں مردوں پر چھائی ہے اور اب تو ان کے برتاؤ سے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ اس کائنات میں اصل اہمیت عورت ہی کی ہے اور مرد تو بچارہ اس کے ایک ضمیمے یا طفیلی کی حیثیت رکھتا ہے۔ بعض کیڑوں مکوڑوں اور مچھلیوں میں ایسی مثالیں موجود ہیں مثلاً ایک کیڑا ایسا پایا جاتا ہے جس کا نر نسبتاً بہت چھوٹا اور غیر اہم

ہوتا ہو اور اس کا کام فقط اتنا ہوتا ہو کہ وہ مادہ کو حاملہ کردے جس کے بعد مادہ اسے کھا جاتی ہو۔ اسی طرح ایک قسم کی مچھلی کے متعلق کبھی ایسا ہی سنا جاتا ہو۔ اس کا نر بہت چھوٹا ہوتا ہو اور وہ اپنی مادہ کے جسم کے ساتھ لگا رہتا ہو۔ اس کا کام بھی اتنا ہی ہوتا ہو کہ وہ اپنی مادہ کو حاملہ کردیا کرے اور بس۔ میں انسان کے اس غیر فطری انقلابِ حال کو دیکھتا ہوں تو یہ سوچتا ہوں کہ کہیں انسانی نسل آہستہ آہستہ کسی اسی قسم کی تبدیلی کی طرف تو نہیں بڑھ رہی ہو؟ انسانی سوسائٹی اور معاشرہ میں مرد کی قوامیت کا ختم ہونا اور عورت کی برتری کا تسلیم کیا جانا کہیں انجام کار مرد کو بھی عورت کا ضمیمہ نہ بنا ڈالے؟

اب تک جس صورتِ حال پر میں نے بحث کی ہو، اس میں عورتوں کے مردانے کام کرنے اور مردوں کے لباس پہننے ہی کا ذکر آیا ہو۔ مردوں کے زنانہ لباس پہننے کے شوق کا تذکرہ کہیں نہیں ہوا اس لیے کہ یورپ و امریکا میں اس کا ابھی کوئی چرچا نہیں، بلکہ ان مغربی ممالک کی بعض اصلاحی تحریکوں سے تو یہ اندازہ ہوتا ہو کہ یہاں کے مرد باشندے عورتوں کی اس جارحانہ پیش قدمی کو جسے انھوں نے شروع میں معصوم محض سمجھ کر بہت پسند کیا تھا، اب نفرت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر عورت کو استقلالِ معاش اور بے لگام آزادی میسّر آگئی تو مرد کی قوامیت بالکل ہی ختم ہو جائے اور یہ بیچارہ عبرت روزگار بن کے رہ جائے گا۔ بہرحال عورت کی موجودہ پیش قدمی کے خلاف مرد کی جانب سے اتنی بھی مزاحمت ہوتی رہی تو ممکن ہو اس کی قوامیت ختم ہونے میں کچھ تھوڑی بہت دیر لگ جائے۔ مگر آپ کے روشن اور ترقی پسند خیالات سے تو یہ اندازہ ہوتا ہو کہ اس معاملے میں آپ کو مردوں کی اتنی بھی مزاحمت گوارا نہیں، اس لیے کہ جب مرد بھی عورتوں کے لباس میں رہنے لگیں گے اور اس تحریک کو آگے بڑھانے اور مقبول بنانے کے لیے آپ جیسے مردانِ کار میسّر آجائیں گے تو اس دن کو بس آیا ہی سمجھیے جب جناب بھی اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ محض ایک ضمیمے کے طور پر لگے ہوئے ہوں گے۔ کہیے یہی مقصود ہو نا آپ کا؟ واللہ داد دیجیے، ہم نے بھی کیسی مشکل پہیلی بوجھی ہو!

پھر آپ ہی بتائیے کہ شکر کا نعم البدل کیا ہو؟

سوال:۔ ستمبر سنہ ۱۹۴۷ء کے ہمدردِ صحت میں حکیم اقبال حسین کا لکھا ہوا ایک مضمون بہ عنوان "گنا" نظر سے گزرا۔ شکر کی خرابیوں اور اچھائیوں کو موصوف نے بہت اچھی طرح واضح کیا ہو۔ اب سوال یہ ہو کہ اگر شکر واقعی مضرِ صحت ہو اور اس کا ترک ضروری ہو تو اس کے ساتھ یہ بھی تو بتائیے کہ اس کے بجائے اور کیا چیز استعمال کی جائے۔ کیوں کہ پاکستان میں تو ویسے بھی چینی کی کمی ہو۔ اس کا صحیح بدل معلوم ہو جائے گا تو بہت ہی فائدہ ہوگا۔ راشن میں ڈیڑھ چھٹانک فی کس فی ہفتہ میسّر آتی ہو، اس لیے جب سے دہلی چھوڑی ہو، شکر اور گڑ ہی استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ مٹھاس کبھی استعمال ہی نہ کی جائے۔ چینی نہ ملے تو آخر چائے میں اور کیا چیز ڈال کر پی جائے۔ یہاں صحیح ذائقہ کا بھی تو مسئلہ ہو۔ حکیم اقبال حسین صاحب خود ہی اس کا جواب دیں تو زیادہ اچھا ہو۔

عبدالستار قریشی - لاہور

جواب: میں نے تو اپنے مضمون میں جہاں دانے دار کو مضر بتایا ہے، وہاں اس کا بدل بھی بتادیا ہے۔ آپ نے شاید غور سے مضمون نہیں پڑھا۔ میں نے لکھا ہے کہ گھروں میں دانے دار چینی کے بجائے لال کھانڈ استعمال کی جا سکتی ہے۔ روزمرہ کے استعمال کے لیے یہ چیز سب سے اچھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ چا، پینے والوں پر اس کا استعمال بڑا گراں ہے کہ لال کھانڈ چا، میں کسی طرح نہیں کھپ سکتی، اوّل تو چا، پینا ہی کونسا اچھا ہے کہ اس میں دانے دار چینی ڈال کر اور اسے مضر بنایا جائے۔ بہرحال اگر کوئی عادی ہو اور میرے اس خشک وعظ پر ناک بھوں چڑھائے تو لیجیے میں تھوڑی سی چینی کو اضطراراً "حلال" کیے دیتا ہوں۔ باقی دوسری چیزوں میں تو بہتر یہی ہے کہ لال کھانڈ کا استعمال کیا جائے۔

اس وقت دانے دار شکر کے معاملے میں پاکستانیوں پر جو سختی گزر رہی ہے اسے وہ سختی، اسی وقت تک سمجھ رہے ہیں جب تک وہ سفید دانے دار چینی کو مضر نہیں سمجھتے۔ کھجلی کی وبا کے اس قدر عام ہونے کا ایک سبب سفید دار چینی بھی ہے۔ کوئی پندرہ بیس سال سے امریکن بیج سے جو گنا تیار کیا جا رہا ہے تحقیق یہ ہے کہ ملک میں اس کی کاشت کی ابتدا، اور کھجلی کے وبائے عام ہونے کی ابتدا، تقریباً ایک ہی ساتھ ہوئی ہے۔ اگر انھیں یقین ہو جائے کہ یہ سفید دانے دار چینی واقعی ایک مضر شی ہے تو غالباً وہ اس سختی کو لباغنیمت سمجھیں۔

ان لوگوں کے ذکر کو چھوڑیے جو ذوق اور ذائقہ پر ہر چیز کو قربان کر دینا چاہتے ہیں۔ میرا روئے سخن تو ان صحیح الدماغ لوگوں کی طرف ہے جو صحت و تن درستی کو ہر حال میں مقدم رکھنے کو تیار ہیں، مگر لال کھانڈ سے جو میٹھی چیزیں بنائی جاتی ہیں، وہ خوش ذائقہ ہونے کے اعتبار سے کسی طرح کم تر درجے کی نہیں ہوتیں۔ اس کے خلاف ذوقی اختلاف کے علاوہ اور کوئی ٹھوس دلیل نہیں دی جا سکتی۔ اس ذوقی اختلاف پر مجھے اپنے عزیز دوست مولوی سجاد حسین صاحب کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ہمارے ہی حلقۂ احباب میں سے کسی نے ہم سب کو انگریزی کھانے کی ضیافت پر ایک ہوٹل میں مدعو کیا۔ بہت سی چیزیں جن پر کچھ دوسرے انگریز قسم کے لوگ انگلیاں چاٹ رہے تھے، ہمارے مولوی صاحب بیچارے اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے سخت بیزار معلوم ہوتے تھے، چناں چہ اخیر میں ایک میٹھی چیز آئی اور جسے ایک صاحب نے نہایت خوش ہو کر کھایا، اور مولوی صاحب سے بھی کہا کہ اسے تو ضرور کھائیے، بہت ہی اچھی ہے۔ مولوی صاحب نے جو اس کا ایک چمچہ لیا تو بس قے کر دینے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ کہتے تھے بلا مبالغہ تمباکو کی سی بو آتی تھی۔ تو جناب ذوقی اختلاف کی تو یہ حقیقت ہے۔ اسے تو آپ کسی چیز کے لیے بھی معیار نہیں بنا سکتے۔ (حکیم اقبال حسین)

مجھے دق ہوگئی ہے

سوال: عرصہ چھ (۶) ماہ سے میں آپ کا رسالہ ہمدرد صحت پڑھ رہی ہوں۔ اس میں بہت کارآمد باتیں لکھی ہوتی ہیں۔ بہت سی بیماریوں کے علاج بھی لکھے دیجیے۔ اس لیے آج میں بھی آپ کو اپنی بیماری کا حال لکھ کر مشورہ کرنا چاہتی ہوں۔ اصل میں تو میں دس سال سے بیمار ہوں۔ یہ تکلیف مجھے زچگی کے ساتھ شروع

ہوئی تھی۔ شروع میں طبیعت بہت سست رہنے لگی اور بخار سا رہنے لگا۔ بخار کا احساس عام طور پر چار بجے کے بعد سے ہوتا تھا۔ اس وقت جب بھی تھرمامیٹر لگایا تو ۹۹ سے کم بخار نہ نکلا۔ ویسے سارے دن طبیعت اچھی رہتی۔ اسی دوران میں میں نے ڈاکٹری علاج شروع کیا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص یہ ہوئی کہ میرے پھیپھڑے کمزور ہو گئے ہیں اور دق کے آثار پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ بہت سی طاقت کی دوائیں استعمال کیں ان دواؤں سے میری طبیعت پہلے سے کچھ سنبھل گئی اور شام سوا کے بجائے اب ساڑھے ۹ بجے پر بخار رہنے لگا۔ ساری گرمی یہی حالت رہی۔ سردیوں کے آتے ہی میری حالت بہتر ہونی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ سردیوں میں مجھے کوئی شکایت باقی نہ رہی۔ نہ بخار رہا۔ نہ کھانسی اور سستی۔

اس کے بعد دو سال تک میری یہ حالت رہی کہ گرمیوں میں سوکھی کھانسی اور بخار رہتا، اور سردیوں میں طبیعت ٹھیک ہو جاتی۔ پھر مجھے سینی ٹوریم میں بھیج دیا گیا۔ وہاں پر بھی وہی علاج اور وہی غذا جو مجھے گھر پر ملتی تھی، ملی۔ البتہ اتنا فرق تھا کہ وہاں سب کام باقاعدگی کے ساتھ ہوتے تھے اور اس کے ساتھ آرام بھی گھر کی نسبت زیادہ ہی ملتا تھا۔ سینی ٹوریم میں میں نے تین گرمیاں گزاریں۔ یہاں مجھے بالکل آرام ہو گیا۔ نہ کھانسی رہی نہ بخار۔ البتہ اتنی شکایت ضرور رہتی کہ گرمیوں میں طبیعت گری گری رہتی اور کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ غرض سارا دن لیٹے لیٹے گزار دیتی۔ اگر اٹھتی تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا اور سر میں چکر آنے لگتے اور بھوک بھی اچھی طرح سے نہیں لگتی۔ میں نے حکیم ڈاکٹروں سے پھر مشورہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اب کوئی بیماری باقی نہیں بس خون کی کمی ہے۔ میں ڈاکٹری علاج سے تو عاجز آگئی ہوں، اب آپ براہ مہربانی رسالے کی آئندہ اشاعت میں میرے لیے علاج تجویز کر دیجیے شاید آپ ہی کے علاج سے میں اچھی ہو جاؤں۔ میرا وزن کم ہے۔ صرف ایک من ہوگا۔

ایک خاتون خریداری نمبر ۱۶۹۰/ن

جواب:۔ آپ کے تمام حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ آپ کو تپ دق کی ابتدا تھی، اور اب بھی اس کے اثرات موجود ہیں۔ اس سے نہ گھبرانا اور پریشان ہونا چاہیے۔ اور نہ غفلت ہی برتنی چاہیے۔ تپ دق ایک قابلِ علاج مرض ہے اور اسی طرح جاتا رہتا ہے جس طرح کوئی دوسرا معمولی مرض۔ بس فرق اتنا ہے کہ یہ ذرا دیر میں آرام ہوتا ہے۔ عام طور پر جو لوگ اس مرض میں ہلاک ہو جاتے ہیں ان میں اکثر و بیشتر وہ مریض ہوتے ہیں جو ناواقفیت کی بنا پر غلطی کھاتے ہیں ہوتا یہ ہے کہ ابتدا میں مرض معمولی سی احتیاطی تدابیر اور غذائی علاج ہی سے قابو میں آجاتا ہے اور مریض قوت حاصل کر کے چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ واقعی طور پر بھی صحت یاب ہو گیا اور اب اسے بے احتیاطی کی زندگی گزارنی چاہیے۔ اب اگر وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جانے کے بعد بھی ضروری آرام سے غفلت نہیں برتتا، اپنے آپ کو تھکاتا نہیں۔ ضروری جسمانی آرام لیتے رہنے کے ساتھ عمدہ قسم کی پرورش کرنے والی غذا کا استعمال بھی کرتا رہتا ہے، تب تو ایک آدھ سال میں وہ کلی طور پر صحت یاب ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ سمجھ کر کہ اب میں چلنے پھرنے لگا ہوں تو ہر جسمانی کام کرنے کے قابل بھی ہوں، نہ وزن اٹھانے سے پرہیز کرتا ہے اور نہ جسم کو آرام دیتا ہے

تو اس صورت میں اس کی مرضی کیفیت جو جسم کی قوتِ مدافعت کی وجہ سے دبی ہوئی تھی، از سرِ نو ابھر آتی ہے اور وہ دوبارہ بچھڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کا سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر جو لوگ اس مرض کی نذر ہو جاتے ہیں وہ تقریباً سو فی صدی یہی غلطی کرتے ہیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ صحت نہ ہو۔

آپ کا کیس نہایت امید افزا ہے۔ میں آپ کے کیس میں کسی خاص دوا کی ضرورت نہیں سمجھتا ہوں۔ یہ بیماری چوں کہ کیلسیم کی کمی کے سبب سے ہوتی ہے، اس لیے آپ اپنی غذا میں کیلسیم کی مقدار بڑھائیے۔ اس کے بعد آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی اور گرمیوں میں بھی طبیعت گری گری رہنے کی شکایت جاتی رہے گی۔ اس کے لیے دودھ، ہمدرد کا مار الحیات، قرص سحر خوب استعمال کیجیے۔ اس کا طریقِ استعمال یہ ہے کہ صبح کے وقت ایک قرص کھا یا اس پر دودھ میں ملا ہوا مار الحیات بقدر ۵ تولے۔ یعنی دو سوا دو اونس پی لیجیے۔ کچھ عرصہ برابر یوں تینوں چیزوں کو استعمال کیجیے۔ انشاءاللہ بہت جلد تمام جسم میں قوت کا احساس ہونے لگے گا۔ کھانسی کی صورت میں صدوری اور سعالین کا استعمال مناسب ہوگا۔ صدوری آپ پھیپھڑوں کی قوت کے لیے بھی پی سکتی ہیں۔

بھوک کے لیے ایسا کیجیے۔ دو روز تک انیما کے ذریعے سوتے وقت اپنی آنتوں کو صاف کر لیجیے۔ اس دوران میں ٹھوس روٹی کے بجائے، سیر سے دو سیر تک خالص دودھ چوبیس گھنٹوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے پی جائیے اس کے بعد رفتہ رفتہ ٹھوس غذا بھی کھانے لگیے۔ سبزیوں کا اُبلا ہوا پانی بھی بہت مفید ہوگا۔ آج کل گرمی میں ترکاری میں گوشت ڈال کر پکائیے۔ روٹی بے چھنے آٹے کی جس میں کچھ زائد بھوسی ملی ہو، کھائیے۔ قبض نہیں رہے گا اور بھوک کھل جائے گی۔ امید ہے ان تدابیر پر عمل کرنے سے آپ کو بہت جلد صحت ہو جائے گی۔

میرا بچہ روغنی ٹکیا کھاتا ہے

سوال: میرے بچے کی عمر ڈیڑھ سال کی ہے ماشاءاللہ اچھا خاصا موٹا تازہ ہے۔ تھوڑا بہت میں اپنا دودھ بھی پلاتی ہوں باقی اس کا من بھاتا کھاجا گیہوں کے آٹے کی روغنی ٹکیہ ہے۔ وہ اسے بڑے مزے لے لے کر کھاتا ہے۔ ابھی تک اس کے دانت اچھی طرح نہیں نکلے ہیں، اس لیے وہ اس بُھربُھری روٹی کو بڑے آرام سے کھا لیتا ہے۔ اس کی صحت میرے نزدیک تو بہت اچھی ہے مگر ابھی کوئی چار روز ہوئے میرے خاوند کے ایک دوست آئے تھے، وہ دہلی کے خاندانی طبیب ہیں انھوں نے دیکھ کر کہا کہ تمھارے بچے کی صحت اچھی نہیں ہے۔ اس کا مٹاپا بیماری کا ہے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ میں اسے روغنی ٹکیا کھلاتی ہوں تو انھوں نے بچے کے تندرست نہ ہونے کا سبب اس کی غذا کو بتایا۔

میرے خاوند تو کہتے ہیں کہ یہ ٹکیا کھلانی چھوڑ دی جائے۔ اور میں کہتی ہوں کہ یہ حکیم صاحب خواہ مخواہ تمھارے دل میں وہم ڈال گئے، ورنہ بچہ ہمارا ہر طرح تندرست ہے۔ آخر ہم سب اسی طرح پلے بڑھے ہیں۔ خود میری والدہ بھی ہمیں بچپن میں یہی روغنی ٹکیا کھلاتی تھیں۔ اب یہ نئی نئی باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ میرے خاوند نے مجھے مشورہ دیا کہ اس معاملہ خاص میں آپ سے رجوع کروں۔ آپ جو فرمائیں گے ہم یکسو ہو کر اس پر عمل کریں گے۔ ہمدرد صحت کی کسی قریبی اشاعت میں مشورہ دیجیے۔ ہمارے گھروں میں تو عام طور پر بچوں کے لیے یہی ناشتہ ہوتا ہے۔ ہم تو خیر گھر کی روغنی ٹکیا دیتے ہیں اور لوگ تو بازار کا حلوا پوری کھلاتے ہیں۔ آپ کا پرچہ بہت عرصے سے نہیں ملا ہے۔ (ثریا جمال دہلوی۔ حال وارد کراچی)

جواب: آپ کے خاوند کے حکیم دوست نے بچے کی غذا کے سلسلے میں جو بھی مشورہ دیا ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔ بچے کو میدے

تو دیکھا نہیں، لیکن جس غذا پر اسے پروان چڑھایا جا رہا ہو، اگر اسے کھا کر وہ موٹا بھی ہوگا تو بلاشبہ اس کا موٹا ہونا بھی صحت کی علامت نہیں سمجھا جائے گا۔ روغنی روٹی میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک روغن اور دوسرے نشاستہ۔ ڈیڑھ دو سال نہیں بلکہ تین چار سال کی عمر کے بچے کے لیے یہ نقصان پہنچانے والی غذا ہے۔ اصل میں اس معاملے میں جو چیز دھوکے میں ڈال دینے والی ہے، وہ بچے کا اسے کھا کر نہ صرف یہ کہ بیمار نہ پڑنا ہے، بلکہ موٹا ہو جاتا ہے۔ یہ دھوکہ عام طور پر ان بچوں کو دیکھ کر ہوتا ہے جن کا نظامِ ہضم بہت اچھا ہوتا ہے اور وہ تقیل غذائی بے عنوانیوں کو برداشت کر سکتے ہیں۔ یہ یاد رکھیے کہ تندرست بچہ بہت موٹا نہیں ہوگا، اس لیے کہ اس کے جسم میں غیر ضروری چربی نہیں ہوگی۔ یہ مٹاپا کیا ہے؟ غیر ضروری چربی کا جسم میں جگہ جگہ جمع ہو جانا ہی تو ہے۔ نشاستہ اور چربی جسم کی ضرورت سے جتنی فاضل بچتی ہے، وہ کہیں نہ کہیں جسم میں جمع ہوتی رہتی ہے اور اعضاء جسمانی اور دوران خون کو سست سے سست تر بناتی رہتی ہے۔ چونکہ بچے کی نشاستائی ضروریات تو بہت ہی کم ہوتی ہیں اس لیے اسے تو بہت ہی کم مقدار میں نشاستے والی چیزیں کھلانی چاہئیں۔

نشاستے کے سلسلے میں اصولی طور پر ایک بات یہ سمجھ لیجیے کہ نظامِ ہضم کو اس پر ڈبل کام کرنا پڑتا ہے۔ پہلے ہضم میں وہ لیسدار مادہ کی شکل میں تبدیل ہوتا ہے جسے انگریزی میں ڈکسٹرین Dextrin کہتے ہیں، اور دوسرے ہضم میں وہ شکر انگوری بن جاتا ہے جسے انگریزی میں گلوکوز (Glucose) کہتے ہیں۔ یہ دونوں ہضم اسی وقت مکمل ہوتے ہیں جب پہلے آپ دانتوں سے غذا کو خوب اچھی طرح چبا کر معدے میں جانے دیں۔ گویا پہلا ہضم منہ ہی میں ہو جاتا ہے اور دوسرا ہضم معدے اور آنتوں میں۔ اگر آپ ڈیڑھ یا دو سال کے بچے کو روغنی ٹکیاں کھلائیں گی تو ظاہر ہے کہ وہ اسے بلا چبائے نگل لیگا اور وہ پہلا ہضم جو منہ میں لعابِ دہن کی بدولت عمل میں آتا معدے اور آنتوں میں جا کر ہوتا ہے۔ ایسے بچے کی اجابت پر آپ نظر کریں گی تو آسانی دیکھ لیں گی کہ اس میں اکثر اوقات غذا غیر منہضم خارج ہوتی ہے۔

آپ کے بچے کا نظامِ ہضم بفضلہ اچھا ہے، خدا کا شکر کیجیے اور اس پر اس چھوٹی عمر میں اتنا بار نہ ڈالیے جتنا اس وقت آپ ڈال رہی ہیں۔ میں آپ کو گھی کی ٹکیا کا نعم البدل بتاتا ہوں وہ آپ بچے کو کھلائیے، کچھ دن تو وہ ٹکیا کے لیے ضد کرے گا، لیکن ایک ہفتے کے اندر اندر میری تجویز کردہ غذا کو ٹکیا سے کہیں زیادہ پسند کرنے لگے گا۔ یہ غذا ہر اعتبار سے اس کے لیے مناسب ہوگی جسم میں نشاستہ کی ضرورت کو بھی پورا کریگی اور جسم کی پرورش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے نظامِ ہضم کو بھی صحیح حالت میں رکھے گی۔ سب سے بڑی خصوصیت اس غذا میں یہ ہے کہ اس کے کھانے سے نظامِ ہضم کو دوہرا کام نہیں کرنا پڑتا، اجزائے نشاستہ شکر انگوری کی حالت میں جسم میں جاتے ہیں اور بہت جلد جسم کے کام آجاتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کے لیے یہ غذا روٹی اور اسی قبیل کی نشاستہ دار چیزوں کا صحیح صحیح نعم البدل ہے۔

آپ اپنے بچے کو انگور، سیب، سنترہ، کشمش، منقیٰ، میٹھا آلوچہ، کیلا، انجیر اور کھجور کھلائیے، ان کے استعمال سے اس کے ہضم پر کم سے کم بار پڑے گا اور جسمانی ضرورتیں ساری کی ساری پوری ہو جائیں گی۔ یہ پھل حسبِ موسم کھلائیے اس کے ساتھ جب تک وہ آپ کا دودھ پیتا ہے اپنا بھی پلائیے اور خالص اچھا گائے کا دودھ بھی دیجیے۔ ٹکیہ کی عادت یوں چھڑائیے کہ رات کو جب وہ سو جائے اس کے سرہانے ایک عمدہ سیب یا ایک میٹھا سنترہ رکھ دیجیے۔ وہ صبح اٹھے گا تو کھانے کی چیز کو دیکھ کر بڑا خوش ہوگا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بعد اسے کھجور، کشمش، منقیٰ وغیرہ کھلا دیجیے۔ دو چار روز تو وہ ٹکیہ کو یاد کرے گا، اس کے بعد ان قدرتی غذاؤں کا ذائقہ ٹکیہ کے ذائقہ پر غالب آجائے گا۔

ضمیمہ ہمدرد صحت۔ کراچی جون سنہ ۱۹۴۸ء

ڈاکٹر استراخوناف

اور

دوسرے افسانے

از ڈاکٹر سعید احمد بریلوی

"ڈاکٹر استراخوناف" اپنی نوعیت کا واحد افسانہ ہے جو اُردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ حیرت انگیز، دل چسپ، رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات سے پُر۔ کیونکر "تاج محل" جہاز طوفانی موجوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوا، کس طرح زُبیری اور مس فیروزہ خشکی پر پہنچے اور انھوں نے کس طرح بَن مانسوں سے جان بچائی اور اس کے بعد ایک دیو پیکر انسان، استراخوناف کے دام میں پھنسے۔ ایک ایسی دل چسپ داستان ہے کہ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے لکھے ہوئے اصلاحی افسانے جو ادبِ اُردو کی جان ہیں۔ ادارہ ہمدرد نے اس کی طباعت کا انتظام کیا ہے۔ آپ کی لائبریری میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ آج ہی اپنا آرڈر بک کرا دیجیے، تاکہ جب کتاب چھپ کر تیار ہو جائے تو آپ کی خدمت میں پیش کی جا سکے۔

قیمت فی جلد دو رُپے آٹھ آنے

محصول نو آنے

نوٹ:۔ وی۔ پی کرنے کی صورت میں سوا تین آنے زیادہ خرچ ہوں گے

آج ہی آرڈر بک کرائیے

ادارۂ مطبوعات ہمدرد۔ ہمدرد روڈ (رام باغ روڈ) کراچی


ہمدرد
ایک لفظ
طبِ یونانی کی
تاریخ میں جسے
فراموش
نہیں کیا جاسکتا

ہمدرد صحت

نگران :- حکیم حاجی عبدالحمید دہلوی + ایڈیٹر :- حکیم حافظ محمد سعید دہلوی

صدر دفتر انتظام : ہمدرد روڈ کراچی

دفتر ادارہ : ۱/۵۴ اے سندھ کولونی ، بندر روڈ ایکس ٹینشن ، کراچی

صدر دفتر ہند : ہمدرد منزل ، لال کنواں ، دہلی

دفتر بمبئی : ۱۹ دلال اسٹریٹ ، فورٹ ، بمبئی

دفتر ایڈورٹائزنگ ۱۷ دلال اسٹریٹ ، فورٹ بمبئی

دفتر سعودی عرب : ثولیقہ بازار ، مکۃ المکرمہ

ہمدرد صحت ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ "ہمدرد دواخانہ، دہلی"

اس کے شائع کرنے والے ہیں

قیمت سالانہ (ہندوستان و پاکستان میں) پانچ روپے

قیمت فی پرچہ، آٹھ آنے (محصول دو پیسے)

طلبا اور لائبریریوں سے چار روپے سالانہ

طابع و ناشر : حکیم محمد سعید دہلوی

مطبع : مشہور آفسٹ لیتھو پریس - میکلوڈ روڈ - کراچی ملک (پاکستان)

جلد: ۱۷
رسالہ ہمدرد صحت کراچی
نمبر: [illegible]

فہرست مضامین

جولائی سنہ ۱۹۴۸ء

ہمدردِ صحت

وی پی

جون سنہ ۱۹۴۸ء کے ہمدرد صحت میں اعلان کیا گیا تھا کہ "ہمدرد صحت بذریعہ وی پی کسی کو نہیں بھیجا جائیگا۔ اس سلسلے میں مزید اعلان کیا جاتا ہے کہ وی پی بھیجنے میں ادارہ کو اب بھی تامل ہے اس کی وجہ اخراجات کی زیادتی بھی ہے جو خریداروں پر پڑتا ہے اور ادارہ کو وی پی کی واپسی سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ ناقابلِ برداشت ہے۔

ڈاکٹر استراخوناف

اس عنوان سے ڈاکٹر سید احمد صاحب سعید بریلوی کی جس کتاب کا اعلان گزشتہ مہینے کیا گیا تھا اس کے جواب میں ہم نے آرڈر بک کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ کتاب زیر تیاری ہے اس سلسلے میں مزید یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کتب فروش حضرات بھی اپنے آرڈر جلد از جلد بک کرانا شروع کر دیں۔ ان کو جس قدر نسخوں کی ضرورت ہے ادارہ کو مطلع فرمائیں اور کمیشن کا معاملہ طے فرمائیں۔

خریداری نمبر

وہ حضرات جو خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر تحریر نہیں فرماتے انکی خدمت میں التماس ہے کہ وہ توجہ فرمائیں انکی ذرا سی فروگزاشت سے نہ صرف ان کو زحمت انتظار گوارا کرنی پڑتی ہے بلکہ ادارہ کو تکلیف ہوتی ہے۔

ہمدرد صحت کا سائز

"ہمدرد صحت" کا موجودہ سائز اپنی جگہ اچھا تھا، لیکن بعض وجوہ کی بناء پر اور ہمدرد صحت کو اور زیادہ مفید بنانے کے خیال سے موجودہ سائز کا دوگنا سائز کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ اگست سنہ ۱۹۴۸ء کا رسالہ بڑے سائز پر شائع ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ جدید سائز بہت پسند کیا جائے گا۔

ہمدرد دواخانہ

کراچی میں رام باغ کے بالمقابل ہمدرد دواخانہ کی شاخ نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ اس میں نسخہ بندی کا انتظام بھی جلد کیا جانے والا ہے۔ فی الحال صرف مخصوص ادویہ جن کے اشتہارات اس رسالہ میں ہیں، دواخانہ سے مل سکتی ہیں۔

ناظم ہمدرد صحت (دفتر انتظام) ہمدرد روڈ (رام باغ روڈ) کراچی

اِشارات

لمفاوی نظام اور قیامِ صحت میں اس کا دخل

اس تین چار ماہ کے عرصے میں ہمدرد صحت سے دل چسپی رکھنے والے حضرات نے ہم سے لمفاوی نظام (Lymphatic System) کے متعلق کچھ اس قسم کے سوالات کیے ہیں جنھیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کے بہت سے طبیب اور غیر طبیب حضرات اِس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ طب قدیم لمفاوی نظام سے قطعی نابلد ہے اور یہ کہ اسے ابھی حال ہی میں مغربی طب نے دریافت کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امریکی اور یورپین طبی رسائل نے ابھی کچھ عرصے سے لمف اور لمفاوی نظام پر بڑے زور و شور سے لکھنا شروع کیا ہے، مگر ان کے تحقیقاتی مضامین کی حقیقت بالکل اسی نوعیت کی ہے جیسے دوران خون کی دریافت کو ہاروے سے منسوب کرنا، حالاں کہ آج یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ہاروے سے بہت پہلے قدیم طبی کتب میں دوران خون کا باقاعدہ تذکرہ ملتا ہے۔ بہر حال آج کی صحبت میں ہم چاہتے ہیں کہ لمفاوی نظام کے متعلق جو کچھ بھی ہماری معلومات ہیں انھیں اختصار کے ساتھ پیش کریں اور یہ بھی بتائیں کہ انسانی مشینری میں عروق جاذبہ کا یہی وہ نظام ہے جو انسان کو نہ صرف بیماریوں کی چھوت سے بچاتا ہے بلکہ اس کی جسمانی پرورش اور استحالۂ غذا کی تکمیل بھی کرتا ہے۔

لمف اور لمفاوی نظام:- ہمارے جسم میں جلد اور نسیجوں کے نیچے، چھوٹی چھوٹی شفاف رگوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔ ان باریک باریک رگوں میں نامعلوم طریق پر جو سیال بہتا ہے اور جس کا رنگ بھوسے کے رنگ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہوتا ہے، اسی کو انگریزی میں لمف (Lymph) اور طب یونانی میں رطوبت طلیہ کہتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک نے ہی اس لمف کو دیکھا ہوگا مثلاً کٹی ہوئی انگلی کو اگر ایک دن یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو دوسرے روز اس میں سے ایک قسم کے زرد پانی کا قطرہ سا نکلتا ہے۔ اس رطوبت میں ہزارہا خاص قسم کے خلیات ہوتے ہیں جو خون کے سفید جسیموں (White Corpuscles) کو بیماری کے جراثیم سے لڑنے اور ان کے ہلاک کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اور اگر جراثیمی تعدیہ معمولی کاٹ اور خراش سے ذرا زیادہ گہرا پہنچ گیا ہے تو حملہ آور جراثیم لمفاوی رگوں یعنی عروق جاذبہ کے جال میں جکڑ لیے جاتے ہیں اور قریب کے کسی لمفاوی غدد (Lymphatic Gland) میں ترکز کر دیے جاتے ہیں تاکہ جسمانی پرورش کرنے والا یہ لمف یا رطوبت طلیہ ہر قسم کی سمیت سے پاک رہے۔ یہ لمفاوی غدودائی کے بیج سے لے کر سیم کے بیج کے برابر ہوتے ہیں اور اندرونی و بیرونی تعدیہ سے لڑنے کے لیے ایک خاص قسم کے سفید جسموں کا ایک نہایت مضبوط جنگی دستہ تیار رکھتے ہیں۔ ان غدد کا جال بھی سارے نظام جسمانی پر پھیلا ہوا ہے اور اس کے بڑے بڑے گچھے گردن، چڈھے، بغل و آنتوں میں ہوتے ہیں۔ یہ قدرتی

جاذبہ بھی اس طریق پر بنے ہوئے ہیں کہ یہ نہ صرف نقصان رساں جراثیم کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں بلکہ نظام جسمانی میں خلیات و انسجہ کی ٹوٹ پھوٹ سے جو کوڑا کرکٹ ہوتا ہے اسے بھی، اور باہر سے جو میل کچیل اور کوڑا کرکٹ جسم میں داخل ہوتا ہے اسے بھی اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ اس مناسبت سے ماہرین علم افعال الاعضاء (Physiologists) اسے بجا طور پر 'جسم کا کوڑا دان' کہتے ہیں۔

اگرچہ یہ حفاظتی اور بچاؤ کا کام جو لمف اور عروق جاذبہ (Lymphatics) انجام دیتی ہیں کسی طرح کم اہم نہیں ہے، لیکن یہ لمفادی نظام جو اور دوسرے مفید ترین کام انسانی جسم کے لیے انجام دیتا ہے وہ تو اس قدر زیادہ اہم ہیں کہ زندگی کا دار و مدار ہی ان کاموں کے پوری طرح انجام دئے جانے پر ہے۔ لمف یا رطوبت طلیہ۔ جیسا اپنی کیمیائی ساخت کے اعتبار سے خون سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے، مگر خون نہیں ہوتی لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ رطوبت خون ہی سے نکلتی ہے اور پھر خون ہی میں جاملتی ہے۔ اس درمیانی وقفے میں یہ رطوبت عروق جاذبہ جس کا اپنا ایک علیحدہ مستقل نظام ہے، میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس وقت قدرت کی طرف سے تفویض کردہ جو کام یہ لمف انجام دیتا ہے اسے دیکھیں اور سمجھیں تو آپ حیرت میں رہ جائیں کہ انسانی جسم کی مشینری بھی کس قدر مفصل و مکمل ہے۔

قلب اور دورانِ خون

آئیے اب ہم تھوڑی سی تشریح اس کام کی بھی کر دیں جو قدرت اس رطوبت سے استحالۂ غذا میں لیتی ہے۔ مگر اسے کما حقہٗ سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ پہلے تھوڑی سی تشریح دورانِ خون کی بھی کر دی جائے تاکہ رطوبت طلیہ کی افادیت اور استحالۂ غذا میں اس کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ ہو جائے۔

ہمارے نظام جسمانی میں خون کی گردش حرکتِ قلب کی مدد سے عمل میں آتی ہے۔ قلب کے علیحدہ علیحدہ دو خانے ہوتے ہیں ایک دایاں اور ایک بایاں۔ پھر یہ دونوں خانے بھی اپنی جگہ دو دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں چنانچہ قلب کے بالائی حصے کو بایاں اُذن (Left Auricle) کہتے ہیں اور نچلے حصے کو بایاں بطن (Left Ventricle) کہتے ہیں۔ ان دونوں حصوں کے درمیان ایک راستہ بھی ہوتا ہے جس میں ایک صمام (کواڑی) (Valve) ہونے کی وجہ سے خون اس کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں آتو سکتا ہے، مگر واپس نہیں لوٹ سکتا۔ اسی طرح قلب کے دائیں خانے کے بالائی حصے کو دایاں اُذن (Right Auricle) کہتے ہیں اور نچلے حصے کو دایاں بطن (Right Ventricle) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان دونوں حصوں کے درمیان بھی ایک راستہ ہوتا ہے اور اس میں بھی صمام (کواڑی) (Valve) ہونے کی وجہ سے خون بس ایک طرف سے گزر سکتا ہے واپس نہیں لوٹ سکتا۔ قلب کی ساخت کو سمجھ لینے کے بعد یہ دیکھیے کہ ہمارے جسم میں دورانِ خون کس طرح عمل میں آتا ہے۔ سب سے پہلے ہم قلب کے بائیں حصے سے شروع کرتے ہیں۔ تازہ و مصفیٰ سرخ خون آکسیجن لیے ہوئے پھیپھڑوں سے بائیں اُذن میں آتا ہے۔ بائیں اُذن کے عضلات اسی وقت سکڑتے ہیں اور قوت کے ساتھ اس خون کو صمام کے ذریعے بائیں بطن میں بھیج دیتے ہیں۔ پھر بائیں بطن کے عضلات نہایت زور کے ساتھ سکڑتے ہیں اور نہایت قوت کے ساتھ سرخ خون کو بڑی شریان میں دھکیل دیتے ہیں جہاں سے پھر وہ سارے جسم کی شریانوں میں پھیل جاتا ہے، یہاں تک کہ جب یہ خون نسیجوں (Tissues) میں پہنچتا ہے تو بڑی شریانیں پھر ہزارہا چھوٹی شریانوں

میں تقسیم ہو جاتی ہیں اور آخر میں جب وہ بال کے برابر باریک ہو جاتی ہیں تو عروق شعریہ کہلاتی ہیں۔

خون جب ان باریک رگوں میں پہنچتا ہے تو اس میں آکسیجن کی مقدار خاصی کم ہو چکی ہوتی ہے اور کاربن کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ آگے چل کر عروق شعریہ جب چھوٹی چھوٹی وریدوں سے مل جاتی ہیں تو خون میں کاربن کی مقدار اور بڑھ جاتی ہے۔ پھر خون چھوٹی سے بڑی وریدوں میں آتا ہے اور آخر میں سب سے بڑی ورید میں پہنچ کر پہلے قلب کے دائیں اذن میں آتا ہے، جہاں سے اس کے عضلات سکڑ کر اسے دائیں بطن میں پھینک دیتے ہیں، پھر دایاں بطن نہایت قوت سے اس ناصاف خون کو پھیپھڑوں کی طرف پھینک دیتا ہے تاکہ وہاں پہنچ کر تنفس کے ذریعے وہ کاربن باہر خارج کر دے اور آکسیجن لے لے۔ اور جب صاف ہو جائے تو پھر حسب معمول قلب کے بائیں اذن میں واپس آکر سارے جسم میں پھیل جائے۔

دورانِ لمف کی مزید تشریح

دورانِ خون کے نظام کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب ہم پھر رطوبت طلیہ یعنی لمف کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ دورانِ خون کی تشریح

یہ بات تو آپ نے سمجھ ہی لی تھی کہ خون میں آکسیجن کی مقدار عروق شعریہ تک پہنچ کر کم ہو جاتی ہے اور کا[ربن کی] مقدار بڑھ جاتی ہے۔ اب ذرا اتنا اور سمجھ لیجیے کہ عروق شعریہ مسام دار ہوتی ہیں چنانچہ ان کے خون کے پروٹینی ذرات تو قطرہ قطرہ کرکے ٹپک جاتے ہیں اس لیے کہ وہ چھوٹی چھوٹی وریدوں راست عروق شعریہ سے منتقل نہیں ہو سکتے اور نمکیات اور پانی باریک باریک وریدوں سے راست منتقل ہو جاتے ہیں۔ اب یہاں یہ دقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر یہ پروٹینی اجزا ٹپک کر جسم میں ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں اور دوسرے مقامات تک یہ حصہ رسد نہ تقسیم کیے جا سکیں تو اس بات کا سخت خطرہ ہے کہ انسجہ اور بافتوں کو اس کے مرتکز ہونے سے نقصان پہنچ جائے۔ لہٰذا اس صورتِ حال کا قدرت یہ بندوبست کرتی ہے کہ عروق جاذبہ جو ہمارے جسم میں جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں وہ اس پروٹینی سیال کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں اور اپنے علیحدہ گردشی نظام کے تحت جو شریانی و وریدی نظام سے بالکل جداگانہ ہے، اس لمف کو لے کر قلب کی جانب دھکیلتی ہیں اور اس دوران میں آنتوں سے اس روغنی شیرہ (Emulsion of Fats) کو بھی لے لیتی ہیں جسے آنتوں کی رطوبتِ ہاضمہ (Digestive Juice) روغنی اجزاء غذا کو تحلیل کرکے بناتی ہے۔ یہاں سے لمف روغنی شیرہ اور پروٹینی اجزاء غذا کو لے کر واپس خون کے دھارے میں جا کر ملنا چاہتا ہے۔ عروق جاذبہ کی ساخت بھی قدرت نے کچھ ایسی بنائی ہے کہ اس میں چھوٹے چھوٹے بے شمار صمام (Valves) ہیں جن کی وجہ سے جو رطوبت آگے بڑھ جاتی ہیں وہ واپس نہیں لوٹ سکتیں یعنی یہ کہ لمف بس ایک ہی سمت قلب کی جانب بڑھتا ہے۔

نظامِ جسمانی میں خون کی گردش تو قلب کی بدولت عمل میں آتی ہے۔ مگر لمف کو عروق جاذبہ میں گردش دینے کے لیے قلب جیسی کوئی محرک قوت موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس کی کامیاب گردش کا دارومدار بڑی حد تک جسمانی ورزش، جسمانی مالش اور گہرے گہرے سانس لینے پر ہے۔ مگر پھر بھی قدرت نے لمف کی گردش کے معاملے کو بالکلیہ انسان کی اپنی اختیاری کوشش پر نہیں چھوڑا ہے کہ وہ ورزش کرے گا تو یہ بھی گردش کرے گا اس لیے کہ اس صورت میں جو کاہل الوجود ہیں یا کسی طرح ورزش کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ

نہیں پاتے ان کی عروق جاذبہ میں تو لمف کی گردش ہی عمل میں نہ آتی اور اس سے نہ صرف ان کا نشو و نما رُک جاتا، بلکہ بیماریاں قبول کرنے کی استعداد بھی ان میں بڑھ جاتی۔ پھر ہاتھ پیروں وغیرہ کی ورزش تو خیر ایک حد تک چلنے پھرنے اور کام کاج کرنے سے ہو ہی جاتی ہے، مگر آنتوں کی ورزش تو بغیر کیے کسی طرح ہوتی ہی نہیں۔ اس لیے قدرت نے یہاں دوسرا ہی انتظام کیا ہے، وہ یہ ہے کہ آنتوں میں عروق جاذبہ بڑی بڑی شریانوں کے چاروں طرف لپٹ جاتی ہیں اور خون کی گردش کی وجہ سے جو ان میں تحریک ہوتی ہے تو اس سے عروق جاذبہ بھی متحرک ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح خون کے ساتھ ساتھ لمف بھی حرکت میں آجاتا ہے، مگر بغیر کسی خارجی تحریک مثلاً جسمانی ورزش یا مالش وغیرہ کے لمف کی رفتار بہت ہلکی رہتی ہے جس سے استحالۂ غذا مکمل طور پر جیسا کہ ہونا چاہیے، عمل میں نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کے لیے جسمانی ورزش نہایت ضروری ہے کہ بغیر اس کے ہمارا جسم پوری طرح غذا سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

قلب کے قریب اپنے نقطہ پر پہنچ کر جسے قلب کا دوران سمجھنا چاہیے، لمف کا دھارا بڑی وریدوں میں جا گرتا ہے، گویا اس طرح تغذیہ جسم کا بہترین مواد اپنے ساتھ لے کر لمف پھر دوبارہ خون میں جا شامل ہوتا ہے۔

ذرا غور فرمائیے کہ اگر لمف جیسی اہم رطوبت جسے آبِ حیات کہنا کسی طرح بھی غیر موزوں نہ ہوگا ہمارے خون میں کسی سبب سے شامل نہ ہو تو کیا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جب اجزاء لحمیہ (Proteins) اور اجزاء شحمیہ (Fats) وغیرہ جیسے اہم اجزاءِ غذا ہی خون میں شامل ہو کر ہمارے جسم کی ضرورتوں کو پورا نہ کریں گے تو جسم کیسے ترقی کرے گا۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک عورت جس کی گردن پر کسی نے خنجر سے حملہ کیا تھا، ہسپتال میں علاج کے لیے آئی۔ خنجر کے زخم نے جہاں گوشت کاٹا تھا، وہاں لمف کے دھارے کے اس راستے کو بھی کاٹ دیا تھا جو قلب کی جانب جاتا تھا۔ مگر اندر کا حال کسی کو نہ معلوم ہوا۔ زخم تو بھر گیا، مگر وہ عورت تن درست ہونے میں نہ آئی۔ اس کا وزن روز بروز اتنی تیزی سے کم ہوتا گیا کہ موت سامنے نظر آنے لگی۔ بہت غور و فکر اور تحقیق کے بعد کہیں جا کر اس گراوٹ کی وجہ سمجھ میں آئی۔ چناں چہ آپریشن کیا گیا اور لمف کی اس لائن کو جو منقطع ہو گئی تھی، درست کر کے لمف کے بہاؤ کو قائم کیا گیا تاکہ عروق جاذبہ میں سے گزر کر لمف پھر دوبارہ خون میں شامل ہو سکے۔ عروق جاذبہ کے منقطع سلسلے کا درست ہونا تھا کہ دوسرے ہی ہفتہ سے وہ عورت تندرست ہونا شروع ہو گئی۔ اس کا وزن بھی پورا ہو گیا اور جب ہسپتال سے گئی تو بالکل تن درست تھی۔

دیکھا آپ نے! ہماری زندگی کے لیے کس قدر اہم ہے یہ رطوبت، گویا لمف کے بغیر خون بھی بیکار ہو جاتا ہے، مگر کتنے لوگ ہیں جو اس سے واقف ہوں گے۔ حالاں کہ یہی وہ رطوبت ہے جس کی بدولت ہمارے نظامِ جسمانی کا پورا کیمیائی توازن قائم ہوتا ہے، استحالۂ غذا عمل میں آتا ہے، اور ان سب پر مستزاد یہ کہ ہماری جسمانی مشینری میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی پوری پوری صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر استراخوناف
اور
دوسرے افسانے

از ڈاکٹر سعید احمد بریلوی

"ڈاکٹر استراخوناف" اپنی نوعیت کا واحد افسانہ ہے جو اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ حیرت انگیز، دل چسپ، رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات سے پُر کیونکر "تاج محل" جہاز طوفانی موجوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوا، کس طرح زُبیری اور مس فیروزہ خشکی پر پہنچے اور انھوں نے کس طرح بن مانسوں سے جان بچائی اور اس کے بعد ایک دیو پیکر انسان استراخوناف کے دام میں پھنسے۔ ایک ایسی دل چسپ داستان ہے کہ بار بار پڑھنے کو دل چاہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے لکھے ہوئے اصلاحی افسانے جو ادبِ اُردو کی جان ہیں۔ ادارہ ہمدرد نے اس کی طباعت کا انتظام کیا ہے۔ آپ کی لائبریری میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے آج ہی اپنا آرڈر بک کرا دیجیے، تاکہ جب کتاب چھپ کر تیار ہو جائے تو آپ کی خدمت میں پیش کی جا سکے۔

قیمت فی جلد دو روپے آٹھ آنے

محصول نو آنے

نوٹ:۔ وی، پی کرنے کی صورت سوا تین آنے زیادہ خرچ ہوں گے۔

آج ہی آرڈر بک کرائیے

ادارۂ مطبوعاتِ ہمدرد۔ ہمدرد روڈ (رام باغ روڈ) کراچی

بیرونی اشتہارات

اب ہمدرد صحت میں شائع کرائے جاسکتے ہیں

"بیرونی اشتہارات" سے مراد وہ اشتہارات ہیں جو ہمدرد دواخانہ اور اس کے مختلف اداروں سے علاوہ ہوں۔ چونکہ ہمدرد صحت کے صفحات بڑھا دیے گئے ہیں اور مزید بڑھائے جاسکتے ہیں۔ اس لیے ہمدرد دواخانہ کے علاوہ "بیرونی اشتہارات" کے لیے ہمدرد صحت میں گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ لیکن ہمدرد صحت میں وہی اشتہارات جگہ پاسکیں گے جنکے متعلق ادارے کو ان کی صحت کا اطمینان ہو جائے گا۔ سینما کے اشتہارات ہمدرد صحت میں نہیں لیے جائیں گے لیکن تعلیمی اور علمی فلموں کے اشتہارات لیے جاسکیں گے۔ اُجرت بہرحال پیشگی لی جائے گی۔ اور نصف صفحے سے کم اشتہار نہیں لیا جائے گا۔

اُجرت اشتہار

اُجرت فی صفحہ فی بار ــــــــــ ایک سو روپے

اُجرت ½ صفحہ فی بار ــــــــــ پچاس روپے

ایک سال (بارہ صفحات) کا کنٹریکٹ کرنے کی صورت میں پانچ فیصد کمیشن وضع کیا جاسکے گا

نوٹ:۔ ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی معرفت بھی اشتہار لیے جاسکیں گے۔

ازراہ کرم اس پتے پر خط و کتابت کیجیے۔

بزنس منیجر ہمدرد صحت ہمدرد روڈ (رام باغ روڈ) کراچی ۱

طاعون کی روک تھام میں عوام کی ذمّے داری

از ڈاکٹر حسن عزیز جاوید

جب طاعون شروع ہوجاتا ہے، محکمۂ صحت عامہ انسدادی تدابیر شروع کردیتا ہے۔ لیکن عوام اپنے جوابی تعاون اور اپنی ذمّے داریوں کو فراموش کرکے صرف اس کے متمنی رہتے ہیں کہ جو کچھ کرے وہ محکمۂ صحت ہی کرے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شہری انفرادی طور پر اس روک تھام میں ہاتھ بٹائے، اور اس طرح محکمۂ صحت اور عوام مل کر اس لعنت کو دُور کریں۔

یہ متعدی مرض ہے۔ چوہے، گھونس، گلہری اور بندر ان پسوؤں کے پھیلانے کا باعث ہوتے ہیں جو اپنے ہمراہ پلیگ کے جراثیم لیے پھرتے ہیں۔ جب یہ پسو کاٹتے ہیں، جراثیم خون میں شامل ہوجاتے ہیں، بڑی سرعت رفتار سے ان کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔ ان کی نوآبادیاں جسم کے خاص خاص غدود میں مجتمع ہوکر انھیں بڑا بنا دیتی ہیں، اور یہی گلٹی کا طاعون ہے۔ اگر پسو کے کاٹنے کے بعد جسم اور جلد پر خراش نہ پیدا ہو، اور اس ذریعے سے جراثیم خون میں شامل نہ ہوں تو غدودی طاعون نہیں ہوسکتا۔ منھ کے ذریعہ ان جراثیم کا اندر داخل ہونا اور طاعون پیدا کرنا مشاہدے میں نہیں آتا۔ البتہ منھ اور ناک سے ایک دوسرے قسم کی طاعون کے جراثیم اندر داخل ہوکر مرض پیدا کرتے ہیں جسے نمونیائی طاعون کہتے ہیں، مگر اس قسم کا طاعون ہندستان میں نہیں پایا جاتا۔ یہ منچوریہ میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔

ہر قسم کے چوہے طاعون سے متاثر نہیں ہوتے۔ ہمارا سب سے بڑا دشمن وہ گھریلو چوہا ہے جو موٹا تازہ اور لمبی دُم والا ہوتا ہے۔ متاثرہ چوہے پر جو پسو ہوتے ہیں وہ کم سے کم پانچ روز اور زیادہ سے زیادہ بیس روز کے دوران میں اپنے زہریلے جراثیم انسانی خون میں منتقل کردیتے ہیں، لیکن بھوکے پسو اور زیادہ میعاد تک اپنی تباہ کاریاں جاری رکھ سکتے ہیں۔ مطالعہ اور مشاہدہ ثابت کرچکا ہے کہ طاعون پھیلانے والا پسو عمودی اور مستقیم طور پر تین انچ کی اڑان بھر سکتا ہے۔ چنانچہ من جملہ دیگر تدابیر حفظ ماتقدم کے اس پر بھی عمل درآمد کیا جاتا رہا ہے کہ تین انچ سے زیادہ اونچے مقام پر رات بسر کی جائے اور اپنے پلنگ کے اطراف میں مکھی مار کاغذ پھیلائے جائیں۔ مگر یہ طول عمل رہا ہے۔ اس پسو کی خصوصیت ہے کہ یہ ہوا اور روشنی سے بہت نفرت کرتا ہے اور اسے تاریکی بے حد مرغوب ہے، اس لیے مجرّبین رات کو طاعون کے مریض کی عیادت سے منع کرتے ہیں

یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ اگر طاعون کے متاثر چوہے ہلاک کردیئے جائیں تو ان کے طفیلی پسو آزادانہ اُڑتے ہیں اور زیادہ تباہی پھیلاتے ہیں۔ لہٰذا چوہوں کے ساتھ ہی ساتھ پسوؤں کی ہلاکت کا خاص انتظام ضروری ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ عوام کو روشناس کرائیں کہ ہر فرد چوہے اور ان کے پسوؤں کو غارت کرنے کی سعی کرے۔ چوہوں کی ہلاکت زہر ملی ہوئی غذائیں رکھ دینے سے کی جاتی ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر خاندان کے افراد اپنے کھانے پینے کی اشیا کا استعمال اور حفاظت اس طریق پر کریں کہ چوہے یا تو بھوکوں مرجائیں یا بھاگ جائیں۔ ہماری ذرا سی بے احتیاطی سے یہ موذی چوہے من حیث المجموع وہ لاکھوں ٹن غلّہ ہضم کرجاتے ہیں جو قومی ضروریات کے لیے

مختفی ہو سکتا ہے اور جس سے ہم محروم رہ جاتے ہیں، اور پھر ہم ہی ان کی پرورش و پرداخت کا باعث بن کر طاعون کے نشوونما کا موجب ہو جاتے ہیں! لہٰذا عوام کو سب سے ضروری تربیت دی جائے کہ اجناس خوراک اور اغذیہ کی کافی حفاظت کریں اور پس خوردہ کو قطعی چوہوں کے ہاتھ نہ لگنے دیں۔

آج کل جب کہ راتب بندی کا عمل ہے اور فراہمی رسد کا بار حکومت کے سر ہے، غلے کے گوداموں پر کڑی نگرانی رہنی چاہیے۔ محکمہ صحت عامہ کا اشتراک عمل محکمہ راتب بندی اور محکمہ زراعت سے لازمی ہے۔ اور اس طریق کار پر عامل ہونے کے بعد غلہ اور دیگر اجناس خوراک کا اتلاف اور طاعون کا استیصال قطعی ممکن ہوگا۔

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ چوہے اگر ہلاک کر دیے جائیں اور پسوؤں کو آزادیٔ عمل کے لیے چھوڑ دیا جائے تو تدارک نہیں ہوتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ چوہے اور پسو دونوں کی ہلاکت کا انتظام کیا جائے، نہ محض یہ بلکہ پسوؤں کے جراثیم بھی ہلاک ہو جائیں۔ قدرت نے چوہے میں ایک خاص ذہانت ودیعت کی ہے۔ آپ چند روز تک اسے زہر کی گولی کھلا سکتے ہیں اس کے بعد وہ اسے چھونا بھی گوارا نہیں کرتا خواہ آپ اس کے لیے کتنا ہی پُر فریب طعمہ پیش کریں! اسی طرح پنجرے میں چند بار پھنسنے کے بعد وہ ادھر کا رخ نہیں کرتا! پسوؤں کو صابون اور مٹی کے تیل کے مرکبات سے قطعی طور پر ہلاک کرنے میں ناکامی ہوئی ہے۔ جراثیم بھی چوہوں اور سوراخوں میں رہتے ہیں بخوبی اس سے متاثر نہیں ہوتے ہیں۔ نیز وہ مخصوص مرکبات جن کے لیے دعویٰ کیا گیا تھا کہ اجناس خوردنی پر چھڑکنے سے طاعون کے جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں، ناقص یا بے اثر ثابت ہوئے ہیں۔ آفتابی تمازت کے ذریعے غلے میں چھپے ہوئے طاعون کے جراثیم کی تدبیر ہلاکت اور حرارت بخش ماہی تابوں میں غلے کا ذخیرہ رکھ کر جراثیم کی ہلاکت کا عمل بھی بے اثر پایا گیا ہے۔

البتہ ہائیڈروسائنک ایسڈ کی گیس چوہے کے بلوں میں پہنچانا سب سے مجرب، مفید اور زود اثر تسلیم کیا گیا ہے، اور اگر حزم و احتیاط سے کام میں لایا جائے تو بدون انسانی طبیعت کو خطرہ پہنچائے، چوہے، پسو اور جراثیم تینوں کو کامیابی سے ہلاک کر دیتی ہے۔ ہائیڈروسائنک ایسڈ کے علاوہ امریکا میں کلورو پکرم اور سوڈیم فلورائڈ سے بھی یہی کام لیا جاتا ہے۔ یہ اجزا بشکل سفوف دست یاب ہوتے ہیں جسے خاص پمپ کے ذریعے چوہے کے بل میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

حیدر آباد بہ مقابلہ دیگر مملکتوں کے ہر سال طاعون سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اور حالاں کہ خدا کے فضل و کرم سے ہماری توانائیاں بہ مقابلہ معاصر ممالک زیادہ برتر ہیں، اور ہم طاعون کے استیصال و دفاع کی قدرت رکھتے ہیں۔ صرف ذرا سی توجہ درکار ہے۔

اس دوسری جنگ عظیم نے جہاں طب اور جراحت کے باب میں ہمیں بعض نادر عجائب عطا کیے ہیں وہاں ایک خاص آمیزہ ——— ڈی۔ ڈی۔ ٹی ——— عطا کر کے جراثیمیات اور کیمیائیات پر احسان عظیم کیا ہے۔ کیمیائی اصطلاح اور ترکیبی اعتبار سے اسے پارا۔ ڈائی کلور۔ ڈائی فنائل۔ ٹرائی کلورایتھان کہتے ہیں۔ یہ کلورو بنزین کو کلورل کے ہمراہ سلفیورک ایسڈ مونو ہائیڈریٹ کی موجودگی میں مجتمع و منجمد کر کے بنایا جاتا ہے۔ تو اکہائی خوشبو کا سفوف ہوتا ہے۔ مختلف اور ہمہ اقسام کے باغاتی، خانگی، اور زرعی،

کیڑوں اور جراثیم کا مہلک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کو آدھا صرف ڈی۔ ڈی۔ ٹی نے محض اس وجہ سے جیتا کہ جراثیمی امراض سے اتحادیوں کی فوجیں اس کے استعمال کی بدولت مامون رہیں۔

آج کل امریکا اور یورپ میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی بن رہا ہے۔ نیز ہندوستان میں ٹاٹا کمپنی نے بنانا شروع کیا ہے۔ مگر بیان کیا جاتا ہے کہ حیدرآباد کی انڈسٹریل لیبوریٹری نے مختلف ساخت کے ڈی۔ ڈی۔ ٹی کے سفوف کے تجربات کیے ہیں اور سب سے عمدہ ڈبلو۔ جے۔ بش لمیٹڈ لندن کا ساختہ پایا ہے۔ چنانچہ اسی قسم کے ڈی۔ ڈی۔ ٹی کا استعمال بھی محکمہ جات متعلقہ نے شروع کر دیا ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ ہمارا عظیم تر حیدرآباد اس اہم کیمیائی جز سے خود مکتفی ہو جائے۔ کیونکہ خام اشیائے ترکیبی یہاں بہم پہنچتے ہیں، اور ہز ایکسی لنسی صدر اعظم بہادر بذات خود ہندوستان کے سب سے بڑے رہبر صنعت اور صنعت گر ہیں۔ من جملہ اور صنعتوں کے ڈی۔ ڈی۔ ٹی کی ساخت پر توجہ مبذول ہونی چاہیے تاکہ یہ مفید و مؤثر دوا و جراثیم کش مصنوعہ ارزاں اور وافر مقدار میں دست یاب ہو سکے۔

ڈی۔ ڈی۔ ٹی کا اثر عملاً تین سے چھ ماہ تک رہتا ہے، اور مکھی، کھٹمل، مچھر، پسّو اور ان کے طفیلی جراثیم قطعی مگر بتدریج ہلاک ہو جاتے ہیں۔ طاعون کے خطرات کے رونما ہوتے ہی محکمۂ صحت کو ڈی۔ ڈی۔ ٹی کا استعمال شروع کرنا چاہیے اور عوام کو بھی حسب استطاعت اپنے مکانات میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی عمدہ قسم کا برتنا چاہیے تاکہ طاعونی پسّو اور ان کے طفیلی جراثیم تباہ ہو جائیں۔ غیر مستطیع آدمیوں کے گھروں کو قومی فلاح کے لحاظ سے ڈی۔ ڈی۔ ٹی سے جراثیم اور حشرات سے منزہ کرنے کے لیے محکمۂ صحت کو ہاتھ بٹانا چاہیے اور بہت وسیع پیمانے پر ہائڈرو سائنک گیس کے ذریعہ چوہوں کے سوراخ اور بل مسموم کیے جائیں۔

گلٹی کے طاعون میں گردن، بغل اور کنج ران کے غدود متورم ہوتے ہیں۔ بخار تیز ہو جاتا ہے۔ ساتویں یا دسویں دن اگر مریض بچا رہے تو بخار اور دیگر علامات میں تخفیف شروع ہو جاتی ہے۔

بھلانواں (جس کا لاطینی اور اصطلاحی نام انڈیکس اناکارڈیم ہے) طاعون میں بہت مجرب ثابت ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ضلع چھندواڑہ (سی پی) میں زور و شور سے طاعون نمودار ہوا تھا، لیکن تین ماہ کے دوران میں اموات واقع نہیں ہوئیں۔ بعض مقامی اہل فن سے جب تبادلۂ خیال کیا گیا تو معلوم ہوا کہ عوام نے خود ایک جدید تجربہ شروع کیا ہے اور وہ صحت یاب ہو رہے ہیں، یعنی بھلانوے کا شہد یا روغن چند قطرے دن میں دو تین بار دودھ میں ملا کر مریض کو پلاتے ہیں اور اسی کو طاعون کی گلٹی پر ضماد کرتے ہیں اور پُراسرار طور پر اچھے ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعہ راقم الحروف کا مشاہدہ تھا۔ اس کے بعد میں نے دیسی طب کے ماہرین سے اکثر اس بحث پر گفتگو کی اور خود بھی چند مرضا پر اس چیز کو کامیابی سے برتا ہے۔ حیدرآباد کے کسی قدیم طبیب کی مستند کتاب "یادگار رضائی" میں بھلانوے کو "از اعظم ادویۂ ہندیہ است" لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بھلانوے میں جراثیم کشی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہیضہ، طاعون اور نمونیا میں اس کا روغن بہ مقدار قلیل استعمال کرایا گیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے سرکاری معمل کیمیائی میں اس کے تجربات کیے جائیں۔

طاعون کا ٹیکہ حفظ ماتقدم کا بہترین اور کارآمد ذریعہ ہے۔ بغداد میں جب ۱۹۱۹ء میں طاعون نمودار ہوا اور اوائل جنوری سے لیکر وسط مئی تک اپنے شباب پر پہنچ گیا تو اس وقت طاعون کے ٹیکے کی

(باقی ۲۰۲ پر)

ڈاکٹری دوائیں پیمانۂ زندگی کو گھٹاتی ہیں

(از مسٹر ورنیک فیلڈ، ایڈیٹر رسالہ فزیکل کلچر امریکا)

یہ ایک حقیقت ہے کہ طبابت پیشہ ڈاکٹروں کی زندگیاں خاص طور پر مختصر ہوتی ہیں جماعتی حیثیت سے ان کی ہلاکت کا ریکارڈ بہ اعتبار عمر دوسرے پیشے والوں کے مقابلے میں کم ہے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی نا کہ میڈیکل سسٹم سے ان کا قریبی تعلق ان کے پیمانۂ زندگی کو گھٹا دیتا ہے۔ میں نے اکثر مواقع پر، ایڈیٹوریل مضامین میں اور پبلک لکچروں میں بھی کہا ہے کہ ان لوگوں کے مقابلے میں جو تیز و تند دواؤں سے پرہیز کرتے ہیں وہ لوگ جو جدید معیار والے میڈیکل سسٹم سے استفادہ کرتے رہتے ہیں، اپنی زندگیوں کے دس سے لے کر پچیس سال تک قربان کر دیتے ہیں۔

کچھ روز ہوئے نیویارک ہیرالڈ ٹریبون' کی ایک اشاعت میں ڈاکٹر ملز اسٹر تھوانٹ کی موت کا اعلان کیا گیا ہے، وہ ۶۳ سال کی عمر میں مر گئے۔ ڈاکٹر ملز "نیویارک یونیورسٹی آف میڈیسن" میں کلینکی طب کے پروفیسر اور امراضِ معدہ کے مشہور ماہر تھے۔ پھر اس کا کیا سبب ہے کہ ۶۳ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا؟ سب ڈاکٹر ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ تمام بیماریاں معدے سے شروع ہوتی ہیں اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک ماہر امراضِ معدہ کو کم از کم نوّے برس یا ایک سو برس تک زندہ رہنا چاہیے تھا۔

اخبار مذکور کی اسی اشاعت میں ڈاکٹر سی ہوسٹن گوڈس کے انتقال کی بھی خبر درج ہے ان کی عمر ۴۴ سال تھی، وہ تغذیہ کے ماہر تھے اور گھریلو اقتصادیات کے متعلق ایک رسالے کے ایڈیٹر تھے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ ایسے اہم موضوعات کے ماہرین اتنی کم عمر میں کیوں اس دنیا سے چل بسے؟

"اس سے یقینی طور پر یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ ڈاکٹری پیشہ میں بالخصوص ایلوپیتھک سسٹم میں جو بنیادی اصول تسلیم کر لیے گئے ہیں وہ غلط اور جھوٹے ہیں۔ اور اس پیشہ کی تمام کارروائیاں جو عصبی اور وظائفی بیماریوں میں اختیار کی جاتی ہیں وہ نظریہ اور عمل دونوں کے اعتبار سے غلط اور ناقص ہیں۔ اور جب اس طریقہ کو وہ ڈاکٹر کام میں لاتے ہیں جو اس سسٹم کو ناکافی اور ناقص جانتے ہیں، تو وہ اخلاقی طور پر مجرم ہیں"

جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں، ڈاکٹری پیشہ کے لوگ فاقہ کی قدر و قیمت کو ماننے سے انکار کرتے ہیں حالاں کہ اگر سائنٹفک طریقہ پر فاقہ کیا جائے تو اس سے حیرت انگیز معالجاتی فائدے برآمد ہوتے ہیں۔ ہم اکثر ایک "متوازن غذا" کے تذکرے سنتے رہتے ہیں جس میں چند غذائی چیزوں کو ملا جلا کر کھانے کے فائدے بتلائے جاتے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان کوششوں کی بھی ایک خاص قدر و قیمت ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ فائدہ اس طرح ہوتا ہے کہ شدید بیماریوں میں صرف ایک یا دو قسم کی غذا

ایک وقت کھائی جائے، اور دوسرے وقت اقسام میں تبدیلی کی جائے مگر تعداد میں اضافہ نہ کیا جائے۔ واضح رہے کہ استعمالِ غذا میں صرف سچی اور قدرتی بھوک کو اپنا رہنما بنانا چاہیے۔

اگر ہم حیوانات یا جنگلی جانوروں کی زندگی پر نگاہ ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ عام طور پر صرف ایک ہی غذا سے اپنی بھوک کو تشفی دیتے ہیں، اور بعض مرتبہ ہفتوں اور مہینوں تک کوئی دوسری غذا نہیں کھاتے۔

انسانوں کی دلچسپ مثالوں پر بھی غور کیجیے، جاپان اور چین کے باشندوں کی اصلی غذا "چاول" ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں، جن کو بڑی بڑی مدت تک چاول کے سوا کچھ بھی کھانے کو نہیں ملتا، مگر وہ پورے تن درست رہتے ہیں۔ لیکن یہ مشینوں میں صاف کیا ہوا اور "چھیلا" ہوا چاول نہیں ہوتا ہم جس قسم کا "کم زور" اور پالش کیا ہوا چاول کھاتے ہیں اس سے تو ایک بچہ خنزیر کو بھی بیاری لاحق ہو جائیگی کھانے کا اناج خواہ کوئی بھی ہو اگر اس کے کسی حصّہ کو الگ کیے بغیر اس کے پورے دانے پیسے اور تیار کیے جائیں تو وہ مکمل غذا کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے طویل مدتوں تک پورا تغذیہ حاصل ہوتا ہے۔

ہمیں امید کرنی چاہیے کہ ہم آج کل ڈاکٹری اصطلاح میں جس چیز کو "سائنس آف میڈیسن" کہتے ہیں، وہ ایک نہ ایک روز قدرتی قانون کا بھی مطالعہ کرے گا، اور اس سے کسی مرض کے علامات کو دبانے یا دوسری سمت پھیر دینے کے بجائے حصولِ صحت کے حقیقی طریقوں کا علم حاصل کرے گا۔ اور ڈاکٹر بھی ان معالجاتی قوتوں کا وجود تسلیم کریں گے جو انسانی جسم کے اندر موجود ہیں۔ جب قدرتی طور پر کسی بیاری کا سبب دور کر دیا جاتا ہے تو جسم اپنا علاج خود کر لیتا ہے۔

ہم پچاس برس سے قدرتی تعمیرِ صحت کے نظریے پیش کر رہے ہیں، اور جس چیز کو اب "سائنٹفک میڈیسن" کہتے ہیں وہ ایک طریقہ علاج کو ناکام دیکھ کر دوسرے طریقہ علاج کا کھوج لگاتی ہے اور اسی کام میں سرگرداں و پریشاں ہے۔

ہمارے بعض "سائنس دانوں" کو یہ احمقانہ خیال ہو گیا ہے کہ وہ قدرت سے بھی بہتر کارنامہ پیش کر سکتے ہیں۔ جب ہم خیال کرتے ہیں کہ ہمارے ماہرین ہمارے قادرِ مطلق خدا کے قانون کو بہتر بنا سکتے ہیں تو ہمیں ان پر ہنسی آتی ہے اور ہمیں ان کی ہٹ دھرمی پر نکتہ چینی کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔

روزہ

(از مولانا سید ابن الحسن صاحب فکر ایٹائی)

کیوں طالب تشریح ہو روزے کی فضیلت
روزے سے نہیں بڑھ کے کوئی حامیٔ صحت

ہمراہ عبادت کے، جو تقلیلِ غذا ہو
اس ماہِ مبارک کا کرم حد سے سوا ہو

پا جاتے ہیں اک تقویتِ نو۔ جگر و دل
اعضا کے وظائف کو سکوں ہوتا ہو حاصل

حد سے نہیں بڑھتا ہو کوئی بارِ غذائی
ہو جاتی ہو یوں معدہ و امعا کی صفائی

روزے میں نئی زندگی پاتی ہو طبیعت
احساس میں بیداری تو افکار میں رفعت

ہر مادۂ فاسد اعضا کو جلا کر
کندن یہ بنا دیتا ہو انسان کو یکسر

ہوتا ہو جو مسموم کثافت سے مبرا
خوں بنتا ہو پاکیزہ و شفاف و مصفا

ہر قطرے میں پاکیزگیٔ بادۂ اطہر
ہر جسمیہ" میں موجزن اک چشمۂ کوثر

اس زیست کو پیغام بقا دیتا ہو روزہ
کچھ عمر طبیعی بھی بڑھا دیتا ہو روزہ

کرتا ہو یہ دنیائے مسرت کو کشادہ
ہو جاتا ہو اعصاب کی طاقت کا اعادہ

ہو بھوک میں بھی روح کو اک کیف سا حاصل
تسلیم و رضا کی ہو حقیقی یہی منزل

پُر کیف ہر اک بات ہو ماہِ رمضاں کی
نورانی ہر اک رات ہو ماہِ رمضاں کی

روشن نہ ہوں کیوں قلب پہ اسرارِ الٰہی
روزہ ہو اک آئینۂ انوارِ الٰہی

مسنون ہیں افطار و سحر شوق سے کھائیں
خود جزوِ بدن بنتی ہیں صائم کی غذائیں

افطار جو ہو اک قدحِ "روح فزا"[1] سے
پھر تا بہ سحر شب کو نہ صائم رہیں پیاسے

ٹھہرے نہ کوئی مادۂ فاسد و طالح
انسان بہ ہر نوع بنے اشرف و صالح

صحت کے لیے باعثِ تجدید ہو روزہ
سچ پوچھو تو مومن کے لیے عید ہو روزہ

اک جزو مقدس ہو حدیث اور وحی کا
نسخہ بہت اعلیٰ ہو یہ طبِ نبوی کا

[1] شربت روح افزا

کتبۂ شفاعت احمد

شاہ سرطان (بڑے کیکڑے) کا شکار

اکثر مغربی اور مشرقی ممالک میں مچھلی یا لابسٹر (جھینگا مچھلی) کی طرح کیکڑا بھی بطور غذا استعمال کیا جاتا ہے۔ نسل اور شکل کے اعتبار سے مچھلی اور جھینگا مچھلی میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر جھینگا مچھلی اور کیکڑے میں ایک خاص قسم کی نوعی قرابت ہے۔ ہند و پاکستان کے ساحلی شہروں مثلاً بمبئی، کلکتہ، مدراس، کراچی وغیرہ میں بہت بڑی بڑی "بلاسٹر" جھینگا مچھلی ملتی ہیں جن کی جسامت بہت حیرت انگیز ہوتی ہے۔ ان شہروں میں کیکڑے بھی فروخت ہوتے ہیں، جن کی جسامت نسبتاً چھوٹی ہوتی ہے۔ لیکن شمالی سمندروں میں ایک بڑی قسم کا کیکڑا پایا جاتا ہے جسے "شاہ سرطان (King Crab)" کہتے ہیں۔ یورپین ممالک میں اس کی مانگ بہت زیادہ ہے، اور اس کو گوشت، مچھلی، لابسٹر سے کم وقعت نہیں دی جاتی۔ اس کا "سوپ" یعنی یخنی یا شوربہ بھی تیار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ مچھلی پکڑنے والے ماہی گیر اپنی کشتیوں پر مچھلیوں کے ساتھ کیکڑے بھی سمندر سے نکال لاتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں تاہم اس انڈسٹری یعنی کیکڑے نکالنے اور سپلائی کرنے کے لیے ایک جداگانہ جد و جہد بھی جاری ہوئی ہے، اور ان کو نکالنے اور غذا کے لیے تیار کرنے اور قابل فروخت بنانے کے لیے خاص قسم کے جہاز تعمیر کیے گئے ہیں جن میں جدید قسم کی مشینری بھی موجود ہوتی ہے۔ اس مضمون میں اس طرح کے ایک خاص جہاز کا ذکر کیا جاتا ہے جو شمالی سمندروں میں بڑے کیکڑے یعنی شاہ سرطان کا شکار کرتا ہے۔ اس کام کے لیے اس جہاز کا ایک ایک سفر تین تین ماہ تک جاری رہتا ہے۔

اگر آپ دنیا کے نقشے پر نظر ڈالیں گے تو شمالی حصے میں الاسکا اور سائبیریا کے درمیان ایک سمندری علاقہ دیکھیں گے جسے بحیرۂ بیرنگ کہتے ہیں۔ اس سمندر میں سفر کرنے اور کیکڑوں کا شکار کرنے کے لیے ایک خاص قسم کا بڑا جال کھینچنے والا جہاز ٹرالر (Trawler) تعمیر کیا گیا ہے، اس کا نام "ڈیپ سی" ہے، جس کے مستقل قیام کی مرکزی بندرگاہ سیٹل (Seatel) میں ہے۔ یہیں سے روانہ ہو کر یہ جہاز بہت دور شمال کی طرف بحیرۂ بیرنگ میں جاتا ہے اور بڑی تعداد میں شاہ سرطانوں کا شکار کر کے ان کو اپنے ہی عرشہ پر جدید ترین سائنٹفک آلات کے ذریعے صاف کر کے غذا کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس کام کے لیے غذائی صنعت کے ماہرین، اور گوشت کی تبرید و انجماد کا فن جاننے والے افراد بھی اس جہاز پر ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔

کچھ روز ہوئے جہاز "ڈیپ سی" نے اپنا پہلا سفر کیا تھا جو تین ماہ کی مدت کا تھا اور اس پہلے سفر میں اسے جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ اپنے شکاروں کی مندرجۂ ذیل مقدار لایا:-

(۱) پکے ہوئے، تیار کیے ہوئے، اور ڈبوں میں بند کیے ہوئے شاہ سرطان ۳۰,۰۰۰ پونڈ

(۲) پوست کے اندر ہی پکے ہوئے سرطانوں کے پنجے (زنبور ماہی) ۹٫۰۰۰ پونڈ
(۳) پکے ہوئے شاہ سرطان ۱٫۲۰۰ عدد
(۴) سامن، کاڈ، سول اور دوسری مچھلیاں ۸٫۰۰۰ پونڈ

جیسا کہ کہا گیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بحیرۂ بیرنگ سے آنے ہوئے شاہ سرطانوں کا یہ سب سے بڑا تیار شدہ ذخیرہ تھا۔

شاہ سرطان، ایک بڑے ہیکل کا خول دار (قشری) آبی جانور ہے جس کا اوسط وزن ۶ پونڈ سے ۸ پونڈ یعنی تقریباً تین سیر سے چار سیر تک ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی سر سے نیچے تک چالیس انچ یعنی تقریباً سوا تین فٹ (ایک گز سے زیادہ) ہوتی ہے۔ یہ جزیرہ نما الاسکا کے آس پاس شمالی سمندر میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اس کے گوشت کی ساخت دبافت ایک یورپی مچھلی "پرچ" کی سی ہوتی ہے، جو نہ لابسٹر (جھینگا) کی طرح گٹھیلی اور نہ معمولی چھوٹے کیکڑے کی طرح روغن دار ہوتی ہے۔ اس کا ذائقہ "میٹھا" ہوتا ہے جو لابسٹر" اور "ایبالون" (ایک یورپی مچھلی) کے ذائقہ سے ملتا جلتا ہے۔

جہاز "ڈیپ سی" کی تعمیر اس طرح پر ہوئی ہے کہ وہ ہر موسم میں سفر کرسکتا ہے۔ اگر موسم گرما میں وہ برفانی شمالی سمندروں کا سفر کرتا ہے اور شاہ سرطانوں کے شکار میں مصروف رہتا ہے تو موسم سرما میں وہ نیم جنوبی بحرالکاہل میں سفر کرکے مچھلیوں، کیکڑوں، لابسٹروں، اور دوسرے آبی جانوروں کا شکار کرکے ان کو غذا کے لیے تیار کرسکتا ہے۔ اس کی تعمیر اور موجودہ کامیاب مہم مسٹر سوول ویک فیلڈ کی سرگرمی اور تحقیقات کی مرہونِ منت ہے۔ وہ گہرے سمندروں میں شکار کرنے والی ماہی گیر کشتیوں اور جہازوں کی سوسائٹی کے صدر ہیں اور انھوں نے امریکا کی "فش اینڈ وائلڈ لائف سروس" اور دوسری سرکاری ایجنسیوں کے اشتراکِ عمل سے یہ کام انجام دیا ہے۔ گزشتہ جنگ سے پہلے "فوجی صنعتی" سرگرمی کے سلسلے میں جاپانی جہازوں کے بیڑے بحیرہ بیرنگ میں جال ڈالتے تھے اور ماہی اور کیکڑے پکڑتے تھے، لیکن امریکا اس سمندر کے لامحدود ذرائع سے غافل تھا۔ اب معلوم ہوگیا کہ ساری دنیا کے گہرے سمندروں میں جال ڈال کر مچھلیاں پکڑنے کے قابل علاقوں میں اس سے بڑا (؟) علاقہ کوئی نہیں ہے۔

امریکا کی بھیجی ہوئی مہمات نے کچھ روز پہلے اس علاقہ ماہی گیری کی دیکھ بھال کی تھی مگر "ڈیپ سی" پہلا جہاز تھا جس نے تجارتی اغراض سے "بحیرۂ بیرنگ" میں بڑے جال ڈالے اور شاہ سرطانوں اور مچھلیوں کا شکار کیا۔ چونکہ کیکڑے خول بدلتے ہیں اور تبدیلِ مقام کرتے ہیں، اور اس کے علاوہ ایک ہی سمندر سے اور ایک ہی جال میں کیکڑوں کے ساتھ مچھلیاں بھی آجاتی ہیں، اس لیے دورانِ شکار میں ایسے جال اور ایسے آلات استعمال کیے جاتے ہیں جو دونوں کو گرفت میں لاسکیں۔ جہاز "ڈیپ سی" کی بار برداری کی اصلی گنجائش بھی اس ناپ کے جہازوں سے تین گنی ہے یعنی چونکہ کیکڑوں اور مچھلیوں کی ہڈیاں اور ناقص حصے جو غذا کے لائق نہیں ہوتے، دورانِ تیاری و پختگی و عملِ انجماد (؟) پھینک دیئے جاتے ہیں اور صرف گوشت والا حصہ باقی رہ جاتا ہے اس لیے دو تہائی وزن زیادہ وزن کی گنجائش نکل آتی ہے۔

پکڑنے، مارنے اور پکانے کا عمل :-

"ڈیپ سی" جہاز کے جال اور اس کے متعلقہ ساز و سامان ایسے ہیں جیسے آئس لینڈ کے ساحلی علاقوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کا "دہانہ" اونچا ہوتا ہے جس کی مخصوص ساخت کا مقصد یہ ہے کہ اس میں "کاڈ" اور "پولوک" قسموں کی مچھلیاں بھی داخل ہو سکیں جو آزادی سے سمندروں میں تیرتی رہتی ہیں، اور وہ دوسری مچھلیاں اور شاہ سرطان بھی آ جائیں جو سمندر کی تہ میں رہتے ہیں۔ جتنی مچھلیاں اور کیکڑے اس بڑے جال میں آ جاتے ہیں، ان کو جہاز کے عرشہ پر ڈال کر فوراً چھانٹ لیا جاتا ہے، اور بڑے بڑے ظروف میں جن کو "چیکرز" کہتے ہیں، الگ الگ کر دیا جاتا ہے۔ کیکڑوں کو مارنے کے لیے ایک خاص قسم کا آنکڑا اور چاقو کا پھل استعمال کیا جاتا ہے اور ان کی کاٹی ہوئی ٹانگوں کے ڈھیر کو بڑے بڑے برتنوں میں جو مشینوں کے ذریعہ حرکت کرتے اور چلتے ہیں "معمل" یا غذا سازی کارخانے کے مخصوص حصے میں پہنچا دیا جاتا ہے، جہاں دھونے اور صاف کرنے کے بعد ان کو ایک بند ظرف میں سترہ منٹ تک بھاپ کے ذریعہ پکایا جاتا ہے۔ پھر اس ظرف سے نکال کر ان کو ایک میکانی میز پر ڈال دیا جاتا ہے جہاں سات آدمی کیکڑوں کے گوشت کو ان کی ٹانگوں سے الگ کر لیتے ہیں۔ اور اگر مچھلیاں ہوتی ہیں تو ان کے قتلے کاٹ لیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ساتوں مقامات سے بے کار چیزوں کے ڈھیر اٹھا لیے جاتے ہیں اور ایک متحرک برتن میں کارخانہ کی دوسری طرف لے جا کر باریک پیس کر سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے۔

اب شاہ سرطان کی ٹانگوں کا جو گوشت باقی رہ جاتا ہے اسے بھی ایک "چلنے والے" برتن میں "عرق پاش آلات" سے نکلنے والی پھواروں کے ذریعہ دھو ڈالا جاتا ہے اور کارخانہ کے دوسرے حصے میں لے جا کر "معائنہ کی میز" پر ڈال دیا جاتا ہے۔ وہاں اس میں سے بچے بچائے چھلکوں کے ٹکڑوں یا ناقابل غذا حصوں کو چن کر نکال دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد گوشت کو تول تول کر مخصوص سانچوں میں رکھ دیا جاتا ہے تاکہ ان پر تبرید و انجماد کا فوری عمل کیا جائے۔ پیکنگ کا یہ کام تین مقامات پر ہوتا ہے تاکہ جلد ختم ہو جائے۔

انجماد کا عمل :-

تبرید و انجماد کے عمل کے لیے بڑی بڑی کشتیاں استعمال کی جاتی ہیں جو ۴ فٹ لمبی ہوتی ہیں اور ان کے اندر تین خانے ہوتے ہیں۔ ان کشتیوں یا سینیوں کے بھر جانے کے بعد ان کو ڈھکنوں سے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ ڈھکنے بہت سخت اور کسے ہوتے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ عمل انجماد میں کیکڑوں کا گوشت جب پھیلتا ہے تو یہ ڈھکنے اس پر دباؤ ڈالتے ہیں اور جو ہوا اس میں موجود ہوتی ہے اسے خارج کر دیتے ہیں۔ یہ بھری ہوئی بند کشتیاں حرکت کرنے والے پٹیوں کے ذریعہ ایک لمبی سرنگ میں داخل کر دی جاتی ہیں، جہاں ان پر انتہائی تیزی سے انجماد کا عمل ہوتا ہے۔ یہ سرنگ ایک نئی قسم کی "ٹھنڈی بھٹی" ہے جو ہوا کے تیز جھونکوں کے ذریعہ درجہ انجماد سے بھی نیچے ڈگری کی برودت پیدا کرتی ہے اس آلے کا موجد ویک فیلڈ ہے، اور اسے پہلی مرتبہ جہاز "ڈیپ سی" پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس بار د

سرنگ میں گوشت کی کشتیاں تہ بہ تہ رہتی ہیں اور زنجیروں کے ذریعہ حرکت کرتی ہیں دو گھنٹے تک نقطۂ انجماد سے بھی ۲۵ ڈگری نیچے کی برودت میں رکھی جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ نکال لی جاتی ہیں۔

اب ان کشتیوں کو گرم پانی میں ڈال کر ہر کشتی کے تینوں خانوں میں سے گوشت کی تین منجمد "سلیاں" نکال لی جاتی ہیں، اور انھیں تازہ پانی میں دھو کر ظرفِ تبرید (ریفری جریٹر) (Refrigrator) میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح شاہ سرطانوں کے شکار اور ان کے گوشت کی تیاری کا عمل جاری رہتا ہے، اور جب اس کام سے فرصت ہو جاتی ہے اور واپسی کے لیے جہاز روانہ ہوتا ہے تو راستے میں گوشت کے ۷ ½ اور ۳ ½ انچ کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر الومینیم کے ڈبوں میں پیک کر کے سر بند کر دیے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے الاسکا کے شاہ سرطان صرف ٹین کے ڈبوں میں ملا کرتے تھے، اب "ڈیپ سی" جہاز کی نئی سرگرمیوں کے باعث ان کے گوشت کے ٹکڑے منجمد حالت میں لفاست کے ساتھ پیک کیے ہوئے دستیاب ہوتے ہیں۔ ان کیکڑوں کا قابلِ غذا گوشت، ان کی ٹانگوں ہی میں ہوتا ہے۔ پکے ہوئے گوشت کا رنگ سفید ہوتا ہے۔

(فوڈ مینوفیکچر کے شکریہ کے ساتھ)


ہمدرد
ہیئر آئل
ہمدرد کوسمیٹکس
کراچی

ورزش

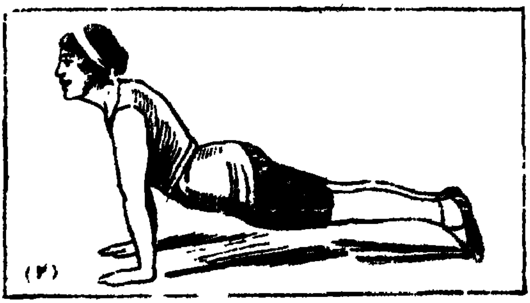
عورتوں کے لیے کچھ مفید اور ضروری ورزشیں
ان ورزشوں کو مرد بھی بلا تکلف کر سکتے ہیں۔


(۱)

پہلی ورزش: بالکل سیدھی کھڑی ہو جائیے اس طرح کہ بازو سر کے اوپر کھینچے رہیں اور ٹانگیں نیچے تنی رہیں۔ اس کے بعد آگے کی طرف جھکیے، یہاں تک کہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹک جائیں۔ یہ خیال رہے کہ ٹانگوں میں خم پڑے نہ بازوؤں میں، جیسا کہ شکل ۱ سے ظاہر ہو۔ پھر ہاتھوں سے آگے کی جانب چلنا شروع کیجیے، یہاں تک کہ آپ اس پوزیشن میں آجائیں، جیسا کہ شکل ۲ میں دکھائی گئی ہے۔ یہ خیال رکھیے گا کہ بس ہاتھوں ہی سے آپ آگے چلیں گی، پاؤں اپنی جگہ پر جمے رہیں گے۔ اس کے بعد ہاتھوں سے پھر پیچھے کی جانب چلیے اور ساتھ ہی رفتہ رفتہ پاؤں کے تلووں کو بھی فرش پر ٹکاتے جائیے یہاں تک پھر آپ اس پوزیشن میں آجائیں جیسا کہ شکل ۱ سے ظاہر ہو رہی ہے۔ یہ گویا اس ورزش کی تکمیل ہوئی اسے آپ ایک سے پانچ مرتبہ تک کر سکتی ہیں۔

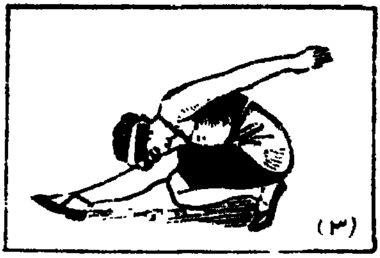
یہ ورزش آپ کی کلائیوں، بازوؤں اور ٹانگوں کے عضلات کو مضبوط کرنے کے لیے نہایت ہی مفید ثابت ہوگی۔ اس کے علاوہ پیٹ کے عضلات پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اور وہ مضبوط ہو جاتے ہیں۔

دوسری ورزش:۔ سیدھی کھڑی ہو کر گھٹنوں کے بل اس طرح بیٹھیے کہ دائیں ٹانگ باہر کی طرف پھیل جائے، بایاں ہاتھ پیچھے کی جانب پھیلا ہوا ہو، دایاں ہاتھ فرش پر ٹکا ہوا ہو اور جسم آگے کی جانب اتنا جھکا ہوا ہو کہ سر دائیں گھٹنے کو مس کرنے لگے جیسا کہ شکل ۳ سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ورزش جسم میں لچک اور عضلات پر قابو پیدا کرنے کے لیے نہایت ہی عمدہ بتائی جاتی ہے۔ اس ورزش کا شروع میں چھ مرتبہ کر لینا کافی


(۲)

ہوگا۔ مشق ہو جانے پر دس، بارہ مرتبہ تک کیا جائے۔

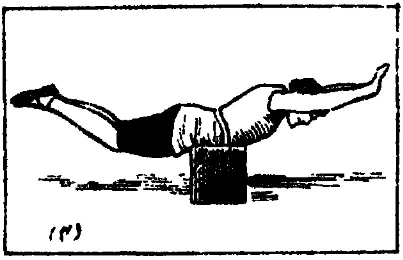
تیسری ورزش: کسی چھوٹے اسٹول پر پیٹ کے بل لیٹ جائیے، اور بہ یک وقت اگلا اور پچھلا حصۂ جسم بازوؤں اور ٹانگوں سمیت جہاں تک اوپر اٹھا سکیں اٹھائیے جیسا کہ شکل ۳ سے ظاہر ہے۔



(۳)

یہ ورزش اگر باقاعدہ کی جائے گی تو ابتدا میں کافی سخت معلوم ہوگی۔ اس سے کولھوں، کمر اور پیٹ کے عضلات خوب مضبوط ہوتے ہیں اور بڑھے ہوئے پیٹ میں بھی بڑی حد تک کمی واقع ہو جاتی ہے۔

چوتھی ورزش: ایک پاؤں اسٹول پر رکھیے اس طرح کہ بازو بلند ہیں جیسا کہ شکل ۵ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کے بعد آگے کی طرف جھکیے اور دونو ہاتھوں سے اسٹول پر رکھے ہوئے پاؤں کے پنجے کو چھوئیے جیسا کہ شکل ۶ میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے بعد بازوؤں کو حسبِ سابق سر کے اوپر لے جائیے۔

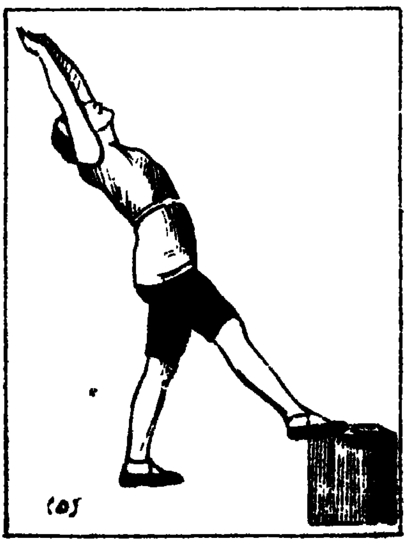


(۴)

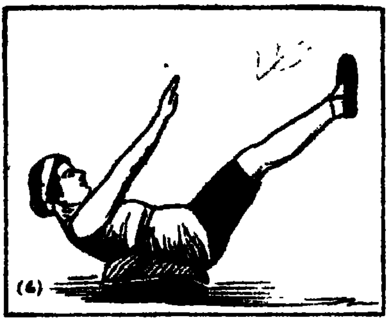
یہ ورزش آپ کی کمر اور ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط کرنے کے لیے مخصوص ثابت ہوگی۔



(۶)



(۵)



(۷)

پانچویں ورزش: کسی اسٹول یا موٹے گدے پر جیسا کہ شکل ۷ میں دکھا گیا ہو، کمر کے بل لیٹیے، اس طرح کہ بازو اوپر کی جانب تنے رہیں اور ٹانگیں بالکل سیدھی رہیں۔ اس کے بعد ٹانگوں اور ہاتھوں کو اتنا اور اس طرح بلند کیجیے کہ وہ ایک نقطہ پر پہنچکر ایک دوسرے سے چھو جائیں۔ پھر واپس پہلی پوزیشن اختیار کر لیجیے۔ دوبارہ یہی ورزش کیجیے۔ یہ خیال رہے کہ ہاتھ زمین کو نہ چھوئیں۔

یہ ورزش پیٹ کے عضلات کے لیے نہایت مفید ہی۔ اس سے وزن کم کرنے میں بھی مدد ملتی ہی۔



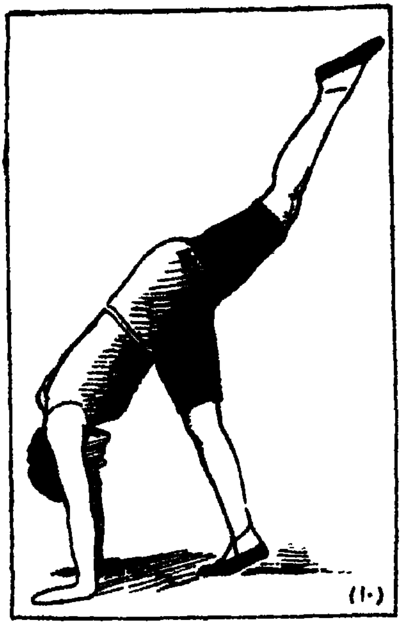
(۹)



(۸)

چھٹی ورزش: دونوں کولھوں پر ہاتھ رکھ کر جیسا کہ شکل ۸ اور ۹ میں دکھایا گیا ہی، ہر ایک ٹانگ کو باری باری آگے اور پیچھے کی طرف جھولائیے اس طرح کہ پاؤں فرش سے نہ لگے۔ ہر ایک ٹانگ سے کم سے کم چھ مرتبہ ضرور کرنا چاہیے۔

اس ورزش سے نہ صرف کولھوں کا غیر ضروری گوشت کم ہوتا ہی بلکہ آنتوں کا بھی اچھا خاصا مساج ہو جاتا ہی۔

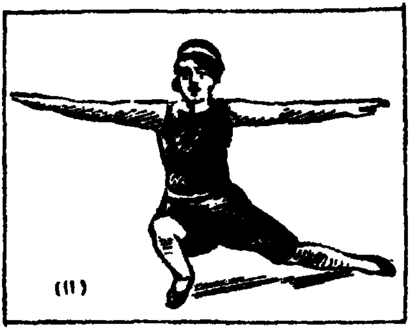

(۱۰)

ساتویں ورزش: پہلی ورزش کی طرح پہلے سیدھی کھڑی ہوئیے، پھر آگے کی طرف جھکیے۔ یہاں تک کہ ہاتھ زمین پر ٹک جائیں۔ اس کے بعد باری باری سے ہر ٹانگ جتنی بلند کی جا سکے بلند کیجیے۔ اسے آہستہ کرنا چاہیے اور صحیح طریق پر۔

اس ورزش سے کولھوں، پنڈلیوں رانوں اور ٹخنوں پر سے غیر ضروری گوشت کم ہوتا ہے اور بازو مضبوط ہوتے ہیں۔ (شکل ۱۰)

آٹھویں ورزش: اس طرح سیدھی کھڑی ہوئیے کہ دونوں بازو شانوں کی جانب پھیل جائیں، پھر دائیں ٹانگ پر تو بیٹھیے اور بائیں ٹانگ کو ایک طرف پھیلا دیجیے جیسا کہ شکل ۱۱ سے ظاہر ہو رہا ہے۔

اس کے بعد اسی طرح بازوؤں کو تو ایسا ہی پھیلا رہنے دیجیے اور کھڑے ہو کر بائیں ٹانگ پر بیٹھیے اور دائیں ٹانگ کو پھیلا دیجیے


(۱۱)

یہ ورزش ٹخنوں اور پنڈلیوں پر سے غیر ضروری گوشت کو کم کرتی ہے اور جسم کے توازن کو قائم کرتی ہے۔

نویں ورزش:۔

کسی کرسی کی پشت پر ایک ٹانگ رکھیے اس طرح کہ دونوں ہاتھ آپ کے کولھوں پر ہوں، پھر آگے جھکیے اتنا کہ کرسی پر رکھی ہوئی ٹانگ پر تمہارا سر رکھا جائے، پھر واپس ہو جائیے۔ اسی طرح دوسری ٹانگ کرسی پر رکھیے اور وہی سب کچھ کیجیے جو پہلی ٹانگ کرسی پر رکھنے کے بعد کیا تھا

ملاحظہ ہو شکل ۱۲

دسویں ورزش:۔ اس طرح بالکل سیدھی کھڑی ہوئیے کہ آپ کے پاؤں کے درمیان دو فٹ کا فاصلہ رہے اور دونوں بازو شانوں کے متوازی دونوں پہلوؤں میں پھیلے رہیں۔ اس کے بعد جسم کے بالائی حصے کو دائیں طرف موڑیے اور پھر پیچھے کی جانب جھکیے جیسا کہ شکل ۱۳ میں دکھایا گیا ہے۔ اب

سیدھی ہو جائیے اور حسب سابق پوزیشن میں آجائیے۔
پھر دوسری یعنی بائیں جانب جسم کو موڑیے اور اسی
طرح پیچھے کی جانب جھکیے اور جسم کو اٹھائیے۔



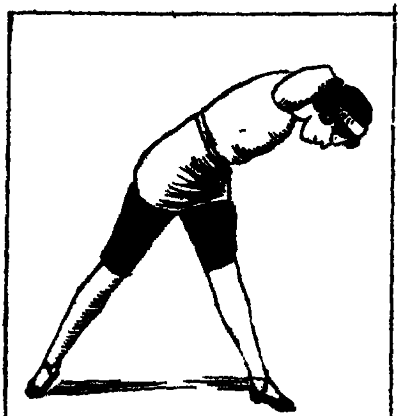
(۱۳)



(۱۲)

یہ ورزش ٹخنوں، گھٹنوں کے جوڑوں اور ریڑھ کے مہروں کے لیے غایت درجہ مفید ہے۔

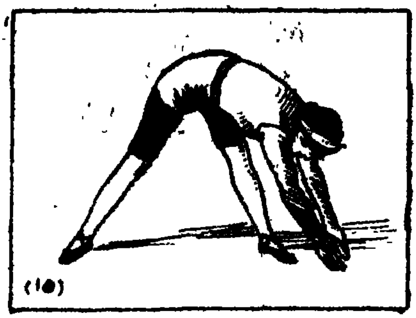
گیارھویں ورزش: اس طرح سیدھی کھڑی ہو جئیے کہ دونوں پاؤں کے درمیان کوئی دو فٹ کا فاصلہ رہے اور ہاتھ گردن پر اس طرح رکھے ہوئے ہوں کہ کہنیاں خوب پیچھے کی جانب کھچی ہوئی ہوں۔ اس کے بعد بالائی حصۂ جسم کو بائیں طرف موڑیے اور پھر نیچے کی جانب جھکیے جیسا کہ شکل ۱۴ میں دکھایا گیا ہے۔ یہ خیال رہے کہ کہنیاں اسی طرح پیچھے کی طرف کھچی رہیں۔ پھر جسم کو اٹھائیے اور اسی طرح دائیں طرف موڑیے اور جھکائیے اس کے بعد جسم کو اٹھائیے اور پھر سامنے کے رخ پاؤں کی مطابقت میں جھکیے آخر میں ہاتھوں کو بھی گردن پر سے ہٹا کر پہلوؤں میں گرا لیجیے۔



(۱۴)

یہ ورزش آپ کے بالائی حصۂ جسم کے عضلاتی نظام کو چست رکھنے کے لیے بڑی مفید ہے۔

بارھویں ورزش:۔ اس طرح سیدھی کھڑی ہوجائیے کہ دونوں ٹانگوں کے درمیان کوئی دو فٹ کا فاصلہ رہے اور ہاتھ گردن پر رکھے ہوں یہ خیال رہے کہ جسم چست اور سیدھا رہے۔ اس کے بعد آگے کی جانب جھکیے اور ہاتھوں کو پہلے بائیں پاؤں سے دُور آگے کی جانب جہاں تک پھیلایا جاسکے پھیلائیے۔ جیسا کہ شکل ۱۵ سے



(۱۵)

ظاہر ہو رہا ہی۔ پھر جسم کو اٹھا کر سیدھا کرلیجیے۔ اور ہاتھوں کو اسی طرح گردن پر رکھ لیجیے۔ دوسرے پاؤں کی طرف بھی اسی طرح جھکیے اور ہاتھوں کو پھیلائیے۔ یہ کافی مشکل ورزش ہی اگر صحیح طریق پر انجام دی جائے۔ یہ ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے کو بہت لچکدار بناتی ہی۔

تیرھویں ورزش:۔

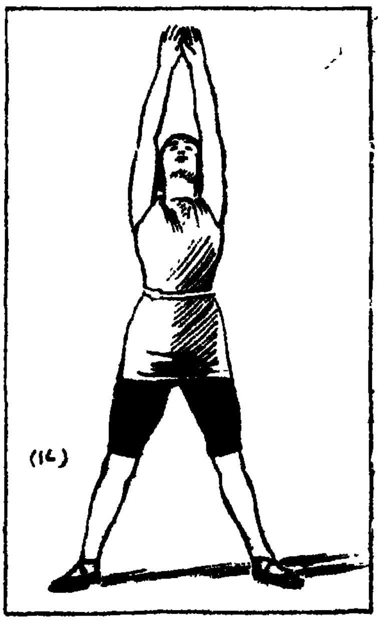
اس طرح کھڑی ہوئیے کہ دونوں پاؤں کے درمیان کوئی ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ



(۱۶)

رہے۔ پھر دونوں ہاتھوں کو سر کے اوپر لیجائیے جیسا کہ شکل نمبر ۱۶ میں دکھایا گیا ہی۔ اس کے بعد بالائی حصۂ جسم کو ہاتھوں سمیت نیچے کی جانب لائیے اس طرح کہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں باہر کی طرف رہیں اور زمین سے چھو جائیں۔ پھر سیدھی کھڑی ہوجائیے اس طرح یہ گویا ایک مرکب حرکت ہوگی۔ ایسی دس پندرہ حرکتیں کافی ہوں گی اس ورزش سے جسم کی تمام سختی جاتی رہے گی اور معدہ اور آنتوں میں بھی مناسب تحریک ہوگی

ملاحظہ ہو شکل نمبر ۱۷



(۱۷)


AKHLAQ

ایک معالج کے اعترافات

(۱)

مندرجۂ ذیل سلسلۂ مضامین ایک روسی ڈاکٹر وی، ویری سیف (Dr. V. Veresaff) کی کتاب 'ایک معالج کے اعترافات' (The Confession of a Physician) سے ماخوذ ہے۔ مصنف نے نہایت بے باکی اور صفائی کے ساتھ ان تمام کمزوریوں کو کھول کھول کر بیان کیا ہے جن میں کم و بیش ہر ڈاکٹر مبتلا ہے۔ اس نے فنِ شریف کے ان پہلوؤں کو منظرِ عام پر لا دکھایا ہے جنھیں ڈاکٹروں نے ہمیشہ عیب ہی کی طرح چھپایا اور کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ایک ڈاکٹر کے ایسے کھلے اعتراف میں جہاں بُرائی کا پہلو نکلتا ہے، وہاں بڑی حد تک عبرت اور سبق حاصل کرنے کے مواقع بھی بہم پہنچتے ہیں۔ اب یہ ہمارے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہے کہ ہم محض بُرائی ہی کا پہلو لیتے ہیں یا کچھ سبق بھی حاصل کر لیتے ہیں۔

ان مضامین میں ڈاکٹر موصوف نے صرف اپنے مطب ہی کے تجربات و واردات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ میڈیکل کالج میں داخل ہونے کے بعد ہی سے اپنے تاثرات کو قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے اپنی ہر کلاس اور ہر امتحان کی وارداتوں کو بھی نہایت بے باکی کے ساتھ اپنے ملک والوں کے سامنے پیش کیا ہے تاکہ فنِ شریف کا کوئی گوشہ اور پہلو نظر کے سامنے آنے سے رہ نہ جائے۔ ہم بھی ترجمہ میں اس التزام کی کوشش کریں گے کہ جن نکات کو ڈاکٹر موصوف ناظرین کے سامنے زیادہ واضح کرنا چاہتے ہیں، وہ ہماری کسی کوتاہی کے باعث دب کر نہ رہ جائیں۔

کیا حکیم اور کیا ڈاکٹر اور وید سب ہی کے لیے یہ سلسلۂ مضامین دل چسپی کا باعث ہوگا اور غیر فنی حضرات کی دل چسپی کا بھی اس میں پورا پورا سامان موجود ہے۔

(ہمدرد صحت)

جب تک میں اسکول میں رہا، مجھے نصابِ تعلیم سے ہمیشہ نفرت سی رہی۔ نصاب کی ہر کتاب کے مطالعہ سے مجھے وحشت ہوتی اور اس میں میرے لیے کوئی دل چسپی نہ ہوتی، مگر اس کے باوجود کسی نہ کسی وجہ سے ان کا پڑھنا اپنے لیے ضروری سمجھتا اور خواہی نخواہی ان کے مطالعے میں لگا رہتا۔ غور فرمائیے مجھے اس بات سے کیا دل چسپی ہو سکتی تھی کہ فلاں ابن فلاں اس خاص تاریخ سے ولی یا قطب سمجھے جاتے تھے اور اس کے بعد سے پوری قوم انھیں اپنا روحانی رہنما سمجھنے لگی تھی۔ یہ میں نے

نصاب تعلیم کی کتابوں میں سے نمونۃً ایک چیز پیش کی ہے۔ بس اسی پر سارے نصاب تعلیم کو قیاس کر لیجیے، میں اس زمانے میں زیادہ تر غیر نصابی چیزوں کا مطالعہ کرتا تھا، اس لیے دماغی تربیت اور میرا ذہنی نشو ونما جو کچھ بھی ہوا ہے، اسکول کے اوقات اور نصاب تعلیم کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔ لیکن جیسے ہی میں یونیورسٹی میں داخل ہوا، میری حالت ہی بدل گئی۔ میں نے "میڈیسن" لیا تھا۔ چنانچہ پہلے دو سال تو نیچرل سائنس مثلاً کیمسٹری، علم طبیعیات، علم نباتات، علم حیوانات اور علم عضویات کے کتابی مطالعہ میں گزرے۔ یہ مضامین میرے لیے اس قدر نئے اور دلچسپ تھے کہ میری تمام توجہ ان کے اندر جذب ہو گئی۔ اس سے پہلے میں اپنے گرد و پیش کی ان چیزوں کو محض ایک جانور اور ایک وحشی کی نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن ان مضامین کے مطالعہ نے اس کائنات کو میرے سامنے کچھ دوسرے ہی رنگ میں پیش کیا۔ مجھے اپنے اوپر حیرت ہوتی تھی کہ آخر یہ کیوں ہوا کہ میں بیس سال کا ہو گیا اور اب تک ان حقائق کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔

ہر دن اور ہر لکچر میرے لیے اپنے ساتھ نئی نئی 'دریافتیں' لاتا تھا اور میں ایک ایک چیز پر حیرت میں رہ جاتا تھا مثلاً یہ معلوم ہونا ۔۔ کہ یہ گوشت جو ہم کباب اور سالن کی شکل میں کھاتے ہیں یہی عضلات جسم میں منتقل ہو جاتا ہے۔ پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ ٹھوس غذا جو ہم کھاتے ہیں یہ معدے سے آنتوں میں چلی جاتی ہے، اور سیال چیزیں مثلاً شربت، چاء، یا پانی وغیرہ جو ہم پیتے ہیں یہ گردوں میں چلا جاتا ہے۔ تنفس کے متعلق پہلے میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ سانس لینے سے جو سینہ پھیلتا ہے تو اس کا سبب کوئی نامعلوم قوت ہے جو ہوا کو اندر کی طرف کھینچتی ہے۔ میں قدرت کے ان قوانین سے بھی کسی نہ کسی حد تک واقف تھا کہ نظام عالم میں مجموعی قوت ہمیشہ یکساں رہتی ہے

لیکن ان علمی کتابوں کے مطالعے سے پہلے میرا دل اسے مانتا نہیں تھا، ان علوم کو حاصل کر لینے کے بعد تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہمارا تعلیم یافتہ کہلانے والا طبقہ بھی بہت سی باتوں کے متعلق ایسے نظریات رکھتا ہے جسے علم و سائنس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان لوگوں کے علم کی بھی قلعی کھل گئی جنھیں ہم اپنے خیال میں بڑا عالم فاضل سمجھتے تھے۔ انھیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ فاسفورس اندھیرے میں کس وجہ سے آگ کی طرح روشن ہو جاتا ہے، اس ناواقفیت اور لاعلمی پر انھیں کبھی شرمندگی کا بھی احساس نہیں تھا، اگرچہ بعض علم کی شاخوں مثلاً تاریخ میں اگر کبھی جو وہ یہ نہ بتا سکے کہ لوئی چہاردہم کونسی صدی میں گزرا ہے تو شرم کے مارے پانی پانی ہو جائے۔ حالاں کہ اس بات کا تعلق بڑی حد تک حافظے سے ہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ بعض لوگ لاشوں کے چیرنے پھاڑنے سے گھنیا کر میڈیسن ہی کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک شخص کو اس قسم کے خوفناک نظاروں سے مانوس ہونے کے لیے کچھ وقت ضرور لگتا ہے۔ شروع شروع میں اگر آپ کو کسی ایسے کمرے میں داخل ہونا پڑے جو کئی بھٹی لاشوں سے بھرا پڑا ہو اور ان میں کسی کی آنکھیں شیشے کی طرح چمک رہی ہوں، کسی کے دانت باہر نکلے ہوئے ہوں تو کسی کی انگلیاں اکڑ کر ایسے پنجے کی طرح بن گئی جو کسی کو اپنے گرفت میں

لیا چاہتا ہو تو طبعی طور پر آپ دہشت زدہ ہو جائیں گے۔ مجھے یاد ہے ہمارے ایک ساتھی پر تو اس کا اتنا خراب اثر پڑا کہ اس نے میڈیسن کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مضمون لے لیا۔ کئی روز تک رات کو خواب میں اسے اپنا کمرہ لاشوں سے بھرا ہوا نظر آیا، اور کمرے کے ہر گوشے سے خون میں لت پت اعضا، اس کے پلنگ کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ بالآخر اس نے گھبرا کر نہ صرف اس مضمون ہی کو چھوڑ دیا بلکہ وہ دو ہفتے کے لیے کہیں شہر کے باہر چلا گیا تاکہ اس کے خیالات سے مردہ لاشوں والے ہال کا تصور نکل جائے اور کچھ دوسری اچھی خوش گوار چیزوں کا نقشہ جم جائے۔ لیکن مجھ پر اتنا ناگوار اثر نہیں ہوا، بلکہ میں تو ایک دو روز میں اس ماحول سے اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ گھنٹوں ان لاشوں کے درمیان بیٹھا رہتا اور انسانی جسم کی کھلی ہوئی مشینری کا مطالعہ کرتا رہتا۔ پورے آٹھ ماہ کا وقفہ میں نے علم تشریح کے لیے وقف کر دیا تھا، چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ انسان کے متعلق میرے ذہن میں عجیب و غریب قسم کے نظریات قائم ہو گئے، اور میں جس شخص کو بھی دیکھتا علم تشریح ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا۔

اگر میں کسی شخص کو گلی یا بازار میں چلتے پھرتے دیکھتا تو عالم تصور میں مجھے اس کے جسم کی ایک ایک چیز نظر آنے لگتی اور وہ مجھے ایک زندہ لاش معلوم ہوتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہلتے دیکھتا تو فوراً مجھے ان عضلات کا خیال آجاتا جن کی وجہ سے ہاتھ پاؤں حرکت کرتے ہیں۔ اگر کسی کے ہاتھ سے چھڑی یا کوئی اور چیز گر جاتی اور وہ جھک کر اٹھاتا تو میں اسی پر غور کرتا کہ سینے اور پیٹ کے ان عضلات نے اس چیز کو اٹھانے میں مدد دی، اگر یہ عضلات نہ سکڑتے تو وہ شخص اس گری ہوئی چیز کو جھک کر نہ اٹھا سکتا تھا۔ حالاں کہ کسی شخص کے ہاتھ سے کسی چیز کا گرنا دوسرے بہت سے اعتبارات سے دل چسپی کا باعث ہو سکتا تھا۔ مگر اس خاص زمانے میں میری رگ رگ میں علم تشریح (اناٹومی) گھس گیا تھا، یہاں تک کہ حسین سے حسین عورت بھی میرے لیے اپنی صنفی کشش کھو کر تشریحی دل چسپی کا باعث بن جاتی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی میرا دماغ اس تجزیہ میں مصروف ہو جاتا کہ اس کے حسین چہرے اور گلاب سے رخساروں کے اندر اتنی ہڈیاں اور اتنے دانت ہیں۔ اتنے غدد اور اتنی شریانیں ہیں، اتنی وریدیں اور اتنی عروق جاذبہ ہیں اور اس کی لمبی لمبی زلفوں اور بالوں کے نیچے کئی ہڈیوں سے جڑی ہوئی ایک کھوپڑی ہے اور اس کے اندر دماغ ہے جس میں بے شمار نشانات اور نشیب و فراز ہیں۔ گویا کوئی نئی اور غیر معمولی بات ہی نہیں ہے۔ سینکڑوں دوسری بدصورت لڑکیوں کے دماغ بھی میں نے ایسے ہی دیکھے ہیں۔ اس کے خوبصورت بازو اور جسم کے دوسرے پُرگوشت حصوں پر نظر پڑتی تو اس سے بھی صنفی گدگدی محسوس کرنے کے بجائے میں اس تشریحی الٹ پھیر میں لگ جاتا کہ اس کے عضلات میں تہ در تہ چربی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے عورتوں کی لاشوں کی چیر پھاڑ میں اچھی خاصی دقت محسوس ہوتی ہے۔ غرض اس تشریحی تجزیہ کے سامنے حسن، رومان اور شاعری سب تحلیل ہو کر رہ جاتے، اور میں ایک خشک اور بے لچک سا انسان بن کر رہ جاتا۔

علم تشریح کی فراہم کردہ معلومات سے کہیں زیادہ دلچسپ اس کا طریقہ تعلیم تھا جس نے مجھے بےحد متاثر کیا تھا۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ایک ایک چیز کو نہایت قطعیت اور صحت کے ساتھ تجربات و مشاہدات کی مدد سے اس طرح ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ اس میں پھر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ جو ایک مرتبہ پڑھ لیا جاتا، اسے خالص علم کی حیثیت سے ذہن میں محفوظ کر لیا جاتا۔ یہ عملی تعلیم جو ہم انسانی لاشوں کے اندرونی اعضا کو بچشم سر دیکھ دیکھ کر حاصل کرتے تھے اپنے اندر بے پناہ دلچسپیاں اور جاذبیتیں رکھتی تھی اور ایمان کی بات ہے کہ کلاس روم کی خشک منطقی بحثیں اس کے سامنے ہیچ تھیں۔

دوسرے سال کے اختتام پر یعنی انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد کالج میں ان نظری علوم کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا اور عملی کام یعنی مطب کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد تو ہمارے علم کی نوعیت میں بڑی زبردست تبدیلی رونما ہو گئی۔ خالص نظری علم اور مُردہ لاشوں کے بجائے اب ہمارا واسطہ زندہ انسانوں سے پڑنے لگا۔ پہلے اگر التہابی کیفیت، رسولی اور پھوڑوں وغیرہ کے مخصوص جراثیم سے بحث تھی تو اب زخم، پھوڑے اور رسولیاں عالم واقعہ میں ہمارے سامنے آنے لگیں۔ مریضوں اور لنگڑے لولوں اور بیمار انسانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگا۔ یہاں ہسپتال میں معمولی قسم کے مریض داخل نہیں کیے جاتے۔ یہاں تو جو بھی آتا کوئی نہ کوئی الجھا ہوا مرض لیے آتا اور خطرے سے خالی نہ ہوتا۔ مریضوں کے اس سیلاب اور ان کی طرح طرح کی تکلیفوں کو دیکھ کر تو میرے ہاتھ پیر بھی ٹھنڈے ہونے لگے اور انسانیت کی اس کثیر تعداد کو مبتلائے مرض دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا گویا انسان کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ مبتلائے امراض رہے!

کالج میں مریضوں کے دیکھنے اور ڈاکٹروں کی پیشی میں نسخہ نویسی کا سلسلہ شروع کرنے کے کچھ ہی روز بعد ایک مالی جو مرض کزاز میں مبتلا تھا، سینئر طلبا کے وارڈ میں لایا گیا۔ ہم سب اسے دیکھنے کے لیے گئے۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مریض نہایت مضبوط اور چوڑے چکلے ہاڑ کا آدمی تھا، اس کے چہرے کا رنگ دھوپ میں کام کرنے کی وجہ سے گندمی ہو چلا تھا، وہ پسینوں میں نہایا ہوا تھا، اور میز پر چت لیٹا ہوا تھا اس حال میں کہ شدت تکلیف سے اس کے ہونٹ ٹیڑھے ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھیں نہایت بیچارگی کے عالم میں اس توقع پر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں کہ اب طبی امداد اسے ملنے والی ہے۔ ذرا سا بھی شور ہوتا — بازار میں ٹرام کی گھنٹی بجتی یا دروازے بند کرنے کی آواز ہوتی — مریض تشنج کی وجہ سے دہرا ہونے لگتا اور اس کا جبڑا بند ہو کر دانت سے دانت ٹکرانے لگتے۔ اس کی پیٹھ کے عضلات میں اتنی دیر تک تشنج کی کیفیت رہتی کہ اس کے تناؤ سے اس کا جسم بستر سے اٹھ جاتا اور سر کے پسینہ سے جو تکیہ پر چھپا پڑ گیا تھا، نظر آنے لگتا۔ بیان یہ کیا جاتا تھا کہ پندرہ روز پہلے وہ بالکل اچھا تھا۔ یہ تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ایسا مضبوط و توانا آدمی اتنے جلد ایسا سخت بیمار ہو جائے گا۔ پندرہ روز پہلے حسب معمول

وہ ترکاریوں کی کیاری میں ننگے پاؤں کام کر رہا تھا کہ ایک لکڑی کی باریک سی چھپٹی اس کی ایڑی میں چبھ گئی۔ اس وقت نہ اس نے اس معمولی سی بات کو کچھ اہمیت دی اور نہ یہ بات اہمیت دینے کی تھی، اس کی زندگی میں ایک دفعہ نہیں، متعدد بار ایسی صورت پیش آچکی تھی۔ مگر ولئے قسمت کہ اس مرتبہ ایک معمولی سی لکڑی کی چھپٹی ہی نے کام کر دیا اور وہ موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا ہو گیا۔

میں مرض کی خوفناکی سے اتنا متاثر نہیں تھا، جتنا اس بات سے کہ کتنی آسانی اور معمولی سی بات سے اس قدر خطرناک مرض لاحق ہو سکتے ہیں۔ مجھے جس نے سب سے زیادہ پریشان کیا، وہ یہی چیز تھی کہ تندرست سے تندرست انسان کے لیے ایسے خوفناک ترین امراض کے خلاف کوئی گارنٹی نہیں۔ گویا کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کل یا شام تک اسے کزاز نہیں ہو سکتا۔ بھلا بتائیے آج سے پندرہ روز پہلے جو شخص بھی اسے دیکھتا اس کی صحت اور جسم پر رشک کرتا، اور کون کہہ سکتا تھا کہ وہ کزاز میں مبتلا ہو کر ہسپتال میں داخل ہوگا

اسی طرح ایک لمبا تڑنگا نوجوان شخص جو ہمارے کے اصطبل کا محافظ تھا ایک حادثہ سے دو چار ہوا اور عمر بھر کے لیے اپاہج ہو کر رہ گیا۔ وہ بے چارہ ایک روز اپنے اصطبل کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ اس طرح گرا کہ اس کی پشت کھیل (Cattle Trough) سے ٹکرائی چھ سال سے وہ ہمارے ہسپتال میں تھا۔ اس کی ٹانگ اب بھی بے جان تنکے کی طرح لٹکتی تھی۔ وہ اسے اپنے ارادہ سے ہلا جلا بھی نہیں سکتا۔ لیٹے ہی لیٹے اس کا پیشاب پاخانہ خطا ہو جاتا تھا اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ بچوں کی طرح اسے گود میں اٹھا کر ضروریات سے فارغ کراتے تھے، ورنہ وہ تو ہمیشہ پلنگ پر لیٹا رہتا تھا، یہاں تک کہ اس کی کمر میں پھوڑے ہو گئے اور وہ مرنے کے قریب ہو گیا .... ایک گورنمنٹ کلرک عرق النساء کی شدید تکلیف سے پاگل ہو کر پروفیسر اور ہم سب معائنہ کرنے والے طلباء کو دیکھ کر چلّایا:۔

"ارے عطائیوں! کس کی راہ دیکھ رہے ہو، میرا کام تم ہی کیوں نہیں تمام کر دیتے۔ مجھے مار ڈالو۔ بس تمہارا سب سے بڑا احسان مجھ پر یہی ہوگا"

ہر لمحہ اور ہر قدم پر ہمیں بیماری کے خطرات سے خبردار کیا جاتا ہے، اور لطف یہ ہے کہ یہ خطرات اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ مجھے تو ان سے بچ کر نکلنے کی کوشش کرنا بھی بے سود ہی معلوم ہوتا ہے۔ جس وقت ہمیں بالکل صحت مند سمجھا جاتا ہے، اس وقت بھی ہمارا اندرون، سکون کی حالت میں نہیں ہوتا۔ کھانے پینے اور سانس لینے کی حالت میں لاکھوں اور کروڑوں جراثیم ہمارے جسم کے اندر داخل ہوتے رہتے ہیں اور نہایت مہلک قسم کی سمیت ہمارے جسم کی فیکٹری میں ہمہ وقت تیار ہوتی رہتی ہے اور ہماری اندرونی قوتیں ان زہریلے مادوں اور ان کے نقصان رساں اثرات کے خلاف پیہم برسرپیکار رہتی ہیں۔ ایسی صورت میں نہیں کہا جاسکتا کہ کس وقت ہماری اندرونی قوتیں اس لگاتار کشمکش سے درماندہ ہو کر جواب دے بیٹھیں، اور ایک معمولی سی خراش دیکھتے دیکھتے سرخ بادہ بن جائے یا ایک

ہلکی سی کھرینچ سرطان کی صورت اختیار کر جائے اور معمولی نزلہ و بخار چند ہی دن میں بڑھ کر تپ دق کا بڑھا ہوا درجہ پیش کرنے لگے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے حالات کو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہو کہ بیماری کو محض ایک "اتفاقی چیز" بنانے کے لیے غیر معمولی قسم کے آئیڈیل حالات پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت جیسے کچھ حالات ہیں انھیں دیکھتے ہوئے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہو کہ ہر شخص کسی نہ کسی سبب سے مرضی حالت میں مبتلا ہو۔ غریب لوگ افلاس اور احتیاج کی وجہ سے۔ رئیس لوگ ضرورت سے زائد ہونے کی وجہ سے۔ مزدور اس لیے کہ انھیں اپنی جسمانی قوت سے کہیں زیادہ کام کرنا پڑتا ہو اور کاہل الوجود اس لیے کہ وہ بے کار پڑے رہتے ہیں بے پرواہ لوگ اس لیے کہ وہ غفلت اور بے پروائی سے کام لیتے ہیں۔ اور محتاط اس لیے کہ وہ بہت زیادہ احتیاط کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ انسانیت کو جس پہلو سے آپ دیکھیں گے وہ مبتلائے امراض و آلام ہی نظر آئے گی۔

بگاڑ اور زوال انسان کی سرشت میں شروع ہی سے موجود ہو۔ اس کا جسم اپنے پورے نشو و نما اور بالیدگی کو پہنچنے سے قبل ہی خراب ہونا شروع ہو جاتا ہو۔ باسٹن (Boston) میں چار ہزار طلبا، کے دانتوں کا معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ دس سال سے اوپر کی عمر کے بچوں کے بلا استثنیٰ دانت خراب ہیں۔ باویریا (Bavaria) میں پرائمری اسکول کے پانچسو لڑکوں کا معائنہ کیا گیا تو مشکل سے تین بچوں کے دانت سالم نکلے۔ ڈاکٹر بیبس (Dr Babss) کو سو بچوں کی لاشیں چیرنے کا اتفاق ہوا، موصوف کا بیان ہو کہ ان میں سے بہتّر کے قصبی غدد میں دق کے جراثیم موجود تھے۔ حالانکہ ان سب بچوں کی موت دق کی وجہ سے لاحق نہیں ہوئی تھی۔ بچپن ہی سے ہمیں مزمن قسم کا نزلہ ہو جاتا ہو۔۔ ہم جیبی رومال کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک تن درست آدمی کے لیے جیبی رومال ایک قطعی غیر ضروری سی چیز ہو۔ میرے اس بیان پر بہت سے لوگ تعجب کریں گے کہ اچھا ایسے بھی لوگ دنیا میں ہو سکتے ہیں جنھیں جیبی رومال کی سرے سے ضرورت ہی پیش نہ آئے

مختصر یہ کہ اس طبی مطالعہ کی بدولت میں نے اپنے گرد و پیش جدھر بھی نظر دوڑائی مجھے تندرستی ایک نادر اور کم یاب شے نظر آئی۔ ہر شخص کو کسی نہ کسی مرض میں مبتلا دیکھا اور دنیا مجھے ایک بہت بڑا بیمارستان دکھائی دینے لگی۔ گویا یہاں نارمل آدمی وہی تھا جو بیمار تھا اور اگر کہیں کوئی تن درست آدمی موجود تھا تو وہ اعجوبۂ روزگار اور غیر فطری چیز سے کم نہ تھا جسے خرقِ عادت اور معمول سے انحراف ہی کیا جا سکتا تھا۔ میں نے جس وقت دایہ گیری کا مطالعہ شروع کیا اور اس سے متعلق جو کتابیں نصاب تعلیم میں تھیں انھیں دیکھنا شروع کیا تو میری دل چسپی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بچہ جننے اور زچگی کی پوری تصویر میرے سامنے آگئی۔ مجھے زچگی کا ایک کیس بھی یاد ہو، میں بھی اس وقت موجود تھا، اس واقعے کو برسوں گزر گئے مگر ایسا معلوم ہوتا ہو جیسے کل ہی ہوا ہو۔

"بیگم صاحبہ برداشت کیجیے۔ غل مچانے سے تو اور تکلیف میں اضافہ ہوگا" اسسٹنٹ ہاؤس سرجن نے نہایت نرمی کے ساتھ تسلی دیتے ہوئے کہا۔ رات بری طرح گزری۔ درد زہ نے عورت کو آپے سے بے آپے کر دیا تھا۔ اس کی آہ و بکا سے سارا وارڈ گونج اٹھا تھا، وہ رو رہی تھی،

اور ازالۂ تکلیف کے لیے اپنی مٹھیوں کو نہایت زور سے بھینچ رہی تھی۔ایک مرتبہ تو درد کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔اور شدتِ کرب اور تکلیف سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔اس نے ڈاکٹر کے گاؤن کا پلہ پکڑ کر نہایت ملتجیانہ انداز سے کہا:

"ڈاکٹر کیا میں نہیں بچنے کی۔اس وقت مجھے تو کوئی آس نہیں معلوم ہوتی۔ایسی تکلیف تو مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی"

صبح کے وقت گھبرایا اور سہما ہوا اس کا خاوند ہسپتال میں آیا اور اس نے ڈاکٹر سے اپنی بیوی کی کیفیت دریافت کی۔میرے دل میں اسے دیکھ کر نفرت اور غصہ کے جذبات سے ملی جلی ایک کیفیت پیدا ہوئی کہ دیکھو یہ اس کا دوسرا بچہ تھا، اس کو معلوم تھا کہ اس کی بیوی کو شدید تکلیف ہوگی، مگر پھر بھی یہ آرام سے گھر بیٹھا رہا۔

"آپ کی اہلیہ کا زچگی کیس معمولی نوعیت کا تھا" سرجن نے کہا "گھبرانے کی کوئی بات ہی نہیں تھی"

عجیب! رات کو اتنی شدید جانکنی کی سی تکلیف اس عورت کو ہوئی۔مگر یہاں یہ بھی نارمل تھا۔اتنا مہذب اور تعلیم یافتہ ہو جانے کے بعد بھی زچگی کے معاملہ میں ہم اب بھی ایسے ہی تھے جیسے سو، دو سو سال پہلے۔یہ اور اسی قسم کے تاثرات نے میری رُوح کو دبا لیا تھا اور میں اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کو ایک عجیب قسم کی افسردگی کے ساتھ دیکھنے لگا تھا۔

ان ہی دنوں میں ایک رات ایک بھیانک خواب سے میری آنکھ کھل گئی۔میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک تنگ گلی کو پار کر رہا تھا کہ ایک گاڑی کا بم میرے سینے میں لگا، میں زمین پر گرا اور وہ گاڑی مجھ پر سے گزر گئی۔آنکھ کھلتے ہی میں بستر پر بیٹھ گیا۔تاریک رات مجھے کھڑکی میں سے گھور رہی تھی الماری کے پیچھے سے جھینگر کی زیں زیں رات کے بھیانک پن میں کچھ اضافہ ہی کر رہی تھی۔گھر میں کسی گوشے سے صاحبِ خانہ کے بیمار بچے کے رونے کی آواز بھی آ رہی تھی۔بیمار بچے کی آواز سنائی دیتا تھا کہ میرے ذہن میں بیمار انسانیت کا وہ تصور جو ان دنوں میرے دماغ میں پھر رہا تھا، پورے زور شور کے ساتھ مجھ پر پھر مسلط ہو گیا۔دنیا کی بے ثباتی اور انسان کا بیرونی دُنیا کے حوادث سے غیر محفوظ ہونا ایک حقیقت معلوم ہونے لگی۔انسانی صحت کی حقیقت کچے دھاگے سے بھی زیادہ کمزور دکھائی دینے لگی۔کاش صحت مند ہونا ہمارے اپنے ہاتھ میں ہوتا بغیر صحت کے انسان غلام سے بھی بدتر ہے اس لیے کہ جب گرد و پیش کی ساری چیزیں آپ کی صحت کو تباہ کرنے کی فکر میں ہیں تو آپ آزاد ہی کہاں ہوئے! قدرت کی سب سے بڑی نعمت صحت ہی ہے، مگر اس کا حاصل ہو جانا اور قائم رکھنا نہایت ہی دشوار ہے۔

اگر ہم اپنی صحت حاصل کرنے اور اسے قائم کرنے میں اپنی پوری زندگی بھی لگا دیں، تب بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بیماری ہمیں کب آ لے۔اس صورت میں ہماری احتیاطی اور حفاظتی تدابیر سے کیا فائدہ ہوگا؟ ہمیں ابھی تک بھی نہیں معلوم کہ سرطان اور اسی قسم کے بہت سے عصبی اور جلدی عوارض کے لاحق ہونے کے اسباب کیا ہیں۔پھر آپ ہی بتائیے کہ ہم اپنے آپ کو بچائیں گے کس چیز سے؟

اس کا قطعی امکان ہے کہ آج سے سال بھر بعد آپ مجھے ایک ایسے عارضہ میں مبتلا پائیں جس میں سارے بدن پر چھالے سے پڑ جاتے ہیں اور جب وہ پھوٹتے ہیں تو ساری کھال اتر جاتی ہے اور نئی جلد نکل آتی ہے۔ جس کے بعد آپ کو بیٹھے چین آتا ہے نہ لیٹے۔ اور جسم اس قدر نازک اور حساس ہو جاتا ہے کہ کسی چیز کا مس بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس بیماری کو لیجے جو مریض ہمارے ہسپتال میں داخل ہوا تھا، ایسے یہاں آنے سے ۶ ماہ قبل میں نے بالکل تن درست و توانا دیکھا تھا بتایئے پھر ہماری زندگی اور صحت کی کیا گارنٹی ہے؟ جدھر نظر ڈالو تکلیف ہی تکلیف ہے۔ شاید دنیا میں انسانی زندگی کا اصل تکلیف ہی ہے۔

یہ تھا خلاصہ میرے خیالات کا خواب سے بیدار ہونے کے بعد! کچھ زیادہ مدت نہیں گزری کہ ذاتی طور پر مجھے خود بھی اپنے ان خیالات کا تجربہ ہو گیا۔ ایک معمولی سا حقیر دانہ میری بغل میں ہوا اور بلا کسی ظاہری وجہ کے بڑھ کر اچھی خاصی تکلیف دینے لگا۔ ابھی چار دن پہلے وہ مٹر کے دانے سے بھی چھوٹا تھا، مگر اب دیکھا تو حیرت انگیز طریق پر بڑھ کر اخروٹ کے برابر ہو گیا اور اس میں شدید قسم کی تکلیف ہونے لگی۔ میں گھبرا کر اپنے سرجری کے پروفیسر کو اس طرح ڈرتے ڈرتے دکھانے گیا جیسے کوئی جلاد کے پاس جاتا ہے۔

"پروفیسر صاحب میرا خیال ہے میری بغل میں دنبل لحمی ہو گیا ہے" میں نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔

پروفیسر نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا "کیا تم تھرڈ ایئر میں پڑھتے ہو اور میڈیکل طالب علم ہو؟"

"جی ہاں"

"مجھے اپنا دنبل لحمی دکھاؤ"

میں نے اپنی قمیص اتاری اور دکھایا۔ ڈاکٹر نے قینچی سے اس کی گٹھلی نکال دی اور اسے صاف کر دیا۔

"معمولی سے دانے کو تمہاری آستین کے کپڑے نے جو بار بار چھوا تو اس میں سوزش ہوئی اور وہ بڑھ گیا۔ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اپنا دنبل لحمی اپنے ساتھ ہی لے جاؤ" اس نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا اور ایک چھوٹی سی گوشت کی گولی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ اگرچہ میڈیکل طالب علم ہونے کی وجہ سے مجھے اپنے ا- خوف و ہراس پر بڑی شرم سی آئی۔ تھوڑے عرصہ بعد میں نے پھر محسوس کیا کہ میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ اب میری طبیعت میں سستی پیدا ہو رہی ہے اور کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ میری بھوک جاتی رہی ہے اور پیاس زیادہ لگتی ہے۔ نیز میرا وزن کم ہونے لگا ہے اور میرے جسم کے مختلف حصوں پر پھوڑے پھنسیوں کا زور ہو گیا ہے۔ پیشاب بہت زیادہ آنے لگا۔ میں نے پیشاب کا امتحان کرایا تو شکر تو نہیں نکلی، مگر دوسری علامتوں سے ذیابیطس سادہ کا شبہ ضرور ہوتا تھا۔ نہایت افسردگی کے عالم میں میں نے اپنے نصاب میں ذیابیطس پر جو باب تھا، اس کا مطالعہ کیا اس میں لکھا تھا:

"ذیابیطس سادہ کے اسباب کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا ——— بعض مریض جوان ہوتے ہیں اور بعض ادھیڑ عمر کے، عورتوں کی نسبت مردوں کو یہ مرض زیادہ ہوتا ہے ——— ذیابیطس سادہ اور ذیابیطس شکری کا باہمی تعلق بالکل واضح ہے،

اکثر پہلے سادہ ہوتی ہو اور پھر وہ شکری میں بدل جاتی ہو............ ..... یہ بیماری
برسوں رہتی ہو، اور اس سے بہت ہی کم صحت نصیب ہوتی ہو........"

میں گھبرا کر اپنے علم الامراض کے پروفیسر صاحب کے پاس گیا۔ میں نے ان سے اپنے خیال اور وہم کا تو اظہار کیا نہیں، البتہ اپنی علامات تفصیل کے ساتھ سنا دیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ سنتے جاتے تھے اور ان کی پیشانی پر شکنیں پڑتی جا رہی تھیں۔ آخر انھوں نے میرا قطع کلام کر کے کہا:-

"تمھارا خیال ہو کہ تمھیں ذیابیطس سادہ ہو؟ بہت خوب! میں اس کی تمھیں داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تم نے اپنی کتاب میں سے ذیابیطس سادہ کی تمام علامتوں کو خوب ازبر کیا ہو اور ایک علامت بھی نہیں چھوڑی ہو۔ خدا کرے کہ امتحان دیتے وقت بھی اگر اس مرض پر کچھ دریافت کیا جائے تو تمھیں ایسا ہی یاد نکلے جیسا کہ اس وقت ہو۔ یہ کہہ کر پروفیسر صاحب مسکرائے اور مجھ سے کہا "بے وقوف کہیں کے! اگر اسی طرح کتابیں پڑھ پڑھ کر ہر مرض کی علامتیں اپنے اندر پیدا کرتے رہے تو بس میڈیسن کا مطالعہ تو تم نے کر لیا!" پھر حسبِ ذیل ہدایتیں دے کر مجھے رخصت کر دیا۔

"سگریٹ نوشی کم کرو، خوب کھاؤ، اور خوب ہی ورزش کرو اور ذیابیطس کا وہم اپنے دل سے نکال دو، سمجھ گئے نا؟ جاؤ تمھیں کوئی مرض نہیں ہو۔" (باقی آئندہ)

ہماری غذائیں

تازہ غذائیں .... ڈبّوں میں بند غذائیں ...... منجمد غذائیں !

جب غذا کو ضائع ہونے یا بچانے یا ایک فصل سے دوسری فصل تک ان کی فراہمی، یا انھیں دوسرے ممالک تک بھیجنے کا خیال ہوا تو ہر طرح کی غذائیں ڈبّوں میں بند کی جانے لگیں۔ آج دنیا کے بازار ایسی غذاؤں سے بھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن کچھ دنوں سے نازک یا خراب ہو جانے والی غذائی اشیاء کو "فوری تبرید" (Quick Freezing) کے ذریعہ سے منجمد کر دینے کا طریقہ مغربی ممالک میں اور بالخصوص امریکا میں رائج ہے۔ اس کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس طرح سے منجمد کی ہوئی غذائیں ایک لامحدود یا کم از کم غیر معمولی مدت تک صحیح اور بہترین تغذیہ بخش حالت میں رہتی ہیں اور آئندہ کام آنے کی حیثیت سے قحط یا غذائی کمی کا مسئلہ بھی بڑی حد تک حل کرتی ہیں۔ اب امریکا میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ "فوری تبرید" کے ذریعہ منجمد و محفوظ کی ہوئی غذائیں کس حد تک تازہ غذاؤں اور ٹین کے ڈبّوں میں بند کی ہوئی غذاؤں کا بدل ثابت ہو سکتی ہیں۔ گزشتہ جنگ کے دوران میں چونکہ غذاؤں کو ان کی پیداوار کے مرکزوں سے بڑے بڑے فاصلوں پر بھیجنا پڑتا تھا اور استعمال سے پہلے ان پر کافی مدتیں گزر جاتی تھیں۔ اس لیے "فوری انجماد" کے طریقے کو بڑی ترقی دی گئی تھی۔ اس دلچسپ موضوع پر ولایاتِ متحدہ امریکا کے "سپلائی کورز" کے افسر لفٹنٹ مارٹن ہلبی نے بحث کی ہے، اور خریدار یعنی استعمال کرنے والے کے نقطۂ نگاہ سے سبزی، مچھلی اور گوشت جیسی غذاؤں کی تینوں قسموں یعنی تازہ ڈبّوں میں بند، اور منجمد صورتوں پر مفید معلومات پیش کی ہیں۔ انگلستان میں بھی غذاؤں کو منجمد کرنے کی ترقی کے لیے اسکیمیں تیزی سے تیار ہو رہی ہیں، اور بہت جلد دنیا کے دوسرے متمدن ممالک بھی آئندہ قحطوں یا غذائی کمی کے مسئلوں کو حل کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کریں گے۔ اب اس مقالے کو اس کے مصنف لفٹنٹ مارٹن ہلبی کی زبانی سنیے :-

---

"فوری تبرید" کے آلات کے ذریعہ منجمد اور محفوظ کی ہوئی غذاؤں کی مانگ یقیناً بڑھتی جائے گی بالخصوص وہ غذائیں جو جلد خراب ہونے والی ہیں ان کو منجمد کر کے بہت دنوں تک کام میں لایا جا سکتا ہے بہ شرطیکہ ان کے ساتھ ساتھ برودت بھی موجود رہے یا انھیں بارد ماحول میں رکھا جائے۔ لیکن تازہ یا بند ڈبّوں کے بجائے منجمد صورت میں سبزی، گوشت یا مچھلی کی مانگ بازاروں میں کتنی ہوگی، یہ امر موقوف ہے اُن فائدوں پر جو خریدار کو اپنی مطلوبہ چیز سے حاصل ہوگا۔ اس لیے ہمیں خریدار ہی کے نقطۂ نگاہ سے اس مسئلے کو دیکھنا پڑے گا۔ صرف علمی بحث کہ یہ ہو سکتا ہے اور وہ ہو سکتا ہے اس سلسلے میں بے سود

ہوگی۔ کچھ دور ہوتے منجمد گوشت کو خریداروں کی ضرورت کے مطابق مخصوص سائز کے بکسوں میں فروخت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن مندرجۂ ذیل اسباب کی بنا پر کامیابی نہ ہوئی۔

(۱) عام کاروباری درماندگی سے پیدا ہونے والے عناصر اس تجرباتی جدوجہد پر اثر انداز ہوئے اور یہ کام بند کر دیا گیا۔ مثلاً سنہ ۱۹۳۰ء کو اگر بنیادی سال مان لیا جائے، تو اس سال کے اندر اور آئندہ برسوں میں منجمد گوشت کی فروخت کا تناسب یہ ہوگا:۔

سنہ ۱۹۳۰ء	۱۰۰	سنہ ۱۹۳۱ء	۱۱۱،۱
" ۱۹۳۲ء	۳۰،۲	" ۱۹۳۳ء	۱۳،۲
" ۱۹۳۴ء	۱۲،۳	" ۱۹۳۵ء	۹،۴
" ۱۹۳۶ء	۷،۳		

الغرض امریکا کی مشہور عام کساد بازاری میں اس چیز کی مانگ روز بروز گھٹتی چلی گئی، اور تجارتی حیثیت سے یہ جدوجہد ترک کر دی گئی۔

(۲) یہ بات صاف طور پر ثابت نہیں کی جا سکی کہ "منجمد گوشت" کے ٹکڑوں کو بکسوں کے سائز میں خریدنے سے خریدار کو پیسے کی بچت بھی ہوتی ہے۔ مزید برآں خریدار کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ تازہ گوشت اور منجمد گوشت میں نسبتی فرق کیا ہے، اور صحت کے اعتبار سے گوشت کی اصل صفت کیا ہونی چاہیے۔

(۳) منجمد گوشت کی تجارت اور تقسیم کو ایسے وسیع پیمانے تک نہیں پہنچایا گیا کہ "فوری انجماد" کے عمل اور اس کو لپیٹنے، اور بکسوں میں رکھنے، اور مستقل برودت پہنچاتے رہنے اور دوسرے ابتدائی اخراجات اور اس کی قیمت فروخت میں توازن پیدا ہو جاتا۔

(۴) بیچنے والوں اور خریداروں میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ تازہ گوشت کے مقابلے میں منجمد گوشت کو تیار کرنے اور پکانے کے صحیح اور مناسب طریقے کیا ہیں۔

(۵) پیکنگ کے مرکزوں میں، باربرداری کی گاڑیوں اور ٹھیلوں میں، تقسیم کرنے والی شاخوں میں، فروخت کرنے والی دوکانوں میں، اور خریداروں کے گھروں میں اس منجمد گوشت کو صحیح حالت میں رکھنے کا انتظام مکمل نہ تھا۔ یہ گوشت بھی تازہ گوشت بیچنے والے اشخاص یا دوکانداروں کے ذریعہ فروخت کیا جاتا تھا، اور وہ منجمد گوشت کے بکسوں کو بھی تازہ گوشت کے بڑے بکسوں میں رکھ دیا کرتے تھے۔

(۶) تازہ گوشت کاٹنے والے قصابوں نے اور بیچنے والے دوکانداروں نے اسے اپنی تجارت کے لیے خطرہ محسوس کیا، اس لیے انھوں نے عدم تعاون بلکہ در پردہ مخالفت سے کام لینا شروع کیا۔ ان کی ایک مخصوص ترکیب یہ تھی کہ گاہکوں کو دکھانے سے پہلے منجمد گوشت کے ٹکڑوں کو کچھ نرم حرارت پہنچا دیتے تھے، اس لیے ان کی انجمادی خوبیوں میں نقص آجاتا تھا۔

اب سبزی، گوشت، اور مچھلی کی تینوں غذائی قسموں یعنی تازہ، ڈبوں میں بند اور منجمد صورتوں

کے درمیان خریدار کے نقطۂ نگاہ سے تشریحی مقابلہ کیا جاتا ہے۔

سبزیاں

کس اعتبار سے	تازہ	ڈبوں میں بند	منجمد	کیفیت
(۱) صفت اور حالت	جلد خراب ہو جاتی ہیں اور سڑ جاتی ہیں اور اس اعتبار سے بڑھیا اور گھٹیا، سب قسمیں برابر ہیں۔	عمل میں کنٹرول کیا جاتا ہے اور صفتوں کی نگرانی کی جاتی ہے	جب بہترین حالت میں ہوتی ہیں تو تیزی سے منجمد کر دی جاتی ہیں، اور اس وقت سے پکانے کے وقت تک اسی حالت میں رہتی ہیں	صفت اور گریڈ اور مارکہ کے اعتبار سے تقسیم ہوتی ہیں اور صفائی کی گارنٹی ہوتی ہے۔
(۲) موسم سے تعلق	اکثر سبزیوں کا تعلق صرف موسم ہی سے نہیں ہوتا بلکہ مخصوص علاقوں سے بھی ہوتا ہے۔	کوئی موسم نہیں۔ جو قسم ڈبوں میں بند کر دی جاتی ہے وہ ہر موسم میں دستیاب ہوتی ہے۔	کوئی موسم نہیں جب منجمد کر دی جاتی ہے تو ہمیشہ ملتی ہے۔	
(۳) قیمت	موسم میں سستی اور دوسرے وقتوں میں اگر مل جائے تو بے حد مہنگی۔	موسم کے زمانے میں بند کی جاتی ہے۔ ٹرانسپورٹ اور اسٹور کا خرچ کم ہے کم قیمت یکساں رہتی ہے۔	قیمت کا تناسب قائم نہیں ہے لیکن مقابلتاً تازہ سبزی کے لگ بھگ ہوتا ہے۔	تیاری پیکنگ اور تبرید کے اخراجات موجود ہوتے ہیں۔ اس کو رکھنے کا خرچ ڈبوں میں بند سبزیوں سے زیادہ ہے۔
(۴) ظاہری شکل و صورت	رنگ اور شکل ناپائیدار ایک حالت پر نہیں رکھی جا سکتی۔	دونوں چیزیں مستقل مگر صورت اور رنگ پکائی ہوئی سبزیوں جیسا	تازگی، رنگ، ساخت اور شکل باقی رہتی ہے۔	
(۵) ذائقہ	موسم میں بیحد خوشگوار اگر صحیح وقت پر کھائی جائے۔ بعد میں ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔	پکائی ہوئی، امتیازی ذائقہ و رائحہ۔	عمدہ ذائقہ اور رائحہ تازہ جیسا	ڈبوں میں بند، سبزیوں سے بہتر۔
(۶) غذائی قدر۔	وقت گزرنے سے کچھ حیاتین ضائع ہو جاتے ہیں۔	پکانے پر حیاتین اکثر پانی میں نکل کر ضائع ہو جاتے ہیں۔	غالباً اس اعتبار سے یہ بہتر حالت ہے۔	
(۷) دوسرے عناصر	تجارتی ٹرانسپورٹ میں خراب ہو جاتی ہیں اسلیے باقی حصہ خریدار کو مہنگا پڑتا ہے۔	ٹرانسپورٹ وغیرہ میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔	ٹرانسپورٹ وغیرہ میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔	

مچھلی

کس اعتبار سے	تازہ	ڈبوں میں بند	منجمد	کیفیت
(۱) صفت اور حالت	تیزی سے خراب ہوتی اور سڑتی ہے۔	کنٹرول اور نگرانی ہوتی ہے۔	کنٹرول اور نگرانی۔ جب تک حرارت نہ پہنچے ہمیشہ تازہ رہتی ہے	گرڈ اور قسم کی نگرانی ہوتی ہے۔
(۲) موسم سے تعلق	مختلف قسموں کا تعلق خاص موسموں سے اور دریاؤں سے ہے کبھی دست یاب ہونا مشکل ہوتا ہے۔	کوئی موسم نہیں۔ ہمیشہ اور ہر قسم کی مل سکتی ہے اگر باصول طریقہ پر ڈبوں میں بند کی جائے۔	کوئی موسم نہیں ہمیشہ مل سکتی ہے۔	موسم میں بڑی مقدار میں منجمد کی جاسکتی ہے تاکہ آئندہ دستیاب ہوسکے۔
(۳) قیمت	موسم کے درمیانی حصہ میں سستی ابتدائی اور آخری حصے میں مہنگی۔ علاقوں کے اعتبار سے کہیں سستی کہیں مہنگی۔	متوازن اور برابر ٹرانسپورٹ اور رکھنے کا خرچ بہت کم۔	متوازن اور سستی	
(۴) ظاہری شکل و صورت	تیزی سے خراب ہوتی ہے۔	پکائی ہوئی اور صاف کی ہوئی اور پائیدار	دل کش اور پسندیدہ	
(۵) ذائقہ	موسم میں بہت اچھا اگر جلد استعمال کیجائے	تازہ جیسا لذیذ اور دلکش نہیں ہوتا۔	ہمیشہ تازہ جیسا اور بعض اعتبار سے بہتر	
(۶) غذائی قدر	قدرتی اور اچھی	کچھ حیاتین ضائع ہوجاتے ہیں۔	تازہ جیسا اور کبھی بہتر۔	
(۷) پکانے کی تیاری	خاص حالت میں ملتی ہے تیاری اور پکانے کا کام محنت طلب ہے۔	کوئی کوشش نہیں یا بہت کم محنت	تازہ مچھلی کی طرح	
(۸) دوسرے عناصر	موسم میں بھی ہر علاقہ میں نہیں ملتی تیزی سے خراب ہونے کے باعث قیمت بہت بڑھ جاتی ہے [illegible]	ٹرانسپورٹ اور فروخت میں آسانی	ٹرانسپورٹ اور فروخت میں آسانی۔ کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی	منجمد مچھلی خریدار کو ہر موسم میں ہر جگہ بھی جاسکتی ہے تازہ پر قابل ترجیح ہوتی ہے۔ ڈبوں میں بند مچھلی سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ یہ بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔

گوشت

کس اعتبار سے	تازہ	منجمد	کیفیت
(۱) صفت اور حالت	قدرتی۔ لیکن وقت گزرنے سے بوسیدگی۔	کنٹرول اور نگرانی اقسام کا تعین۔ صفائی وصحت بخشی	تازہ گوشت سے مقابلہ آسان ہے۔
(۲) موسم سے تعلق	جانوروں کی قسموں کے اعتبار سے کچھ تعلق ہے۔	کوئی موسم نہیں۔ ہمیشہ دست یاب	
(۳) قیمت	موسم، اقسام اور مقامات کے اعتبار سے بدلتی ہے۔ مگر یہ تبدیلی محدود ہوتی ہے۔	توازن قائم نہیں ہوا ہے۔ تیر پیداوار۔ پیکنگ کے اخراجات اگر زیادہ ہیں تو ٹرانسپورٹ کے اخراجات کی کمی سے توازن پیدا کیا جا سکتا ہے جانوروں کے گوشت کے علاوہ دوسری چیزوں کو بھی اچھی قیمت پر بیچا جا سکتا ہے۔	
(۴) شکل وصورت	قدرتی۔ مگر بوسیدگی کے ساتھ خراب ہوتی ہے۔	تازگی قائم رہتی ہے۔ سطحی رنگ میں کسی قدر تبدیلی ہوتی ہے۔	پیکنگ سے دلکشی پیدا ہوتی ہے۔
(۵) ذائقہ۔	پکانے پر بہت اچھا اور پائدار ہوتا ہے لیکن باسی ہونے پر لذت میں کمی ہوتی ہے۔	پکانے پر تازہ جیسا۔	
(۶) غذائی قدر	معلوم	لامعلوم	
(۷) پکانے کی تیاری	مشہور طریقے جن کا رواج موجود ہے۔	پکانے سے پہلے بذریعہ حرارت نرم کرنا پڑتا ہے۔ اور نرم آنچ پر پکانے میں بھی مہارت چاہیے۔	
(۸) دوسرے عناصر	خوردہ فروشی کی لاگت زیادہ ہوتی ہے۔	خوردہ فروشی کی لاگت .... کم کی جا سکتی ہے۔	

مذکورہ بالا تفصیلات سے خراب ہونے والی غذاؤں کی مختلف حیثیتیں، ان کی حالت، قیمت، شکل وصورت ذائقہ اور تغذیہ وغیرہ کے اعتبار سے ظاہر ہیں۔ پھلوں کا شمار بھی سبزیوں میں ہے، مگر معلوم ہونا چاہیے کہ تمام پھل اور سبزیاں ایسی نہیں ہیں جو ڈبوں میں بند کی جا سکیں۔ یہ بھی ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ موسموں کے بہترین حصہ میں جبکہ تازہ چیزیں کثرت سے ملتی ہیں، لوگ ڈبوں میں بند، یا منجمد غذاؤں کو بڑی مقدار میں خریدیں گے لیکن کوئی موسم دیرپا نہیں ہوتا، اور ان طریقوں سے کاروباری مفاد کے علاوہ بہت بڑا غذائی اور اقتصادی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

سرکہ اور ہماری جسمانی تعمیر

سرکہ مشرق میں زمانۂ قدیم سے نہ صرف دسترخوان کی زینت ہے اور ایک مفید صحت بخش اور ہاضم غذا کی حیثیت سے اسے استعمال کیا جاتا ہے، بلکہ مشرقی طب میں بھی سرکے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کی دوائی اور معالجاتی خاصیتوں کو قابل قدر سمجھا گیا ہے۔ یونانی اور ویدک طب میں سرکے سے چند مرکبات بھی تیار کیے جاتے ہیں سکنجبین (سگ انگبین۔ سک = سرکہ۔ انگبین = شہد) اس کی ایک معمولی سی مثال ہے۔

لیکن مغرب میں بہت دنوں تک سرکہ کو ایک غذائی شے کی حیثیت سے غیر مفید اور نامقبول سمجھا جاتا تھا لیکن اب جاکر یہ بات اہل مغرب کی سمجھ میں آئی ہے کہ جو کچھ مشرق کو زمانہ قدیم سے معلوم تھا اس میں ایک بڑی حقیقت پنہاں تھی۔ اگرچہ ان کو جدید آلات اور لیبوریٹریوں کی سہولتیں حاصل نہ تھیں تاہم ان کا وسیع مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ خود ایک ایسی عظیم الشان لیبوریٹری کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو ان پر تمام حقیقتیں واضح کر دیتا تھا۔ ایک سرکہ ہی پر کیا منحصر ہے، کسی بھی دوا کے خواص اور استعمالات اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ باستثنائے چند کوئی مثال ایسی پیش نہیں کی جاسکتی کہ اطبائے قدیم نے جو کچھ کسی دوا کے بارے میں بیان کر دیا ہو طب جدید اُس سے آج انکار کر سکے۔ عناب کے جو افعال وخواص اور استعمالات زمانہ قدیم میں تھے جدید تحقیقات کے بعد آج بھی وہی ہیں۔ طبّ جدید نے ادویہ کے بارے میں جو مفید کام کیا ہے وہ کسی ایک دوا کے اجزا معلوم کرنا ہے۔ جدید تحقیقات کی روشنی میں اب یہ بتایا جاسکتا ہے کہ عناب کا فلاں فلاں جز کھانسی کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔ لیکن طب جدید یہ نہیں کہ سکتی کہ عناب کھانسی کے لیے مفید ہی نہیں ہے۔ اطبائے قدیم نے جملہ ادویہ کے جو افعال وخواص اور استعمالات بتا دیے ہیں طب جدید باوجود ترقی کے ان کی تغلیط نہیں کر سکتی اور انھیں صحیح تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

مغربی سائنس دانوں نے اب یہ دریافت کر کے کہ ہمارے جسم کے کیمیائی افعال میں سرکہ انتہائی قدر وقیمت رکھتا ہے، گویا اہل مشرق کی طبی قابلیتوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ ان ماہرین سائنس کا بیان ہے کہ زیادہ پیچیدہ اور ناقابل تجزیہ جسمانی اجزا کی تعمیر میں سرکہ ایک ضروری بلکہ بنیادی اینٹ کا کام کرتا ہے۔ یہ بھی معلوم کیا گیا ہے کہ سرکہ وہ مخصوص شے ہے جس کو ہمارا جسم خطرناک کیمیائی اجزا کو سمیت سے پاک کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ وہ زہریلے اجزا ہیں جو یا تو جسم کے اندر پیدا ہوتے ہیں یا بیرونی دواؤں یا غذاؤں سے وجود میں آتے ہیں۔

پچھلے دنوں امریکا کی چار یونیورسٹیوں میں بالکل الگ الگ اور آزادانہ طور پر سرکے کے متعلق ریسرچ کر کے یہ معلوم کیا گیا ہے کہ جسم کے اندر سرکہ کون سی خدمت انجام دیتا ہے اور تعمیری کاموں میں کیا پارٹ ادا کرتا ہے۔ اس ریسرچ کے سلسلے میں سائنس دانوں نے "پچھلے دار" یا "دنبالہ دار" ذرات

(Tagged Atoms) کو استعمال کیا ہے۔ یہ ذرات کاربن کے بھاری ضات ہوتے ہیں۔ اور اس عجیب صورت میں بہت کم دست یاب ہوتے ہیں۔ کاربن کے اس ذرہ کا "جوہری وزن" (Atomic Weight) ۱۳ ہوتا ہے۔ معمولی قسم کے کاربنی ذرہ کا جوہری وزن صرف ۱۲ ہوتا ہے۔

مندرجۂ بالا قسم کے کاربنی ذرات کو کیمیائی حامضین یا فلینی تیزاب (Arcetic Acid) بنانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ سرکہ در اصل پانی میں حامضین کا کیمیائی محلول ہے۔ جب دُنبالہ دار کاربنی ذرات کے ذریعہ کیمیائی "ایسٹک ایسڈ" یعنی کیمیائی طریقوں سے بنایا ہوا حامضین تیار ہو گیا تو اسے "تجرباتی جانوروں" کو استعمال کرایا گیا۔ اس کے بعد ان کے جسم کی نسیجوں کے معائنہ سے یہ معلوم کیا گیا کہ دنبالہ دار ذرات کہاں کہاں پہنچے اور کس طرح کام میں لائے گئے۔

اس سے پتہ لگا کہ ایسٹک ایسڈ جسم میں بڑی اہم ذہری خدمات انجام دیتا ہے (۱) روغنی اور شکری اجزا سے جو ارجی برآمد ہوتی ہے اور جس کام کے لائق بناتی ہے اس میں پوری مدد کرتا ہے۔ (۲) جسم کے اندر چربی، اور گلوکوز، اور امینوایسڈ، اور خون کے وہ سرخ ذرات جو جسم کے لیے آکسیجن فراہم کرتے ہیں ان کی تعمیر میں اس کا بڑا امدادی ہاتھ پایا جاتا ہے۔

"امریکن کیمیکل سوسائٹی" کے ایک جلسہ میں یہ اہم نئی دریافتیں پیش کی گئی ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی کے شعبہ کیمیا کے پروفیسر ڈاکٹر کے۔ای۔ بلاک نے کہا ہے کہ "پچھلے دنوں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جسم کے عمل استحالہ میں ایسٹک ایسڈ یعنی سرکہ ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مادہ حیوانی نسیجوں میں بھی چربی کے آکسیجن آمیز ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ جسم میں ایسٹک ایسڈ بنتا ہے یا داخل ہوتا ہے تو اس سے مختلف قسموں کے ردِ عمل پیدا ہوتے ہیں۔ معمولی حالات میں اس کا ایک حصہ خون کے ذریعہ گردوں اور عضلات میں داخل ہوتا ہے اور وہاں پہنچ کر ارجی کی برآمد کے ساتھ ساتھ مکمل طور پر آکسیجن آمیز ہو جاتا ہے۔ کچھ حصہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ نسیجوں کی تعمیر میں کاربنی ذرات بہم پہنچانے والے ذریعہ کا کام کرتا ہے۔

مینسوٹا یونیورسٹی میڈیکل اسکول کے تین ڈاکٹروں نے "تجرباتی جانوروں" کو جب سرکے کا تیزاب دیا تو بعد میں اس کے بھاری کاربنی ذرات اس "گلائی کوجن" (Glycogen) میں پائے گئے جس کا ذخیرہ ان کے جسم میں جمع ہو گیا تھا۔ "گلائی کوجن" ایک "حیوانی نشاستہ" ہے جو سادہ ترشکر یعنی گلوکوز کے بہت سے ذرات یا "سالمات" (Moicenles) سے تعمیر ہوتا ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر ڈیوڈ گرین نے ان تخمیری مادوں (Enzymes) کی سرگرمیوں کا مطالعہ کر کے جو پیچیدہ اور مرکب کیمیائی اجزا کو بناتے اور توڑتے رہتے ہیں، یہ پتہ لگایا ہے کہ جسم کے اندر "ایسٹک ایسڈ" کونسا راستہ اختیار کرتا ہے اور کیا اثر پیدا کرتا ہے۔ انھوں نے معلوم کر لیا ہے کہ قلب و گردے کی نسیجوں سے ایک ایسا تخمیری مادہ پیدا ہوتا ہے جو اس تیزاب سے مل کر اس کے جزو بدن بننے میں مدد دیتا ہے

طب یونانی کا یہ دعوےٰ تھا کہ سرکہ جسم سے سمیتوں کو خارج کرتا ہے، کس طرح دُور کرتا ہے؟ اس کی تفصیل امریکن "بائو کیمیکل ریسرچ لیبوریٹری" کے ڈاکٹر الف۔ لیپ مین نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

جب اجنبی مادے یا دوائیں وغیرہ جسم میں داخل ہوتی ہیں تو سرکے کا تیزاب اپنے ردعمل کے ذریعہ ان کو زہریت سے پاک کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ سمی مادہ کو ایک دوسرے سالمہ سے ملا کر ایک نیا مرکب تیار کر دیتا ہے۔ جو ان کی مضرت رسانی کو ختم کر دیتا ہے اور زیادہ آسانی سے انھیں فضلہ کے ساتھ خارج کر دیتا ہے۔" الغرض سرکے کی صحت بخش اور معالجاتی خوبیوں کو مغربی اطبا نے اب تسلیم کر لیا ہے اور انھیں اپنی تحقیقات کے بعد یہ ماننا پڑا ہے کہ ہمارے جسم کی تعمیر میں سرکے کے تیزاب کو بڑا دخل ہے۔

یہ تو سب کچھ ہوا، لیکن سرکہ کے ایک دوا کی حیثیت سے جو استعمالات طب یونانی پیش کرتی ہے اطبا ء جدید اس کی اہمیت سے ہنوز نابلد ہیں۔ جسمانی تعمیر کے لیے تو اب وہ اسے استعمال کریں گے، کیونکہ امریکا سے "وحی نازل" ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے طبی استعمال پر اس وقت تک غور نہیں کریں گے جب تک فرنگ سے کسی تحقیق کی اطلاع نہ آجائے۔ یہی تو ہے وہ تعصب جو علاج امراض میں طرح طرح سے رکاوٹ بن رہا ہے اور جس کی بنا پر طب جدید اکثر و بیشتر حالات میں صحیح معالجہ سے ہٹ جاتی ہے۔

(ادارہ)

زیکوسلوواکیہ میں کیمیائی صنعتوں کی دوسالہ اسکیم

(ج۔ ایف۔ جے قدوس۔ ایم اے۔ ایم۔ ایس سی)

اشتراکیت کے خیال نے جب سے روس سے نکل کر دوسرے ممالک میں پرورش پائی ہے آپ سنتے ہوں گے کہ بہت سے ممالک میں صنعتوں کو "سرکاری ملکیت" بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چوں کہ جدید جمہوری حکومت بالعموم قومی حکومت یعنی عوام کی حکومت ہوتی ہے، اس لیے اس عمل کو "قومی بنانا" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بڑی بڑی انفرادی یا شخصی صنعتی تجارتی جد و جہد (Private Enterprise) کا خاتمہ کر دیا جائے جو سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ مگر دنیا ابھی اس سلسلہ میں کسی متفقہ نتیجہ پر نہیں پہنچی ہے اور یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکا ہے کہ کسی قوم کی انتہائی ترقی صرف "اشتراکیت" سے ہو سکتی ہے یا لوگوں کی پرائیویٹ یعنی انفرادی اور ذاتی سرگرمیوں سے یورپ کے ممالک میں زیکوسلوواکیہ اگرچہ چھوٹا سا ملک ہے مگر صنعتی ترقی کی راہ میں بہت دنوں سے پیش پیش ہے۔ اور گزشتہ جنگ سے پہلے زیکوسلوواکیہ کی بہت سی مصنوعات ہندستان میں فروخت ہوتی تھیں، ان میں تام چینی کے برتن، شیشے کے ظروف اور شیشے کی چوڑیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہندستان میں چوڑیاں عورتوں کے "سہاگ" کی علامت سمجھی جاتی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ زیکوسلوواکیہ سے زیادہ حسین چوڑیاں کسی ملک نے ہندستان میں پیش نہیں کی تھیں اسی طرح کی دوسری چیزیں بھی اس ملک میں بہت مقبول تھیں۔ جوتوں کی مشہور باٹا کمپنی زیکوسلوواکیہ ہی کی فروغ ہوئی ہے گزشتہ جنگ میں اس ملک کی صنعتیں درماندہ ہو کر رہ گئی تھیں اب یہ پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس وقت اس کی صنعتوں کا ۶۲ فی صدی حصہ "سرکاری" (State Owned) ہو چکا ہے، اور اقتصادی بحالی و ترقی کے لیے اس نے "نیشنلائزیشن" کی ایک دو سالہ اسکیم بنائی ہے جس پر جوش و خروش سے عمل کیا جا رہا ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ملک نے کوئی نیا سرمایہ نہیں لگایا ہے، بلکہ اپنی موجودہ صلاحیتوں کو پوری مقدار میں استعمال کر کے "زیکوں" یعنی زیکوسلوواکیہ کے باشندوں کو یہ امید ہے کہ صرف دو سال میں وہ اپنی صنعتوں کی پیداوار کو سنہ ۳۶ کی سطح تک پہنچا دیں گے اس مضمون میں کیمیائی صنعتوں کی ترقی کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے جو زیکوسلوواکیہ کی دو سالہ اسکیم کا ایک اہم جزو ہے۔

"زیک" قوم اپنے ساتھ کیمیائی صنعتوں کی ایک قدیم تاریخ رکھتی ہے۔ اس ملک میں بوہیمیا کے مقام پر ایک صدی پہلے تیزاب، شورہ، پھٹکری، اور چند دوسرے قسم کے نمک وغیرہ تیار کیے جاتے تھے اور

کیلینی جوف میں جو پرانے کارخانے ہیں، اگرچہ ان کی شکل اتنی بدل گئی ہو کہ ان کے ابتدائی رنگ و روپ پہچانے نہیں جاتے، تاہم ان میں اب تک کیمیائی اجزا اور بالخصوص نامی (Organic) تیزاب اور ان کے نمک تیار کیے جاتے ہیں۔ زیکوسلوواکیہ میں بھاری کیمیائی چیزوں کی صنعتیں بھی موجود تھیں اور ان کو ترقی دینے کے لیے یہ صنعتیں رفتہ رفتہ دریائے آلبی (Elbe) کے ساحلوں پر منتقل کر دی گئی تھیں تاکہ درآمد و برآمد میں آسانیاں ہوں۔ گزشتہ جنگ سے پہلے ان مقامات پر "زیک کیمیکل یونین" بڑی مقداروں میں ہر قسم کے بھاری تیزاب، القلی، نمک، پرمنگانیٹ، اور کلورائڈ وغیرہ تیار کرتی تھی۔ علاوہ برایں سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک زیکوسلوواکیہ نے رنگ، ادویہ اور فوٹوگرافی کے کیمیائی اجزا کی مانگ پوری کرنے کے لیے "ہلکی اور لطیف" کیمیائی صنعتوں میں بھی بڑی ترقی کی۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں جب اس ملک کی سرحدوں کی دوبارہ تشکیل ہوئی، اور اس کے بعد جب جرمنوں نے جنگ میں اس پر قبضہ کر لیا تو زیکوسلوواکیہ کی کیمیائی صنعتوں پر زبردست ضربیں لگیں، مثلاً ۳۸ء میں اس کی صابن سازی اور القلی سازی کی صنعتیں ضائع ہو گئیں، اور بعد میں شمالی مغربی بوہیمیا اور موراویا کے تمام شہروں میں جرمنی نے اس کی کیمیائی اور فلزاتی صنعتوں پر قبضہ کر لیا، لیکن اس کمی کو پورا کرنے کے لیے "زیک کیمیکل یونین" نے رینتوی میں ایک بڑا کیمیا ساز کارخانہ قائم کرنا چاہا جس کے پہلو میں دوا سازی کے اور آتش گیر مادوں کے بنانے کے کارخانے پہلے سے موجود تھے۔ لیکن جنگ کے ختم تک اس کارخانے کی تعمیر مکمل نہ ہو سکی، اس لیے قبضہ کرنے والے جرمنوں کو اس سے کوئی فائدہ بھی نہ پہنچ سکا۔ بہرحال سنہ ۱۹۴۴ء میں اس کارخانے میں رنگ اور فوٹوگرافی کے اجزا وغیرہ پوری مقدار میں تیار ہونے شروع ہو گئے۔

جنگ کے ختم تک یہ حال ہوا کہ زیکوسلوواکیہ کے اکثر کیمیا ساز کارخانوں کی مشینریں یا ختم ہو گئیں یا ان کو شدید نقصان پہنچا یا ان کے لیے خام اشیا کی فراہمی ناممکن ہو گئی۔ بہت سی "زیک" صنعتیں اسی طرح تباہ ہو گئیں اور ان کی ازسرِ نو بحالی اور تعمیر کے لیے ملک کی اقتصادی پالیسی میں دو اہم تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ ایک یہ کہ تمام کارخانے جن میں ۲۰۰ سے زیادہ آدمی کام کرتے تھے اور وہ چھوٹے کارخانے جو دشمنوں کے ہاتھوں میں چلے گئے تھے ان سب کو "سرکاری" بنا دیا گیا۔ اور جو بنیادی صنعتیں تھیں جن کو "اہم صنعتیں" کہتے ہیں۔ مثلاً کان کنی، لوہے اور فولاد اور بجلی کی صنعتیں وغیرہ وہ سب کی سب کلیتہً "نیشنلائز" کر دی گئیں۔ اس طرح کیمیائی صنعتوں میں جتنے آدمی کام کرتے تھے ان کی ۴۷ فی صدی تعداد سرکاری کارخانوں میں کام کرنے لگی۔

دو سالہ اسکیم

دوسری بنیادی تبدیلی یہ تھی کہ صنعتی ترقی کی ایک دو سالہ اسکیم جاری کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ پیداوار کو ترقی دے کر سنہ ۱۹۴۷ء کی سطح کے ۱۱۰ فی صدی تک پہنچا دیا جائے۔ اب اس جد و جہد سے جو مفید نتیجے حاصل کیے گئے ان کے ابتدائی چھ ماہ کے اعداد و شمار دست یاب ہو گئے ہیں۔ اس مدت میں

کیمیائی اشیار کی تیاری میں مندرجۂ ذیل ترقی رونما ہوئی ہے:-

نام	پیداوار	فی صدی ترقی
فاسفیٹ کی کھاد	۱۷۵،۱۷۴ ٹن	۸۴
نائٹروجن کی کھاد	۶۵،۱۰۱ "	۹۹
گندھک کا تیزاب	۹۰،۹۰۵ "	۹۸
سوڈیم القلی	۴۲،۱۳۴ "	۱۰۱
سیلولوز	۱۱۵،۰۰۰ "	۱۰۶
کیلسیم آکسائڈ	۳۰۰،۰۰۰ "	۱۰۷
الکحل	۷،۹۷۹،۱۸۰ گیلن	۷۰

کیمیائی صنعتوں کی اس ترقی کو صحیح نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے لیے یہ ضرور ہے کہ ان کے متعلقہ مسائل معلوم کیے جائیں: "زیک" کارخانوں کو اپنی بعض ضرورتوں کے لیے خام اشیار مثلاً گندھک وغیرہ باہر سے درآمد کرنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف متعدد خام اشیار ملک کے اندر ہی پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً لگنائٹ (لکڑی کی ساخت رکھنے والا بھورے رنگ کا کوئلہ) پتھر کا کوئلہ، کچی دھاتیں، کاؤلین (سفید چکنی مٹی)، میگنیسائٹ، گریفائٹ، پیٹ (دلدل کا کوئلہ) قیرانی یورینیم آکسائڈ وغیرہ۔ چونکہ زیکوسلوواکیہ کی نمک کی کانیں جو سلاٹنگ ڈولی میں تھیں روس نے لے لی ہیں۔ اس لیے اول الذکر کو اس سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ روس سے زیکوسلوواکیہ کو خام لوہا بڑی مقدار میں ملے گا۔ اس سے اس کی بعض بڑی مشکلات حل ہو جائیں گی۔ اس دوسالہ اسکیم میں کیمیائی صنعتوں کی ترقی کا حصہ کتنا ہے، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ ابتدائی چھ ماہ میں مندرجۂ ذیل چیزیں درآمد کی گئی ہیں:-

معدنی تیل- ۱۰۶۰۱٫۸۰ ٹن صاف شدہ تیل کی پیداوار- ۳۲۱،۱۴ ٹن

فاسفیٹ والے پتھر- ۱۲٫۷۲۹ ٹن نمک- ۸،۳۲۸ ٹن - روغن والے بیج- ۲٫۸۶۶ ٹن

اس کے علاوہ وہ تمام کیمیائی اشیار ہیں جن کی درآمدی قیمت ۴۷،۰۰۰ پونڈ ہے — اور ۲۵،۰۰۰ پونڈ کے مختلف رنگ ہیں جو باہر سے حاصل کیے گئے ہیں۔ ابتدائی چھ ماہ کے اندر جن غیر ممالک سے چیزیں آئی ہیں ان کے نام اور چیزوں کی قیمت یہ ہے۔ انگلستان سے ۳،۵۰۰،۰۰۰ پونڈ۔ روس سے ۲،۱۳۴،۰۰۰ پونڈ۔ امریکا سے ۹،۰۶۶،۲۵۵ پونڈ۔ اسی طرح زیکوسلوواکیہ نے ان ممالک کو مندرجۂ ذیل رقموں کی چیزیں سپلائی کی ہیں:-

انگلستان کو ۷،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ۔ روس کو ۳،۳۰۰،۲۴۰ پونڈ۔

امریکا کو ۳،۱۷۶،۷۳۰ پونڈ۔

ایسے حسین رخسار
جن سے خون ٹپکتا معلوم ہو



شربت اکسیر خاص (رجسٹرڈ) سے بن سکتے ہیں
تندرست اور جوان رہنا آپ کا فرض ہے

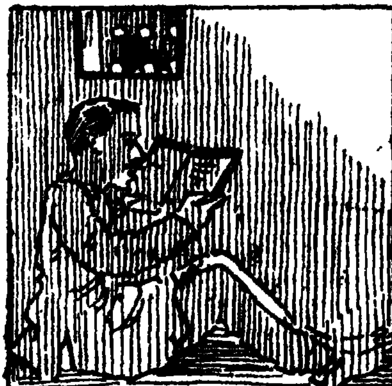
ہمدرد دواخانہ، دہلی

مُطالعہ
کے متعلق بعض عام غلطیاں





بہت نزدیک سے پڑھنا!



ناکافی روشنی میں پڑھنا



کم روشنی کے لیمپ یا چراغ میں پڑھنا



رات کو پڑھنا



بند کمرہ میں پڑھنا جس میں روشنی اور ہوا نہ ہو



زیادہ پڑھنا

آپ بیتی!

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

ہمدرد صحت کی گزشتہ اشاعت میں حکیم اقبال حسین صاحب کی آپ بیتی کا پہلا حصّہ شائع ہو چکا ہے۔ اب وہ بھوالی سینی ٹوریم پہنچ گئے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ سینی ٹوریم میں کس طرح گزری۔ سینی ٹوریم کے انتظامات پر تنقید و تبصرہ، وہاں کے رہن سہن کے قاعدے اور طریقے دل چسپ ہیں اور لائق مطالعہ۔ آپ بیتی کا سلسلہ ان خطوط سے قائم رکھا گیا ہے جو حکیم صاحب موصوف نے مدیر ہمدرد صحت کو بھوالی سینی ٹوریم سے لکھے۔ (ہمدرد صحت)

پہلا خط

بھوالی سینی ٹوریم۔
بی کلاس۔ کمرہ ملا

مورخہ ۲۱ر جولائی ۱۹۴۶ء

میاں سعید۔ السلام علیکم۔

کل ہفتہ کے دن ۲۰ر جولائی سنہ ۱۹۴۶ء کو بیں بخیر و عافیت ۲ بجے دن کو بھوالی سینی ٹوریم کے دروازہ پر پہنچ گیا۔ یہاں مجھے کچھ زیادہ دقت نہیں اٹھانی پڑی۔ موٹر سے اترا ہی تھا کہ ایک قلی لپکا اور مجھ سے پوچھا "کیا آپ سینی ٹوریم میں داخل ہونے آئے ہیں؟" میں نے ہاں میں جواب دیا اور بتایا کہ میرے لیے بی کلاس، وارڈ نمبر ۲ میں کمرہ نمبر ۶ مخصوص ہے۔ مجھے اس نے وہیں ایک کیبن میں جہاں دو تین بنچیں بچھی تھیں، بٹھا دیا اور میرا پرچہ قاضی شجاع الحسن صدیقی کے نام لے گیا۔ پندرہ منٹ بعد واپس آیا اور مجھے ڈانڈی میں بٹھا کر اور میرا سامان کو قلیوں پر لدوا کر میری جائے قیام پہلے گیا میرا ملازم حاجی جو میرے ہمراہ پیدل چلا۔ یہاں پہاڑوں پر ڈانڈی ایک کشتی نما سواری ہوتی ہے جس کے دونوں طرف ڈولی کی طرح ڈنڈے ہوتے ہیں اور جنھیں قلی اپنے کاندھوں پر رکھ کر ڈولی..... اور فینس کی طرح چلتے ہیں۔

پہاڑی علاقوں میں جہاں رکشا نہیں چل سکتا، وہاں ڈانڈی ہی سے کام لیا جاتا ہے سینی ٹوریم کے دروازہ سے میرے کمرے تک چڑھائی ہی چڑھائی ہے۔ میں تو پھر بیمار تھا۔ میں سمجھتا ہوں دروازہ سے بی وارڈ تک پہنچتے پہنچتے تن درست سے تن درست آدمی کا حلیہ بگڑ جاتا ہوگا۔ بی وارڈ پر پہنچا تو قاضی شجاع الحسن صاحب صدیقی کو اپنے انتظار میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ بیچاروں نے میرے دلی سے روانہ ہونے کا تار وصول ہوتے ہی میرے کمرے کی ضروری صفائی ستھرائی خود اپنی نگرانی میں کرا دی تھی۔ میرے پہنچنے

ہی میرا بستر پلنگ پر لگوا کر مجھے آرام سے لٹا دیا، اور میرے مرض کی تفصیلات دریافت کرنے لگے۔ آج کل میں اور میرا ملازم انھی کے مہمان ہیں، اس لیے کہ ہمارا سامان جو ہم نے دہلی سے بُک کرا دیا تھا ابھی تک بھوالی نہیں پہنچا ہے۔

آج اتوار ہے، صبح آٹھ بجے کے قریب ایک کمپونڈر آیا اور اس نے مجھے ایک کتابچہ دیا جس کے سرورق پر انگریزی میں (Recovery Book) لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ اگر میں صحت نامہ کروں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ سرورق الٹا تو دیکھا کہ اگلے ورق پر اس میں سینی ٹوریم سے متعلق ضروری قواعد و ضوابط لکھے ہیں اور مریضوں کے آرام، ورزش، کھانے اور تفریح سے متعلق جملہ ہدایات لکھی ہیں۔ کچھ اور ورق کھولے تو اس میں حسب ذیل خانے بنے ہوئے دیکھے۔ ان پر مریض کو صبح، دوپہر، سہ پہر اور شام کا ٹمپریچر لکھنا پڑتا ہے۔ اور پیشاب، پاخانے کے متعلق بھی اندراجات کرنے پڑتے ہیں۔

وزن	تعداد اجابت			ٹمپریچر				نام مریض
	سہ پہر	دوپہر	صبح	شام	سہ پہر	دوپہر	صبح	تاریخ
۱۱۶ پونڈ	۱	–		۹۹	۹۸٫۶	–	–	۲۰ جولائی ۴۶ء
							۹۸	۲۱ " ۴۶ء

ہر روز صبح کمپاؤنڈر آکر تمام صاحب فراش مریضوں کے چارٹ کی تکمیل کرتا ہے۔ تاکہ ڈاکٹر راؤنڈ پر آئے تو اسے مریض کے ٹمپریچر اور اجابت کے متعلق صحیح صحیح معلومات حاصل ہو جائے۔ میں نے صحت نامہ کمپاؤنڈر سے لے کر اس میں ہفتہ کی سہ پہر سے اتوار کی صبح تک کا ٹمپریچر نوٹ کر دیا۔ جیسا کہ اوپر کھینچے ہوئے خانوں سے ظاہر ہے۔ اسی کے مطابق کمپاؤنڈر نے چارٹ میں ٹمپریچر اور تعداد اجابت وغیرہ نوٹ کر دیں اور چلا گیا۔ کوئی ½ ۸ بجے ایک دوسرا کمپاؤنڈر آیا، وہ اپنے ہمراہ تولنے کی مشین بھی لایا تھا۔ اس نے میرا وزن کیا تو ۱۱۶ پونڈ اترا۔ اس نے یہ وزن میرے چارٹ میں نوٹ کر دیا اور چلا گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں ہر اتوار کو وزن ہوتا ہے۔ چلنے پھرنے والے مریض دفتر جا کر مشین پر تلتے ہیں اور صاحب فراش مریضوں کے لیے ان کے کمروں پر مشین لے جا کر ان کا وزن کیا جاتا ہے۔

آج اتوار کو دس بجے خط لکھ رہا ہوں۔ اب تک تو کوئی ڈاکٹر راؤنڈ پر آیا نہیں۔ ممکن ہے اس کے بعد آئے۔

اچھا اجازت چاہتا ہوں کہ اب نہ کوئی بات ہی لکھنی باقی ہے اور نہ جسم ہی میں بیٹھنے کی طاقت ہے۔ ان شاء اللہ ڈاکٹری معائنہ اور ایکس رے وغیرہ ہو جانے کے بعد یہاں کی تشخیص کے متعلق تفصیلی خط لکھوں گا۔ خدا حافظ

اقبال

دُوسرا خط

کمرہ ۱۲ بی کلاس
بھوالی سینی ٹوریم
مورخہ ۲۸ جولائی سنہ ۴۷ء

میاں سعید السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

اب تک میں دو خط لکھ چکا ہوں، ان حالات میں جب کہ محکمہ ڈاک کے کارندوں کے ہڑتال کر دینے کی وجہ سے رسل ورسائل کا سلسلہ تقریباً منقطع ہو چکا ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خط آپ کو ملے یا نہیں۔ ایک خط میں عزیزی اعجاز حسین کے نام بھی ایک پرچہ لکھا تھا، اس میں مَیں نے انھیں تاکید کی تھی کہ اگر رسل و رسائل کا سلسلہ اسی طرح کچھ روز اور منقطع رہے تو تم روپے منی آرڈر کرنے کی فکر نہ کرنا، بلکہ یا تو خود لیکر آجا یا کسی معتبر آدمی کے ہاتھ مجھے بھیج دینا۔ اگر آپ کو میرا وہ خط نہیں ملا ہے تو بڑا ہرج ہو جائے گا۔ بہر حال اس خط کے موصول ہوتے ہی اعجاز کو بلا کر میرا پیغام پہنچا دیجیے، تاکہ مجھے رُپیہ بروقت پہنچ جائے۔ ویسے اس وقت میرے پاس ابھی سو رُپے ہیں، مگر جو رفتار یہاں خرچ کی ہے اسے دیکھتا ہوں تو یہ رقم ایک ہفتہ سے زیادہ کی نہیں معلوم ہوتی۔

دق کے مریضوں کے لیے بھوالی جتنا بہتر مقام ہے، افسوس ہے کہ اتنا بہتر یہاں کا انتظام نہیں ہے۔ ڈاکٹروں کا یہ حال ہے کہ مریض کے داخل ہونے کے آٹھ دن بعد تک اس کی خبر نہیں لیتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھوالی کی آب و ہوا پر بہت زیادہ تکیہ کیے بیٹھے ہیں۔ اور مریضوں کو قدرت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں، گویا مریضوں کا اصل معالج یہاں قدرت ہے، ڈاکٹر نہیں، کیا خوب ہے! کام قدرت کرے اور نام ان کا ہو جائے۔ یہی حال یہاں کے دودھ کے ٹھیکہ دار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے منتظمین نے اسے بھی یہ نکتہ سمجھا دیا ہے، چنانچہ اب وہ بھی حکمتِ عملی سے کام لیتا ہے اور دودھ کی چکنائی کو غیر ضروری سمجھ کر اس میں سے تمام کریم نکال کر سپلائی کرتا ہے کہ مریضوں کی تندرستی کے لیے جب محض آب و ہوا کافی ہے تو خالص دُودھ پلا کر بلا وجہ ایک غیر ضروری اور بے کار کام کیوں کیا جائے۔ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے ٹھیکہ دار کی اس حکمت عملی سے اتفاق نہیں۔ چنانچہ مجبور ہو کر میں نے چوری چھپواں ٹھیکیدار کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاں سے دُودھ منگوانے کا انتظام کیا ہے۔ چوری چھپواں کے الفاظ پر آپ نہ چونکیے، اور نہ اس پر پریشان ہوئیے کہ اس طرح تو مریض خالص دودھ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ دیکھیے کہ اتنے بڑے سینی ٹوریم میں ماشاء اللہ ڈسپلن کتنا اچھا ہے۔ یعنی دودھ اس ٹھیکہ دار کے علاوہ مریض کسی اور سے نہیں خرید سکتا۔!

چھ سات روز گزرنے کے بعد پرسوں مجھے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے طبّی معائنہ کے لیے اپنے دفتر بلایا تھا۔ پہلے نرس نے میری سابقہ ہسٹری ایک فارم پر لکھی، بلڈ پریشر لیا اور جب وہ ابتدائی کارروائی کر چکا تو بڑے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے، انھوں نے کئی مرتبہ اندر باہر سانس لینے کو کہا اور نائنٹی تھری نائنٹی تھری کہلوایا، اور سینہ کی بھی کئی بار ٹھونکا پیٹی کی، نبض کی رفتار نوٹ کی، ٹمپریچر لیا اور گلے کا بھی چ

طرح سے معائنہ کیا۔ غرض پندرہ بیس منٹ تک بڑے طمطراق سے دیکھا اور رخصت کر دیا۔ کل ایکس رے بھی ہوگیا اور بلغم اور پیشاب پاخانہ بھی خوردبینی امتحان اور تجزیہ کے لیے منگوا لیا گیا ہے۔ دیکھیے اس کا کیا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے کچھ بہت زیادہ فکر تو نہیں ہے کہ تشخیص مرض تو دہلی ہی میں ہو چکی ہے، مگر پھر بھی ایک چینک لگی ہوئی ہے کہ ان کے امتحانات اور معائنہ کے نتائج بھی جلد معلوم ہو جائیں تو اچھا ہے۔ اس غرض کے لیے میں نے اپنے کرم فرما صدیقی صاحب سے کہا ہے کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے ذرا جلدی معلوم کرا دیں۔ کیونکہ یہاں کے ڈاکٹر تو خیر سے کوئی کام عجلت اور تیزی سے کرنے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ اس معمولی سے کام میں بھی ہفتہ عشرہ تو لگا ہی دیں گے۔ امید ہے کہ آئندہ خط میں ان طبی امتحانات کے نتائج سے آپ سب کو بھی باخبر کر سکوں گا۔ آج وزن پھر لیا گیا تھا۔ وہی ۱۱۶ پونڈ نکلا جو گزشتہ ہفتہ تھا۔ لیکن میری جسمانی حالت پہلے سے بہت بہتر معلوم ہوتی ہے۔

وارڈ ملا۔ بی کلاس میں کل بارہ مریض ہیں اور اس میں سوائے دو تین مریضوں کے باقی تمام مریضوں کی حالت بہتر ہے۔ چار مریض تو چلنے پھرنے والے مریضوں میں شامل ہیں اور دو تین ایسے ہیں کہ ہفتہ عشرہ بعد انھیں بھی پیدل ہواخوری کی اجازت مل جائے گی۔ خیال تھا کہ خود مریض ہونے کے بعد اور یہاں سینی ٹوریم میں آجانے کے بعد میرا پیچھا کچھ عرصے کے لیے تو مریضوں سے چھوٹ جائے گا۔ مگر وائے قسمت کہ ایسا نہیں ہوا۔ کچھ لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں ہمدرد دواخانہ کی مجلس تشخیص و تجویز اور ادارۂ ہمدرد صحت سے متعلق ہوں تو باقاعدہ میرے پاس رجوع کرنے لگے۔ میں نے بیماری کی وجہ سے معذرت کی اور کہا کہ اگر میں دوائیں تجویز بھی کر دوں تو اس سے کچھ حاصل نہ ہو سکے گا جب تک ہمارے پاس دواؤں کا سٹاک نہ ہو۔ آٹھ روز کے اندر اندر مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ یہاں ڈاکٹر صاحبان مریضوں سے بے انتہا غفلت برتتے ہیں۔ نزلہ، زکام، اور پیٹ کی خرابیوں کا تو ان کے پاس کوئی علاج ہی نہیں ہے۔ اس لیے مجھے آپ خمیرہ نزلی جواہر والا، جوشاندہ کا نسخہ، نمک جالینوس، پیچ، ریشہ خطمی اور شربت انجبار وغیرہ بہت جلد بھجوا دیجیے تاکہ میرے پاس اگر کوئی شخص یہ شکایتیں لے کر آئے تو اسے مناسبِ حال دوائیں دے سکوں۔ دوائیں اتنی بھیجیے گا کہ ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے بہت سے مریضوں کو کافی ہوں۔

بڑے حکیم صاحب نے مجھ سے اگست کے پہلے ہفتہ میں یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا، ان سے دریافت کیجیے کہ اب کیا خیال ہے تاکہ ان کے لیے قصبہ میں کسی بہتر جگہ مکان کا بندوبست کراؤں میرا ملازم حاجی چچا بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے۔ بس ذرا آنکھوں سے معذور معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کمزوری کو وہ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ کل ان حضرت کو میز پر رکھا ہوا میرا تھرمامیٹر نظر نہیں آیا، میز جو صاف کی تو اس کے ساتھ اسے بھی صاف کر دیا۔ بھوالی سینی ٹوریم اور بھوالی قصبہ دق کے مریضوں کا گھر ہے، مگر حیرت ہے کہ یہاں تھرمامیٹر کا کال ہے۔ اگر دہلی میں زیل یا ہکس کا تھرمامیٹر ملے تو میرے لیے دو تین بھجوا دیجیے گا۔ بچوں کی وقتاً فوقتاً خود بھی دیکھ بھال کرتے رہیے اور ممتاز اور مولوی سجاد سے بھی کہہ دیجیے کہ وہ بھی مکان جاکر بچوں کا ہفتہ وار امتحان لیتے رہیں، تاکہ میری غیر موجودگی میں وہ پڑھنے لکھنے میں سستی نہ دکھائیں۔

آج میں نے آپ کا کافی وقت لے لیا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ

تیسرا خط

کمرہ ۳ بی کلاس
بھوالی سینی ٹوریم
مورخہ ۴ اگست سنہ ۴۷ء

میاں سعید السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

عنایت نامہ ملا۔ بے شک آپ نے دو خط لکھے ہوں گے، مگر ڈاک "ہڑتال" ہونے کی وجہ سے مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ اخبارات کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہڑتال بس ایک آدھ روز میں ختم ہی ہوا چاہتی ہے۔ خدا کرے بہت جلد کچھ ایسا تصفیہ ہو جائے کہ رسل و رسائل جیسی اہم سروس ان ہڑتالیوں کی زد میں پھر نہ آسکے۔

کل مجھے اپنے طبی امتحانات اور ایکس رے وغیرہ کے نتائج کا علم بھی ہو گیا۔ تشخیص تو وہی مکمل جو دہلی میں حکیم صاحب نے بغیر ایکسرے دیکھے کر دی تھی۔ یعنی ابھی تک دائیں پھیپھڑے کا بالائی حصہ متاثر ہوا ہے۔ بایاں پھیپھڑا بالکل صاف ہے۔ بخار بہت ہلکا ہے۔ شام تک ۹۹ درجہ تک ہوتا ہے۔ بارشیں خوب ہو رہی ہیں۔ مگر دہلی کی طرح کثرتِ بارش سے طبیعت گھبراتی نہیں کہ یہاں بارش کے فوراً بعد بھی کیچڑ نہیں ہوتی۔

آج صبح ۸ ۱/۲ بجے ڈاکٹر..... صاحب راؤنڈ پر آئے تھے ..... کا نام سن کر آپ انھیں عیسائی نہ سمجھیے گا۔ یہ لکھنو کی طرف سے رہنے والے کایستھ ہیں، ان کا پورا نام تو مجھے اس وقت یاد نہیں ..... غالباً ان کی گوت ہے۔ سنا ہے کہ یہ صاحب نہ صرف یہ کہ اپنی کج خلقی کی بدولت سارے سینی ٹوریم میں مشہور ہیں بلکہ ان کی کارروائی اور فنی مہارت بھی نہایت مشتبہ نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ ان ڈاکٹر صاحب نے آتے ہی میرا چارٹ دیکھا اور کوئی ایک منٹ بعد فرمایا کل آپ کے پاس ڈانڈی آئیگی اس میں بیٹھ کر میرے پاس دفتر میں آجائیے۔ کل آپ کی "اے پی" ہوگی۔ یہ سن کر میں بڑا گھبرایا، میں نے دریافت کیا "کیا میرے لیے علاج تجویز ہو گیا؟" "جی ہاں" ڈاکٹر صاحب نے ذرا کرختگی سے کہا۔ "کیا واقعی اے پی کی جائے گی، اور آپ کریں گے؟" میں نے مزید دریافت کیا، کہنے لگے "جی ہاں، میں ہی آپ کا معالج مقرر ہوا ہوں۔ آپ سے متعلق جو بھی علاج ہو گا، میں ہی کروں گا۔ دیکھیے آپ زیادہ باتیں نہ کیجیے۔ بس میری چٹ پہنچنے پر کل اے پی کے لیے دفتر میں آجائیے۔ یہ کہ کر وہ دوسرے کمرے کی طرف جانا چاہتے تھے کہ میں نے انھیں روکا اور کہا "ڈاکٹر صاحب میری جسارت کو معاف کیجیے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں میرے کیس میں اے پی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔" میری اس بات پر تو وہ کچھ چڑچڑا اُٹھے۔ کہنے لگے "آپ لوگ اے پی کو کیا جانیں" میں نے جواب دیا "کیوں نہیں جانتے، میں یونانی طبیب ہوں، اے پی، اور پھیپھڑے کو معطل کرنے کے جتنے بھی دوسرے رائج الوقت طریقے ہیں ان سب کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہوں۔ ان کے فوائد اور مضرات سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ اگر مجھے اے پی سے نقصان پہنچ گیا جس کا قوی امکان ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہو گا؟"

میری اس طویل تقریر بازی پر ڈاکٹر صاحب کچھ بھناسے گئے، مگر موقع شناسی سے کام

لے کر انھوں نے اس ساری بحث کو یہ کہہ کر لپیٹ دیا کہ "اچھا اگر آپ کو ہمارے تجویز کردہ علاج پر کچھ اعتراض ہو اور آپ اسے نہیں کرانا چاہتے تو مجھے اپنا تحریری انکار دے دیجیے، میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کو اسے دکھا دوں گا۔ تاکہ اس کے بعد تجویز کردہ علاج نہ کرنے کی مجھ پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہو"۔ میں نے کہا، بہت اچھا، میں کل کسی وقت آپ کو اس مضمون کی تحریر لکھ دوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے چلتے چلتے مجھ سے یہ بات کہی کہ حکیم صاحب جب آپ ہمارا تجویز کردہ علاج نہیں کرانا چاہتے تو آپ یہاں آئے کس واسطے ہیں کیا اس صورت میں آپ کا یہاں رہنا بے کار ثابت نہ ہوگا؟ اس کے جواب میں میں نے کہا: "ڈاکٹر صاحب آپ کے اس استفسار پر مجھے حیرت ہے۔ کیا آپ کے نزدیک تپ دق کا آخری اور حتمی علاج اے پی ہی ہے کہ وہ نہیں کراؤں گا تو میرا یہاں آنا ہی بے کار جائے گا۔ اور کیا یہاں سینی ٹوریم میں آپ سب مریضوں کو اے پی دیتے ہیں؟

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ یورپ اور امریکا میں اب اے پی متروک ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے فوائد کم اور نقصانات زیادہ ہونے کی وجہ سے، وہ لوگ اب اسے چھوڑتے جا رہے ہیں۔ دق کے علاج پر اب تک کی معلومات کا نچوڑ یہ ہے کہ دق کے مریضوں کو اگر پاک صاف ماحول، عمدہ آب و ہوا، دودھ، انڈے پھل اور اعلا درجہ کا گوشت میسر آجائے تو پھر کسی دوائی علاج کی سرے سے ضرورت ہی نہیں پڑتی اس صورت میں معالج کا کام بس یہ رہ جاتا ہے کہ وہ تاصحت مریض کی نگرانی کرتا رہے اور دورانِ علاج میں کوئی اُلجھن پیدا ہو جائے تو اسے دُور کرنے کی فکر کرے۔ اب اگر مجھے یہاں یہ سب چیزیں میسر آجاتی ہیں اور ان سے مجھے فائدہ بھی پہنچتا ہے تو پھر آپ ہی بتائیے کہ مجھے اے پی کی الجھن میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟" میری اس تقریر کو ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہی صبر سے سُنا اور مسکرا کر چل دیئے۔ اس لیے کہ اس کے بعد وہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔

آج اتوار کو وزن ہوا تو ۱ ½ پونڈ وزن میں بھی اضافہ ہوا۔ یہ خط کافی طویل ہو گیا ہے، میں اجازت چاہتا ہوں کہ اب میرے بازو اور جسم نے جواب دے دیا ہے اور کافی تھکن چڑھ گئی ہے، اچھا خدا حافظ

اقبال

(باقی دلچسپ حالات آئندہ)

YOUR PITUITARY GLAND

آپ کا غدہ نخامیہ



اسے قدرت نے بھیجے کے درمیان ہڈیوں کے ایک نہایت مختصر گہوارے میں محفوظ رکھا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق اس سے ۶ مختلف قسم کے کیمیائی اجزا کی تراوش ہوتی ہے۔ اسی لیے اسے شاہ غدد کہتے ہیں۔ یہ کیمیاوی جوہر جسم انسانی میں مختلف کام کرتے ہیں ایک ہڈیوں کی بالیدگی پر نظر رکھتا ہے اگر اس میں جوہر کی تراوش بند ہو جائے تو انسان بونا رہ جاتا ہے اور توالد و تناسل کی قوت باقی نہیں رہتی دوسرا جوہر انسانی غدود (سیکسوئل گلینڈس) پر نظر رکھتا ہے اور مردانہ قوت کو قائم رکھتا ہے، دوسرے جوہر خون کے دباؤ کو درست رکھتے ہیں



MAJON - SHABAB-AWAR

معجون شباب آور

غدہ نخامیہ کے ان افعال کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے خاص قسم کی دواؤں اور جوہروں سے اس میں وہ تاثیر پیدا کی گئی ہے کہ یہ اس غدہ کے افعال کو منظم رکھتا ہے۔ اسی لیے شباب آور تندرستی برقرار رکھتا ہے جسم کا نشوونما کرتا ہے۔ مردانہ قوت پیدا کر کے اسے بحال رکھتا ہے بعد شجاع بناتا ہے کمزور نہیں ہونے دیتا جنرل ٹانک ہے۔ ذرا سی سستی اور تھکن اس کا اشارہ ہے کہ اپنے جسم اور اعصاب کو شباب آور کی ضرورت ہے اس کا ہمیشہ خیال رکھیے۔ قیمت فی شیشی پانچ روپے (دصہ)

امراض اور علاج

کن پھیڑ

از حکیم اقبال حسین ایم اے۔

یہ بیماری عام طور پر بچوں کو ہوتی ہے۔ اصل میں یہ غدہ اصل الاذن (Parotid Gland) کے نزلہ زدہ ہونے سے پیدا ہوتی ہے، غلط تغذیہ سے بچوں کے خون میں جب سمیت زیادہ ہو جاتی ہیں، تو اس سمیت کو جسم انسانی میں جہاں جہاں غدد واقع ہوتے ہیں، وہ اپنے اندر جذب کرتے رہتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ اسے "جسم بدر" کرتے رہتے ہیں تاکہ ہماری بے احتیاطیوں یا دوسری وجوہ کی بنا پر جو سمی مادے ہمارے جسموں میں پیدا ہوتے ہیں، وہ خون سے علیحدہ و پاک ہوتے رہیں۔ اس اصول کے تحت غدہ اصل الاذن (کان کے پاس کا غدہ) جب نزلی رطوبات کی زیادتی سے متاثر ہو جاتا ہے اور بسا اوقات بڑھ کر لعاب دہن سے متعلق غدد تک کو متاثر کر دیتا ہے تو کن پھیڑ کی شکایت لاحق ہو جاتی ہے۔ عام طور پر یہ شکایت موسم بہار اور موسم خزاں میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس غدد کے التہاب سے ایک ایسی مثلث بنتی ہے، جس کا ایک زاویہ کان کے سامنے ہوتا ہے اور دوسرا جبڑے پر اور تیسرا کان کے پیچھے۔ کبھی ایک ہی جانب کا غدہ متاثر ہو کر رہ جاتا ہے اور کبھی دونوں طرف کے غدد ملتہب ہو جاتے ہیں۔ پہلے ایک کان کا غدہ متاثر ہوتا ہے، اس کے دو چار روز کے بعد دوسرے کان کا غدہ بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ اگر اس کا صحیح طریق پر علاج نہ کیا جائے اور ان غدد سے جذب شدہ سمی رطوبات کے اخراج کا خاطر خواہ بندوبست نہ کیا جائے تو کبھی کبھی یہ مرض خصیۃ الرحم اور خصیوں تک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور وہ بھی متورم ہو جاتے ہیں، مگر یہ صورتِ حال بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

علامات: لعابِ دہن کم ہو جاتا ہے، منہ خشک خشک رہنے لگتا ہے، منہ کھولنے، چبانے اور نگلنے میں تکلیف ہوتی ہے، خاص طور پر اس وقت جب آپ کچھ غذا کھائیں۔ گردن کے دوسرے غدد متاثر ہو جاتے ہیں اور ہلکا سا ٹمپریچر بھی ہو جاتا ہے۔ معمولی حالات میں یہ تکلیف ایک ہفتہ سے دو ہفتہ تک رہتی ہے۔ لیکن اگر غلط طریق پر علاج کیا جائے تو کافی دن تک آرام نہیں ہوتا۔

علاج: اس کا اصولی علاج تو یہ ہے کہ ٹھوس غذا بالکل بند کر دی جائے، اور مریض کو دو چار روز تک محض سنگترہ یا موسمی کا رس اور پانی پر رکھا جائے۔ اس سیال غذا کے دوران میں نیم گرم پانی کا انیما (حقنہ) روزانہ سوتے وقت دیا جاتا رہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ آنتوں میں جو سابقہ غذا کا فضلہ ایک عرصہ سے چپٹا ہوا تھا وہ خارج ہو جائے گا، اور مزید فضلہ آپ کی آنتوں میں ٹھیرنے نہیں پائے گا۔ اس طرح خون سمیت سے بہت جلد پاک ہو جائے گا۔ طبیعت خود بخود ان غدد سے جذب شدہ سمیت کو خارج کر کے انھیں اپنی اصل حالت پر لے آئے گی۔

بہرحال متاثر غدد کو گرم اور ٹھنڈے پانی سے ٹکور کرنا ازبس مفید ہے۔ ٹکور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے دو تین مرتبہ لگاتار متاثر حصے کی مناسبت سے سوتی کپڑا لے کر اسے گرم پانی میں بھگو اور نچوڑ کر متاثر غدد پر رکھا جائے۔ اس کے بعد محض ایک مرتبہ دوسرا کپڑا ٹھنڈے پانی میں بھگو اور نچوڑ کر رکھا جائے۔ گرم وسرد ٹکور کا یہ سلسلہ سارے دن ہر دو گھنٹے کے بعد دس دس منٹ تک کیا جاتا رہے گا۔ اس سے ان غدد کے التہاب میں تخفیف ہونے لگے گی۔ اس وقت بچے کو مونگ کی کھچڑی، ساگو دانہ وغیرہ دینا چاہیے اور دو تین روز کے بعد رفتہ رفتہ ٹھوس غذا پر ڈال دینا چاہیئے۔ یہ خیال بہرحال رکھنا چاہیے کہ غذا ہمیشہ کم اور زود ہضم دی جائے۔

اگرچہ پانچ روز میں غدد کی التہابی کیفیت میں آتنی کمی واقع نہ ہو جتنی کہ اس بلا دوا علاج سے ہونی چاہیے تھی تو اس صورت میں دوائی علاج سے فوراً مدد لینی چاہیے، اور لگانے اور پلانے کی دوائیں تین چار روز تک ضرور استعمال کرنی چاہییں۔ میں یہاں لگانے اور پلانے کی دواؤں کے ایسے نسخے لکھتا ہوں جو تقریباً ہر مریض کے لیے یکساں طور پر مفید ہوں گے۔

۱۔ نسخہ ضماد برائے بیرونی استعمال

گیرو	جدوار	مکو خشک	کالی زیری	مغز املتاس
۲ ماشہ	۳ ماشہ	۶ ماشے	۶ ماشے	۱ تولہ

ان سب دواؤں کو مکوہ سبز کے پانی میں پیس کر کن پھیڑوں پر لیپ کیا جائے۔

۲۔ نسخہ برائے اندرونی استعمال

شیرہ عناب	لعاب بہدانہ	شیرہ مغز کدو
۵ دانہ	۳ ماشے	۵ ماشے

پانی میں پیس کر چھان کر اس میں شربت نیلوفر ملا کر پلا دیا جائے۔

ان دواؤں کی ترتیب میں اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ نزلی رطوبتیں جسم میں نہ رہنے پائیں، اور ہمارے جسم میں ان کے اخراج کے لیے جو قدرتی راستے بنے ہوئے ہیں، ان کے ذریعے خارج ہو جائیں۔ ہمارے بتائے ہوئے طریق کے مطابق علاج کرنے سے نظامِ جسمانی بڑی حد تک دوسرے فاسد مادوں سے بھی پاک ہو جائے گا اور اس کے بعد کافی عرصے تک بچوں اور بڑوں کو دوسری بیماریوں سے بھی چھٹکارا مل جائے گا۔

افسانہ

پُراسرار پرند

حال ہی میں امریکا کے دو رُوحانیتین نے مجھ سے کہا کہ خلل دماغ کا سبب جسمانی عوارض تو ہوتے ہی ہیں لیکن عہدِ قدیم میں وہ لوگ جو یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کوئی رُوح جسم میں حلول کر جاتی ہے اور دماغ اور ہوش وحواس معطل کر دینے کا باعث بنتی ہے، جدید معلومات اور مشاہدات کی روشنی میں اس کی صحت سے انکار مشکل معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عقیدہ باطل نہیں ہے اور نہ مضحکہ خیز ہے۔ یہ اب سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا موضوع ہے۔ بالخصوص اس حالت میں کہ جب بعض معالجین نے "اخراج ارواح" کا عمل کیا ہے۔ اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔

میں تسخیر ارواح (Ghost Laying) کا عمل جانتا ہوں اور انگلستان میں اس کی وجہ سے مجھے کافی شہرت نصیب ہوئی ہے۔ تسخیر ارواح کا کام عجیب وغریب واقعات سے لبریز داستان ہے۔ مجھے اپنے تجربہ کے دوران میں یہ جاننے کا اتفاق ہوا ہے کہ ارواح نہ صرف مکانوں پر قابض ہو جاتی ہیں بلکہ انسانوں پر بھی اپنا تسلط جمالیتی ہیں اور انسان ان روحوں کے قبضے میں رہتا ہے۔ کچھ مہینے گزرے مجھے ایک ایسے ہی حیرت انگیز واقعہ سے سابقہ پڑا تھا۔ اس کا حال میں یہاں بیان کرتا ہوں۔

ایک روز میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی نہایت خوب صورت وشکیل خاتون میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی، تفکر اور تردّدِ خاطر کی پوری پوری کیفیات نمایاں تھیں جو اس کے خوب صورت چہرے کو اور بھی خوب صورت بنا رہی تھیں۔ مختصر طور پر یہ معلوم ہوا کہ اس مصیبت زدہ عورت پر بہت سخت کش مکش کا وقت پڑا ہے اور وہ ایک نوع کے نفسیاتی ضیق میں مبتلا ہے۔ اس کے شوہر پر، جو "برطانوی سیاسی سروس" کا ایک اعلا عہدہ دار ہے، کسی جن بھوت کا سایہ ہو گیا ہے اور اس چیز نے اس عورت کو پریشان کر رکھا ہے بلکہ دونوں سخت حیران ہیں کہ کیا کیا جائے۔ اس سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے کسی نے میرا نام اس خاتون کو بتایا۔

معلوم ہوا کہ یہ میاں بیوی عرصۂ دراز تک شام میں بہ سلسلہ ملازمتِ سرکاری رہ چکے تھے۔ وہاں اس شخص نے اپنی اعلا دماغی قوتوں اور برتر ذہانت کے باعث بہت کافی شہرت حاصل کر لی تھی ..... اور سرکاری اعزاز بھی۔ غرض زندگی نہایت پُر لطف تھی اور کوئی فکر نہ تھا کہ یکایک اسے ایک "مقامی بخار" نے آگھیرا اور وہ صاحب فراش ہو گیا۔ جب وہ بیماری سے اچھا ہوا تو یہ محسوس کیا گیا کہ اس کے مزاج اور افتادِ طبع میں کافی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔

بے شک سیاسی امور سلطنت میں اس کی ذہانت تیز تر ہو گئی، مگر معاملات زندگی میں، بالخصوص اپنی بیوی اور اکلوتے لڑکے کے ساتھ اس کا رویّہ یکسر بدلا ہوا پایا جاتا تھا اور یہ تبدیلی قطعی طور پر حیرت انگیز تھی۔ ایک محبت کرنے والا شوہر اور شفیق باپ تبدیل ہو کر ایک غافل، بے پروا اور سراسر طنز بن کر

رہ گیا۔ ہر وقت گم سُم کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ اور بعض اوقات تو وہ کچھ اتنا اجنبی بن جاتا کہ اپنی بیوی اور بچے کو بھی نہیں پہچانتا تھا۔

میری خوب صورت مہمان نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "اس چیز نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ وہ اس قدر بدل گیا ہے اور اس کا وجود اس کے سابقہ وجود سے اس درجہ مختلف ہو گیا ہے کہ میں یہ سمجھتی ہوں کسی اور روح نے اس کے جسم پر قبضہ حاصل کر لیا ہے۔" تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر بولی "کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کا سابقہ وجود واپس آجاتا ہے لیکن اکثر اوقات اس پر کسی اور طاقت کا تسلط جما رہتا ہے اور وہ اس کے چنگل سے آزاد نہیں ہونے پاتا۔ اور اس طاقت کے اثر کے ماتحت وہ بڑی مشکل سے مجھے یا اپنے لڑکے کو پہچان سکتا ہے اور وہ بھی ایک بھولی بسری یاد کے ساتھ، اس زمانے میں وہ ہمارے ساتھ سخت غفلت اور بدسلوکی کا برتاؤ کرتا ہے۔"

مَیں نے سمجھانے کے طور پر کہا، "ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ والا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس حقیقت کو دنیا تسلیم کر چکی ہے کہ "دوگانہ زندگی" بھی ایک چیز ہے، ایک آدمی بہ یک وقت دو شخصیتوں کا مالک بھی ہو سکتا ہے، یا وہ اس طرح بدل سکتا ہے کہ بالکل دوسری ہی ہستی معلوم ہونے لگے؟ عام طور پر ہم اس نوع کی تبدیلی یا انقلاب وجود کو "تحت الشعور" میں کسی تغیر و تہیج کے پیدا ہو جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔"

خاتون نے کسی قدر بے صبری کے ساتھ کہا، "مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے۔ اپنے شوہر کا دماغی توازن بحال کرنے کے لیے جب مجھے علاج و تدبیر کی دُھن ہوئی تو دماغی امراض اور غیر معمولی نفسی کیفیات کے موضوع پر نہ معلوم کس قدر کتابیں مَیں نے پڑھ ڈالیں اور اس نوع کے کتنے مباحث میرے زیر مطالعہ رہے۔ مگر سب کچھ بے کار ثابت ہوا۔ درصل میرے خاوند کا دماغی توازن مُطلق خراب نہیں ہے۔ وہ ایک معمولی انسان ہے، اس پر کسی جن کا سایہ ہو گیا ہے، کسی رُوح نے اس کے جسم پر اثر ڈال کر اسے اپنا مسکن بنا لیا ہے اور جب تک وہ رُوح اس کے جسم میں رہتی ہے وہ ایک بدلی ہوئی ہستی ہوتا ہے۔ میرے شوہر کی مشکلات کی نوعیت وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔"

مجھے لفظ "مشکلات" نے بہت متاثر کیا۔

پھر مَیں نے پوچھا "آپ کا مطلب اس کے دماغی انتشار و ہیجان سے ہے؟"

"یہ دماغی انتشار و ہیجان ہرگز نہیں ہے" خاتون نے زور کے ساتھ میری بات رد کرتے ہوئے کہا "یہ اس سے بھی بڑھ کر کوئی آفت ہے جسے میں نہیں سمجھ سکتی۔ پاگل پن یقیناً نہیں ہے، مگر کوئی اس سے بھی زیادہ خبیث چیز اسے ستا رہی ہے۔"

"مالیخولیا ہے کیا؟"

"نہیں۔ نہیں۔ آپ کہاں بھٹک رہے ہیں!" اس نے اپنا خوبصورت ننھا سا ہاتھ زور سے ہلا کر میرے خیال کو رد کرتے ہوئے کہا "کوئی اور ہی چیز اسے ستا رہی ہے۔ میری رائے میں وہ کسی روح کے

قبضے میں ہو۔ کسی مُردہ کی روح نے اس پر اپنا تسلط جما رکھا ہو، جس سے وہ چھٹکارا نہیں پا سکتا۔!"

اپنے خیال کی تائید میں خاتون نے جو واقعہ یا چند سانحات سنائے ان کی نوعیت بہ یک نظر مجھے اس قدر ناقابلِ یقین معلوم ہوئی کہ میں نے سوچا کہ کہیں یہ عورت ہی تو خبطی نہیں ہوگئی ہو۔ خاتون شاید میرا خیال میرے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے بھانپ گئی اور نہایت عقلمندی کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ بہت ٹھیک دماغی حالت میں ہے، پاگل نہیں ہوگئی ہے اور جو کچھ کہہ رہی ہے سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہے۔

اس نے تشریح کرتے ہوئے کہا :-

" ہمارا مکان دمشق میں تھا اور ایک روز شام کا وقت تھا کہ کسی سرکاری کام کے لیے سفر درپیش ہوا۔ کیوں کہ انھیں مصر جانے کا حکم ہوا تھا۔ یکایک میرا شوہر جب کہ وہ ایک سوٹ کیس بند کر رہا تھا چکرا کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ وہ کئی روز تک کامل غشی کی حالت میں پڑا رہا اور سب معالجوں کی یہ رائے ہوئی کہ اس کا جاں بر ہونا مشکل ہے، لیکن آخر کار وہ ہوش میں آگیا اور اس کے ہوش و حواس لوٹ آئے لیکن جسم کے نچلے اعضا، پر فالج کا سا اثر معلوم ہوتا تھا۔ اعصابی امراض کے ماہر طبیب کو بلایا گیا اور اس نے کامل غور و فکر سے کیس کو سمجھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اعصاب سرد پڑ گئے ہیں اور بغیر آپریشن کے کام نہیں بنے گا۔ میں اور میرا شوہر بالآخر اس کے لیے تیار ہوگئے، گو ہم اس بات کو ضرور محسوس کرتے تھے کہ یہ سخت آزمائش ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونا محال ہے۔

"بہر حال برقی کو ایک ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ وہ ایک پلنگ پر لیٹا ہوا تھا، اُدھر آپریشن کا کمرہ درست کیا جا رہا تھا اور آپریشن کے لیے سب انتظامات ہو رہے تھے۔ جس پلنگ پر اسے لٹایا گیا میں سمجھتی ہوں کہ وہی اس کی اصل بیماری اور ہمارے دکھوں کا باعث بنا۔ کیوں کہ اس بستر پر چند ہی گھنٹے پہلے ایک عرب شیخ انتقال کر چکا تھا اور اب اسی بستر پر میرے شوہر کو لٹایا گیا تھا۔ یہ عرب شیخ ایک امیر اور مشہور آدمی تھا اور اپنی اوباش طبیعت کے باعث اسے اکثر لوگ جانتے تھے۔ جوں ہی کہ میرے شوہر کو اس بستر پر لٹایا گیا وہ بے ہوش ہوگیا۔ میں پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرہ میں ایک قسم کا تغیر سا پیدا ہونا شروع ہوا - چہرہ لمبوترہ ہونے لگا اور جلد کا رنگ بھی زیادہ کالا ہونا شروع ہوگیا میں نے نرس کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی، لیکن اس نے یہ سمجھ کر کہ میں انتہائی دماغی کوفت میں مبتلا ہوں اور میری طبیعت بے قابو ہے میرے کہنے پر کوئی خاص توجہ نہیں کی۔"

" تھوڑی دیر کے بعد میرے شوہر کو پھر ہوش آگیا اور میں نے دیکھا کہ واقعی میرا خیال غلط نہ تھا اس کی آنکھیں قطعی مختلف تھیں، نہ صرف رنگ کسی قدر مختلف ہوگیا بلکہ جذبات و تاثرات جو کسی انسان کی آنکھ سے ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی بدلے ہوئے تھے - پہلے پہلے تو اس نے مجھے پہچانا بھی نہیں۔ جب بہت اصرار کیا تو کچھ سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کی مگر کچھ اس طرح گویا کہ جانتا ہی نہیں اور ہم ایک دوسرے سے بالکل ناواقف یا اجنبی ہیں۔"

"آپریشن ہوگیا، جو بالکل کامیاب رہا لیکن آپریشن کے فوراً ہی بعد برقی کو بخار اور ہچکیوں نے آگھیرا۔

——— یہ وہی امراض تھے جو مرنے والے شیخ کو لاحق ہوئے تھے!"

یہ کہہ کر خاتون رُک گئی اور اپنے لرزتے ہوئے خوب صورت آنکھوں میں ڈھلکنے والے ننھے ننھے موتیوں کو صاف کیا۔ اس دل گداز منظر سے میرا دل بھی بھر آیا، واقعی یہ عورت سخت آزمائش میں مبتلا تھی۔ بہرحال میں نے کچھ دلاسے کی باتیں کیں اور پھر پوچھا :-

"تو آپ اس تبدیلیٔ ہیئت و مزاج سے کیا نتیجہ نکالتی ہیں ؟"

"کیا خوب !" اس نے ذرا جھنجلا کر کہا "کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا آپ اتنی معمولی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ شیخ کی رُوح نے میرے شوہر کے جسم پر قبضہ کر لیا؟ برتی کی رُوح بھی جسم میں موجود رہتی ہے لیکن شیخ کی رُوح جسم میں رہتی ہے اور کبھی کبھی کامل طور پر اسے نہیں چھوڑتی، بلکہ اکثر ایسا ضرور ہوتا ہے کہ برتی کی رُوح اس کے جسم میں سے نکال دیتی ہے اور خود سارے جسم پر قابض ہو جاتی ہے۔ جس کا ایک معمولی نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ میرے ساتھ سخت بدکلامی اور سختی و ظلم کرنے لگتا ہے۔ حالاں کہ ویسے وہ سرکاری کاموں میں بہت خلیق و مہذب نظر آتا ہے۔"

میں نے جرأت کر کے سوال کیا :-

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ تمھارے شوہر کی خوش حالی و ترقی سے فائدہ اُٹھانے کی فکر میں ہے؟"

"بے شک ایقیناً ایسا ہی ہے۔ کیوں کہ ہرچند کہ میرا شوہر تیز فہم اور ذہین انسان ہے لیکن جب سے شیخ نے اس کے سر پر آنا شروع کیا ہے وہ اور بھی تیز اور ذکی ہو گیا ہے اور اس کی کارگزاریوں کی دھوم مچ گئی ہے۔ حکّام اور حکومت میں اس کی عزّت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ حال ہی میں اسے خدماتِ جلیلہ کا یہ صلہ ملا ہے کہ یورپ کے ایک بہت بڑے دارالحکومت میں اس کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ ذہانت و فراست میں یہ تیزی میرے خیال کو اور بھی تقویت دیتی ہے اور میں پختہ یقین رکھتی ہوں کہ شیخ نے میرے شوہر پر پورا قبضہ کر لیا ہے اور یہ زیادتیٔ فراست شیخ ہی کے دماغ کا کرشمہ ہے کیوں کہ شیخ خود ایک اعلا درجہ کا مدبّر اور سیاست داں تھا اور جنگِ عظیم کے دوران بھی اس کی کارگزاریوں نے اتحادیوں کو بہت فائدے پہنچائے تھے۔"

اس کے بعد میں نے یہ سوال کیا کہ کیا اس عجیب و غریب واقعہ کے دوران میں کوئی اور غیر معمولی واقعہ یا قابلِ ذکر [illegible] رونما ہوئی ہے؟

"اس [illegible] کہ میں ایک مصری باشندے اور پراسرار پرند کے بارے میں کچھ کہوں، یہ بتانا چاہتی ہوں کہ مجھ سے اور [illegible] لڑکے سے برتی کا کیسا ناروا سلوک ہے۔

"[illegible] کا ہے اور اس سے قبل میرا شوہر اس پر بڑی طرح فدا تھا، مگر جب سے بیمار پڑا ہے وہ مجھے بھی بھول [illegible] سے بھی نا آشنا اور بے گانہ ہو گیا ہے۔ مثلاً آپریشن کے فوراً بعد ہی مجھے لندن جانا پڑا۔ جب میں [illegible] اپنے لڑکے کے ساتھ واپس قاہرہ آئی جہاں برتی نے مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا تو یہ دیکھ کر [illegible] افسوس ہوا کہ وہ نہیں ملا۔ نہ معلوم کہاں چلا گیا۔ پیغامی تمام شہر کو دیکھ آئے گھر گھر، مکان مکان اور [illegible] کوچہ چھان مارا لیکن برتی کا نام و نشان نہ پایا۔ میں آخر کار تھک کر مایوس ہو گئی!

"میں اور میرے دو دوست جو شروع سے میری مدد کر رہے تھے اس سلسلے میں تھک کر ایک ریسٹوران میں جا بیٹھے۔ وہاں بھی یہی تذکرہ ہو رہا تھا کہ یکایک ایک شخص نے معافی مانگ کر ہم سے کہا کہ میں نے اتفاق سے آپ کی گفتگو اس میز پر سنی ہے، میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کا شوہر اس وقت کہاں ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اس کے پاس لے جا سکتا ہوں۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک مشہور ہوٹل میں بلیرڈ کے کمرے میں ملے گا۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ یکایک برٹی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ مگر اس کی چال میں ایک عجیب قسم کی تبدیلی تھی۔ وہ اس کی چال تھی ہی نہیں، اور نہ اس نے ہم سے مل کر اپنی عدم موجودگی اور غیر حاضری کی معافی چاہی یا اس کی کچھ تشریح کی، بلکہ ایک اجنبی کی طرح ملا۔

اس کی گفتگو حیرت انگیز طور پر بیگانہ تھی۔ شاید ہی کبھی بھول کر وہ ہمیں پہچان کر کوئی بات کہتا تھا، ورنہ عمومی گفتگو کر رہا تھا۔ وہ ایک فقرہ دہرائے جا رہا تھا جس نے مجھے پاگل بنا دیا۔ وہ فقرہ یہ تھا — "بڑی عجیب بات ہے۔ حیرت ہے مجھے۔"

"کیا چیز بہت عجیب ہے؟" میں نے اس سے دریافت کیا، لیکن وہ بیان کرنے سے قاصر تھا۔ وہ بچے کا نام بھی بھول چکا تھا اور مجھے تو وہ بالکل نہیں پہچانتا تھا، اس کی نگاہیں اس قدر غیر اور ویران سی تھیں کہ گویا میں اس کے لیے قطعی اجنبی ہوں۔"

غریب عورت بے تاب ہو گئی اور ہاتھ مل کر رونے لگی۔

"اوہ! بڑی افسوسناک ٹریجیڈی ہے یہ، میں نہیں جانتی کہ کیا کروں؟ ڈاکٹروں سے مشورہ کرتی ہوں تو وہ بالکل خاموش ہیں کوئی بات نہیں بتا سکتے۔ یہ کام ان کے بس کا ہے بھی نہیں، وہ جانتے ہی نہیں کہ قصہ کیا ہے اور علاج کیا کریں۔ بلکہ وہ مجھے ہی فاترالعقل کہتے ہیں۔"

میں نے اسے اچھی طرح تسلی دی اور کہانی آخری حد تک سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"ہاں۔ تو پھر آپ کیا کہہ رہی تھیں، — وہ مصری کون ہے اور ایک پراسرار پرند کے بارے میں بھی تو آپ شاید کچھ کہہ رہی تھیں؟"

"ان چیزوں کا تعلق بھی میرے شوہر کے افسوسناک واقعہ سے ہے۔" اس نے میرے سوال کا جواب دیا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا:—

"اور ان چیزوں سے میرا دل ہر وقت ہولتا رہتا ہے۔ ہم سب نے ان کو دیکھا ہے — میں نے — میرے شوہر نے اور میرے لڑکے نے — ہم نے مصری کی صورت دیکھی ہے جو میرے شوہر کے جسم میں سے اس کی روح کو نکال کر شیخ کی روح کو داخل کرنے کے لیے خود ہوا میں تیرتی رہتی ہے۔"

تھوڑی دیر کے لیے میں اپنے مہمان کی دماغی صحت کے متعلق شبہ میں پڑ گیا۔ خاتون کے بیان کردہ قصے میں خود اس قدر حیرت و استعجاب پوشیدہ تھا کہ اس پر یہ قصہ تو اور بھی بڑھ گیا اور میں سب کچھ بھول گیا۔ میں سب سے زیادہ اہم قصہ اسی چیز کو سمجھتا تھا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ایک ایسے شخص کے لیے جسے زندگی میں "جن اُتارنے" اور عملیات کرنے کا بہت موقع ملا ہو، ...... یہ نہایت مشکل ہوتا ہے کہ وہ ایک اہم

تخیل کی کارگزاری اور حقیقی روحانی حوادث کے درمیان کیونکر خط فاصل کھینچ کر تمیز پیدا کرے۔ اس لیے میں نے بیچ میں کوئی لقمہ نہیں دیا بلکہ اس پریشان خاطر اور پراگندہ حال عورت کو اپنی داستان جاری رکھنے کے لیے کہا۔

میں نے پوچھا: "پرندہ کیا کرتا ہے؟"

عورت نے کسی قدر زور کی آواز سے کہا۔ "میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیا کرتا ہے۔ ہاں یہ ضرور جانتی ہوں کہ اسے ہمارے معاملہ سے ضرور کچھ تعلق ہے۔ وہ ہماری مصیبت کو بڑھا دیتا ہے۔ میں نے اس پُراسرار پرندکو سب سے پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا جب کہ میرے شوہر کے اپریشن کو دو ہی ہفتے گزرے تھے۔ اب جب کبھی میرے شوہر میں تبدیلیٔ ہیئت کا عمل ہوتا ہے یہ پرند قریب قریب اس کے شروع یا آخر میں دکھائی دیتا ہے۔ سب سے پہلی مرتبہ یہ اڑتا ہوا خواب گاہ میں آیا تھا۔ میں اسے بڑی بڑی دیکھتی رہی۔ اس کے بعد یہ برابر ہر رات کو آتا رہا، اس کا رنگ اور بھی سیاہ ہوتا چلا گیا اور حجم وجسامت میں بھی وہ روز بروز بڑھنے لگا۔ اگرچہ پہلے کبوتر کی مانند تھا تو اب عقاب کی برابر بڑھ گیا تھا۔ یہ جب کبھی آتا ہے دکھائی دینے سے پہلے اپنے پر پھڑپھڑاتا ہے جس کی آواز پہلے سے سنائی دینے لگتی ہے۔ آتے کے ساتھ ہی وہ برٹی کے پلنگ کے گرد منڈلانے لگتا ہے، ایسا ہوتے ہی برٹی آنکھیں بند کرلیتا ہے اور غشی سی اس پر طاری ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد مصری برٹی کی رُوح نکال کر اس کے جسم میں شیخ کی رُوح کو داخل کردیتا ہے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟"

"کیوں کہ میں نے اس کو اپنی آنکھ سے ہوتے دیکھا ہے۔ جبکہ میرا شوہر سوتا ہوتا ہے مصری اس کے بستر کے قریب کھڑا مجھے دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد برٹی کی رُوح اس کے جسم سے نکل آتی ہے اور نکل کر بستر کے اس طرف جاکر ٹھہر جاتی ہے۔"

"کیا برٹی اس سے آگاہ ہے؟"

"نہیں! نہیں!! کاش کہ وہ آگاہ ہوجاتا۔ اگر میں اسے اس کا یقین دلاسکتی تو پھر تو اسے سمجھانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ میں اسے سمجھاتی کہ وہ اپنی روح کو قوی کرے، اپنے ارادہ کو پختہ کرلے اور مصری کو شکست دے دے۔ میں جب ان باتوں کا تذکرہ اس کے سامنے کرتی ہوں تو وہ میرا مذاق اُڑانے لگتا ہے۔ اور ہنس کر کہتا ہے کہ 'تم نے کوئی خواب دیکھ لیا ہوگا'۔"

میں نے سمجھ لیا کہ یہ ایک قالب اور دو روحوں کے مسکن کا معاملہ ہے جو عملیاتِ رُوحانی میں ایک روزمرّہ کا واقعہ ہے۔ اس میں مادّی جسم ایک سرائے کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے اور ہر بھولی بھٹکی رُوح آکر اسے اپنا مسکن بناسکتی ہے۔ میں نے خود اپنے تجربات میں اس قسم کے حوادث دیکھے ہیں اور اس کا پوری طرح قائل ہوں۔ خود میں نے بھی اپنی رُوح اپنے جسم سے علیحدہ کرکے دیکھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جسم خاموش پڑا سورہا ہے اور رُوح علیحدہ ہے۔ یہ جسم مجھے دکھائی دیتا تھا۔

"اور وہ تمہارے لڑکے کا کیا معاملہ ہے۔ معزز خاتون؟" "تم کہتی ہو کہ تمہارے لڑکے نے بھی اس عجیب وغریب واقعہ کو دیکھا ہے؟"

"ہاں" خاتون نے جواب دیا "صرف پرند کو دیکھا تھا مگر شیخ یا مصری کو کبھی نہیں دیکھا اور پرند بھی اس نے صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ ایک روز مجھ سے نیند نہیں آرہی تھی کہنے لگا کہ ایک گیت گاؤں گا۔ میں نے کہا 'بیٹا ضرور گاؤ' یہ سن کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں اپنے کام میں لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ شاید وہ باتیں کر رہا ہو۔ میں سمجھی کہ شاید مجھ سے کچھ کہہ رہا ہو۔ فوراً اس کے کمرے میں گئی تو وہ بولا "امی میں نے ابھی ایک چڑیا دیکھی بہت بڑی چڑیا۔ جو برابر چکر لگا رہی تھی" میں نے اس خاص موقع پر پرند کی صورت نہیں دیکھی البتہ دیوار پر اس کا سایہ مجھے بھی نظر پڑا۔

"وہ کتنا بڑا تھا؟" میں نے خاتون سے سوال کیا۔

شروع میں تو وہ ایک کوّے سے بڑا نہ ہوگا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا سایہ اس قدر بڑھا اس قدر بڑھا کہ میرا لڑکا اسے دیکھ کر چلّانے لگا "امی دیکھو یہ تو عقاب بن گیا!!" اس واقعہ کے بعد سے مجھے اس پُر اسرار پرند کی طرف سے کوئی شبہ باقی نہ رہا اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آپ سے مدد لوں گی، اور مشورہ ہی کی غرض سے میں یہاں آئی ہوں"

میری مہمان خاتون ایک منطقی عورت تھی اس لیے آسانی کے ساتھ اسے دھوکا نہیں دیا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں قصّہ کچھ اس قدر دلچسپ تھا کہ مجھے خود بھی اس کی چینک لگ گئی اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس مظلوم دماؤف شخص سے ضرور ملوں گا اور معاملے کو سلجھانے کی کوشش کروں گا۔

خاتون نے کہا "مگر برٹی کو یہ ہرگز نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمھارے آنے کا مقصد کیا ہے۔ وہ روحانی معاملات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور میرے عقائد کی توہین نہیں کرتا۔ میں اس وجہ سے آپ کا تعارف برٹی سے اس طرح کراؤں گی کہ روحانی تحقیقات اور علم الارواح کے مطالعہ کے سلسلے میں آپ سے ملاقات اتفاقیہ ہو گئی ہے اور آپ میرے دوست ہیں۔ اس کے بعد جیسا ہوگا دیکھا جائے گا"

پس یہ طے پایا کہ میں فوراً ان کے ہوٹل جاؤں۔ یہ لوگ ہوٹل کی غلام گردش میں ملیں گے اور میں سامنے سے آتا ہوا دکھائی دوں گا۔ مسز کے فوراً مجھے پہچان لیں گی کیوں کہ انھوں نے مجھے پبلک لکچر دیتے دیکھا ہے۔ اس بہانے سے وہ میرا تعارف اپنے شوہر سے کرائیں گی۔

جو سکیم سوچی گئی تھی وہ بالکل ٹھیک رہی۔ مسٹر کے ایک نہایت معقول، بُردبار اور لطیف مزاج انسان ثابت ہوئے، اور میں ان سے مل کر نہایت متاثر ہوا۔ مسز کے نے مجھے چپکے سے بتایا کہ مسٹر برٹی کئی روز کی تکلیف اور انقلابِ شخصیت (Changed Personality) کے حادثے سے رہا ہوئے ہیں اور اب اچھی حالت میں ہیں" دو روز سے شیخ صاحب ان پر سوار تھے آج بچارے کو آزاد چھوڑا ہے۔ مگر ابھی تک کچھ کچھ آثار اس "انقلابِ شخصیت" کے پائے جاتے ہیں

میں نے اب غور سے دیکھا کہ مسٹر کے کے اطوار اور ان کی گفتار میں ایک مشرقی انداز تھا بلکہ مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے گرد کوئی حلقہ سا بنا ہوا ہے جو دکھائی نہیں دیتا، البتہ محسوس ہو سکتا ہے۔ ان کی بیوی نے کہا کہ ان کی کھال کا رنگ دیکھو۔ میں نے غور کیا کہ وہ ہلکے زیتونی رنگ کا مشابہ ہے اور

اس دو گھنٹے کے دوران میں جبکہ میں ان کے پاس رہا وہ برابر کم اور کم سے کمتر ہوتا رہا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کی حالت بھی درست ہوتی چلی گئی اور جب میں نے انھیں خدا حافظ کہا تو ان کے طور اور پراسرار خاموشی میں یک گونہ تبدیلی ہو چکی تھی اور وہ اپنی سابقہ ہستی کو پھر حاصل کر چکے تھے وہ مجھے خاص طور پر پہچاننے لگے اور مل کر اور بھی خوش ہوئے گویا ابھی ابھی ملے ہی نہ تھے بلکہ جب خاتون نے یہ تحریک کی کہ میں ان کے ساتھ آئندہ روز شام کے وقت کھانا کھاؤں، تو انھوں نے بڑے جوش کے ساتھ میرا ہاتھ دبایا اور اصرار کیا، جسے میں نے دلی آرزو کے ساتھ قبول کر لیا۔

خاتون نے اس موقع کو غنیمت جان کر کہا :-

"اور پھر کھانے کے بعد ہم حاضرات (Seance) کا عمل کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ کوئی روح آتی ہے یا اور کوئی روحانی حادثہ، پیش آتا ہے یا نہیں"

میں جب گھر واپس آگیا تو ٹیلی فون پر مسز گے نے مجھے مطلع کیا کہ اس وقت ایک عرصۂ دراز کے بعد مسٹر گے کی طبیعت بحال ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ حاضرات کا عمل ضرور کیا جائے۔ وہ بے چین ہو کر کہنے لگیں: "ممکن ہے اس موقع پر مصری اور اس کا پُراسرار پرندہ بھی حاضرات میں آجائے اور اس طرح ہم ان سے چھٹکارا پانے کی کوئی تدبیر کر سکیں۔ بہر حال آپ کو اس موقع پر بہت سی باتوں کا خود تجربہ ہو جائے گا اور آپ معلوم کر سکیں گے کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں واہمہ نہیں ہے بلکہ روشن حقیقت ہے"۔

میرا اپنا بھی یہی خیال تھا اور بعد میں جو حالات رونما ہوئے وہ میرے خیال کی پوری طرح تصدیق کرتے ہیں کہ اس سے بہتر اور کوئی تدبیر شاید ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

اس کے بعد جو شام آئی، میں دعوت میں گیا۔ کھانے وغیرہ کے دوران میں مسٹر گے کی بیماری کے بارے میں کچھ بھی بات چیت نہیں ہوئی اور نہ جان بوجھ کر ہم نے کوئی بات نکالی، اور یہی وجہ تھی کہ ظاہری طور پر مسٹر گے کو مطلق شبہ نہ گزر سکا کہ میں کیا پارٹ ادا کر رہا ہوں۔

میری گزارش پر حاضرات کا عمل خواب گاہ میں ہوا کیونکہ میری دانست میں وہی ایک ایسا مقام تھا جہاں ارواح حاضر ہو سکتی تھیں اور انھیں وہاں آنے میں آسانی تھی۔ خاتون نے بڑی خوبی کے ساتھ ایک پُراسرار پرندہ کا حال سُنا کر معاملہ چھیڑا۔ میں نے پہلے تو کچھ زیادہ توجہ جان کر نہ دی، مگر جب ذرا گفتگو زیادہ طویل ہونے لگی تو خاتون کے اس پوچھنے پر کہ کیا پرندوں سے جادو یا روحانی عمل کے ذریعہ سے انسان پُراسرار کام لے سکتا ہے تو میں نے اس کا یہ جواب دیا:-

"ہاں بے شک ایسا ہو سکتا ہے" اور اس کے بعد "روحانی تحقیقات کی علمی مجلس" کے ریکارڈ میں جانوروں کی روحوں سے کام لینے کے جو حیرت انگیز واقعات میری نظر سے گزرے تھے ان کو بیان کیا۔ مسٹر گے کو اس بات سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی اور انھوں نے مسز گے یعنی اپنی بیوی کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ انھوں نے بھی ایک بہت پُراسرار پرندہ ضرور دیکھا ہے، جو ان کی خوابگاہ میں آیا تھا۔ مسٹر گے نے اس موضوع پر کچھ اور زیادہ روشنی ڈالنے سے گریز کیا تو میں بھی طرح دے گیا اور مزید گفتگو کرنے کی خاطر دوسری بحث چھیڑ دی۔

ہم نے حاضرات کے لیے جس کمرے کا انتخاب کیا تھا اسے حسب ضرورت درست کر لیا گیا تھا۔ خاص طور پر روشنی مکمل طور پر گل کرا دینے کی سکیم طے پا گئی تھی اور اس کا ٹھیک انتظام کر کے دیکھ لیا گیا تھا لیکن اس بات کا بھی خیال رکھا گیا تھا کہ کمرے میں اندھیرا ہو جانے کے باعث ایسا نہ ہو کہ چیزیں یا سامان اور آدمی دکھائی نہ دیں بلکہ محسوس ضرور ہوتے رہیں۔ چنانچہ ہم تین آدمی حاضرات کے عمل میں بیٹھے اور جیسا کہ قاعدہ ہے، باقاعدہ سنجیدہ بنے رہے کہ دیکھیں "پردۂ غیب" سے اب کیا ظہور میں آتا ہے!

کوئی پندرہ منٹ تک رُوحانی حلقہ قائم رہا مگر کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوئی۔ مسز گے کو خاص طور پر بہت بے قراری اور بے تابی تھی کہ کوئی خاص چیز ضرور "ظاہر" ہونی چاہیے تاکہ وہ مجھ کو یقین دلا سکیں کہ جو کچھ انھوں نے دیکھا تھا وہ بالکل درست تھا۔ مسٹر گے اسکے مقابلے میں بالکل خاموش ساکت اور گم سم بیٹھے تھے اور کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔

پہلی نشانی یا آثار کہ کوئی غیر معمولی چیز ظہور میں آنے والی ہے اس طرح محسوس ہوئی کہ یکایک سرد ہوا کے چند جھونکے نامعلوم طور پر ہمارے ہاتھوں پر آ کر لگے۔ جب ہاتھ پر اس طرح سرد جھونکے آ کر لگے تو سمجھ لیجیے کہ کوئی غیر معمولی نوعیت کا روحانی واقعہ ہونے والا ہے اور یہ بالکل بے خطا علامت ہے ہم نے ہوا کے جھونکے روکنے کے لیے کافی انتظام کر دیا تھا اس لیے یہ قطعی نہیں ہو سکتا تھا کہ اچانک باہر سے ہوا آ گئی تھی۔ اس کا امکان ہی نہ تھا۔

ہوا کے جھونکے خنکی اور تواتر میں بڑھنے لگے اور جب ایسا ہونے لگا تو مسٹر گے کو نیند سی آنے لگی اور وہ اپنی کرسی پر جم کر آرام کے ساتھ لیٹ گئے اور جلد ہی سو گئے۔ میں نے ان کے سانس پر غور کرنا شروع کیا، اور یہ محسوس کیا کہ سانس غیر معمولی طور پر گہرے آ رہے ہیں اور "معمول" بنائے جانے کی حالت میں جب انسان پر تنویم کا عمل ہو جاتا ہے تو اس کے جو آثار ہوتے ہیں وہ سب اس موقع پر موجود تھے۔ اس چیز نے مجھے چوکنا کر دیا اور آنے والے واقعہ کا انتظار کرنے کے لیے میں ہمہ تن گوش و راجواس بن کر بیٹھ گیا۔ میں نے مسز گے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور میرا ہاتھ مسٹر گے کے ہاتھ میں تھا اسے اصطلاح میں "حلقہ" کہتے ہیں۔ یہ حلقہ مسٹر گے کے علیحدہ ہو جانے کے باعث ٹوٹ گیا تھا جسے مسز گے نے محسوس کیا اور انھوں نے میرا ہاتھ دبا کر اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو ہاتھ کے اشارے ہی سے بتایا کہ آثار تنویم ہویدا ہیں۔ خاتون بالکل سیدھی بیٹھی ہوئی تھی، بے حس و حرکت ٹکٹکی باندھے اپنے غافل و بے ہوش شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی اور کبھی کبھی سر ہلا کر یہ ظاہر کر دیتی تھی کہ ہر وہ چیز جس کی اسے توقع تھی نمودار ہو رہی تھی اور اس بات سے وہ اپنی جگہ مطمئن تھی۔

یکایک سونے والے کے جسم میں حرکت ہوئی اور بے چینی کے ساتھ وہ اپنی کرسی پر مسکنے لگا اور بیٹھے بیٹھے کرسی پر اکڑ گیا۔ میں اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھیں قطعی طور پر بند ہیں۔ چہرے پر ایک رنگ آ رہا ہے اور ایک جا رہا ہے۔ بُشرے میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ اس کی جلد ایسی تبدیل ہوئی کہ کلونس دُور سے معلُوم ہونے لگی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ چہرے وغیرہ سے ایسا معلُوم

ہوتا تھا کہ کئی سال اس کی عمر میں بڑھ گئے ہیں۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اب ایک طرح کے تند بگولے کی سی صورت اختیار کر گئے تھے جو برابر سونے والے کے جسم کے گرد گھوم رہے تھے۔ یکایک خاتون کے منھ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور اس نے گلوگیر آواز میں کہا

"دیکھیے ـــــــ وہ سامنے مصری ہے !!!"

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا لیا اور اپنے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:-

"اوہ! اوہ! یا خدا یہ کیا ہو رہا ہے۔ شیخ برقی پر مسلط ہوئے جا رہا ہے!"

میں نے اس طرف دیکھا جس طرف خاتون نے اشارہ کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک دُھندہی جو دو حصوں میں منقسم ہے، اور دونوں حصے لمبائی میں ایک دوسرے کو محیط ہیں۔ دونوں "سایے" ایک عجیب ہیجان میں دکھائی دیتے تھے۔ مسز گے نے مجھ سے کہا کہ مجھے شیخ اور مصری دونوں کی جھلکیں دکھائی دے رہی ہیں۔ مصری شیخ کو اُکسا رہا ہے اور برابر زور ڈال رہا ہے کہ برقی کی روح کو جسم سے خارج کر کے خود متابعض ہو جائے۔

غریب برقی کا چہرہ اور بھی کالا پڑ گیا اور اس کے جسم میں بھی وہ تبدیلی اور انقلاب سا میں نے دیکھا کہ اس کا وجود ہی ختم سمجھا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کا جو سابقہ وجود دیکھا تھا یہ اس کے مقابلے میں ایک عجیب ہی چیز بن کر رہ گئی تھی۔ یہ اس کا اصلی اور قدرتی جسم تھا ہی نہیں۔

میں نے خود بھی دو روحوں کی موجودگی کو محسوس کیا، کیوں کہ جو جو دُھند تیز اور سیاہ ہوتی گئی میں نے دو آدمیوں کے مجسموں کو سائے کی مانند بنتا ہوا دیکھا اور یہ شاید وہی ہستیاں تھیں جنھیں مسز گے نے "دیکھا" تھا اور ان کا اصرار تھا کہ ضرور "دیکھا" ہے!

ان میں ایک سایہ کسی ایسے شخص کا تھا جس کی عمر زیادہ تھی۔ چہرہ خوفناک طور پر ظالمانہ تھا۔ یورپین لباس پہنے ہوئے تھا مگر ترکی ٹوپی سر پر تھی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اعلیٰ خاندان مصری معلوم ہوتا تھا جو ارادہ کا پختہ تھا اور ظالم بھی تھا۔ اس لیے لطیف جذبات سے قدرتی طور پر بالکل عاری تھا۔ وہ سونے والے مسٹر برقی کے اس جانب کھڑا تھا، اور وہ اپنے ہاتھ نکال کر سونگھی فیشن کے پاس عمل تنویم کرنے کے لیے کر رہا تھا۔

مسٹر گے کے اس طرف عین ان کے کندھوں کے برابر ایک لمبا چوڑا ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا دکھائی دیتا تھا جو چہرے سے خوب صورت مگر عیاش نظر آتا تھا۔ اس کی داڑھی اور مونچھیں جو بہت نفاست کے ساتھ کتری ہوئی تھیں، بالکل سیاہ تھیں اور آنکھیں خمار آلود تھیں اور ان میں ایک خاص قسم کے جذبات خوابیدہ تھے۔ اس کا چہرہ مہرہ بہت عمدہ تھا اور ناک ستواں تھی۔ وضع قطع سے وہ عرب نسل کا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن یہ بھی انگریزی لباس پہنے ہوئے تھا۔ وہ ایک سیاسی ملازمت کا رکن تھا۔ یعنی سفیر وغیرہ، جیسا کہ مسز گے نے مجھ سے کہا تھا۔

مجھے اس منظر نے بہت ہی متاثر کیا۔ شاید ہی کوئی منظر اس انداز میں ڈرامائی کیفیت کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہو جیسا کہ یہ تھا!

میں نے اور مسٹر گے نے سب سے پہلے مصری کی طرف دیکھنا شروع کیا، کیوں کہ وہی اس ڈرامہ کا "اعلیٰ دماغ" تھا جو کام کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہ تو سونے والے انسان کے مستقبل اور اس کے حشر کی طرف متوجہ تھا اور نہ اپنی ناپاک اسکیم کی طرف بلکہ وہ صرف اس چیز سے مسرور اور مطمئن معلوم ہوتا تھا کہ اس نے جو سائنس سیکھا ہے وہ کس درجہ قابلِ عمل ہے اور وہ اسے کس حد تک کر سکتا ہے ——— اس وقت مجھے یہی معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ اسی مسئلے کے درپے ہے اور اسے کسی چیز سے تعلق نہیں ہے۔ اسے اس چیز سے مسرت و فخر محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس قدر طاقت ور ہے کہ دوسرے انسان کے جسم اور ذہن پر تسلط و قابو حاصل کر سکتا ہے اور وہ جو کچھ کرنا چاہے اس شخص سے کام لے سکتا ہے۔ یہ تسخیر ارواح و اجسام کا ایسا لاجواب کارنامہ تھا کہ جسے حاصل کر کے واقعی اس نوع کے آدمی کو بے پایاں خوشی حاصل ہونی ہی چاہیے تھی۔

شیخ ——— جیسا کہ وہ ظاہری ہیئت سے معلوم ہوتا تھا ——— ایک دوسری افتادِ طبع کا مالک معلوم ہوتا تھا ——— وہ ایک عیش پرست اور بدکار انسان تھا اور اسے اس بات کی مسرت تھی کہ وہ کسی اور جسم کے ذریعے ——— کیونکہ موت کے باعث وہ سابقہ جسم کھو چکا تھا ——— عیش اڑانے کا ایک وسیلہ اور واسطہ پیدا کر سکے گا۔ وہ ہمیشہ سے جسمانی لذتوں کا غلام رہا تھا اور اس دفعہ بھی وہ ہر قیمت پر اپنے آپ کو شیطان تک کے حوالے کرنے کے تیار ہو سکتا تھا بشرطیکہ اسے لذت کام و دہن میسر آجائے جس پر وہ سابقہ زندگی میں بھی فدا تھا اور جسے حاصل کرنے کے لیے اس نے مسٹر گے کو وسیلہ بنانا پسند کیا تھا۔

ہم دیکھ رہے تھے کہ یکایک سونے والے کے بائیں جانب کسی چیز کو حرکت ہوئی۔ مسز گے اس وقت کامل غشی کے آغوش میں پہنچا ہی چاہتی تھیں کہ میں نے انھیں جلدی سے بڑھ کر سنبھالا۔ کمر میں ہاتھ ڈال دیا کہ کرسی پر سے گرنے نہ پائیں۔ لیکن اس تمام دوران میں میں نے ایک خفیف سے لمحے کے لیے بھی اپنی نگاہ روح اور اس کے مظلوم شکار کی طرف سے نہیں ہٹائی اور برابر اس کو دیکھتا رہا۔ کیوں کہ جنگ میں وہ خواہ کیسی ہی ہو آنکھیں جھپکانے یا ہٹانے سے شکست قریب آجاتی ہے۔

تھرتھری کی کیفیت رفتہ رفتہ بڑھنی شروع ہوئی اور کچھ چمک سی پیدا ہوئی، ایسی جیسے کسی چمک دار چکنی سڑک پر گرم روشن سورج چمک رہا ہو۔ اس کے بعد یہ عالم بھی ختم ہو گیا اور پھر وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی یعنی سونے والا آدمی اپنے آپ سے باہر ہو گیا! واقعی اپنا وجود چھوڑ کر اس کا دوسرا سراپا میرے سامنے کھڑا دکھائی دے رہا تھا، بالکل ویسا ہی ایک جسم جیسا کہ اس کرسی پر رکھا ہوا تھا میرے سامنے موجود تھا۔ مگر اس دوسرے سراپا میں مجھے آثارِ حیات مطلق نہیں دکھائی دے رہے تھے ہر چند کہ یہ سراپا سرد قد کھڑا تھا مگر پھر بھی جھکا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔

یہ حالت دیکھ کر مسز گے پر غشی طاری ہوگئی اور ان کے منہ سے ایک دردناک
اور بھیانک چیخ نکل کر فضا میں گونج گئی۔ میں نے اس بے چاری کو فرش پر
لٹا دیا اور خود رُوح کی طرف متوجہ ہُوا اور یہ فیصلہ کیا کہ اب عمل
کرنے کا وقت بالکل قریب آگیا ہے اور مجھے اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔
جونہی کہ مسٹر گے کا لطیف وجود ان کے مادّی
اعضائے جسم کو چھوڑ کر علیحدہ ہوا مصری نے کرسی پر بیٹھی
ہوئی شکل کی طرف دیکھ کر
پُراسرار اشارہ کیا جس کا مطلب
یہ تھا کہ جسم اب خالی ہے شیخ کو



اِذن ہوا کہ وہ اس میں حلول کر جائے۔ چنانچہ وہ جسم کے قریب گیا اور آہستہ آہستہ غائب ہونا شروع ہوا اور اس کے بعد یہ سراپا نگاہ سے غائب ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ مسٹر گے کا لطیف وجود اس کے بھاری مادّی جسم سے الگ ہوکر کوئی حرکت کرنے کے بالکل ناقابل تھا۔

یہ امر واضح تھا کہ گو جسم پر دوسری رُوح کا قبضہ ہو جاتا تھا مگر پھر بھی اس جسم کے حقیقی مالک کی ذہنیت کچھ نہ کچھ ضرور موجود رہتی تھی اور وہ ظاہر ہوتی رہتی تھی اور دماغی انتشار پیدا کرتی رہتی تھی۔ جو مسز گے نے اپنے شوہر میں دیکھی تھی اور جو مسٹر گے کی تبدیل شدہ ہستی کا ایک اہم جزو بن چکی تھی۔

غرض یہ سارا معاملہ عجیب و غریب تھا اور جن تسخیر کرنے والے ماہرین ارواح کے لیے حیرت انگیز واقعہ تھا! بھوتوں والے مکان اور جنوں کے سائے میں آجانے والی ہستیاں میں نے بہت دیکھی تھیں۔ جنوں کا اثر بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ کچھ غریب ہستیوں کو یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ ان پر جنوں کا سایہ ہے اور وہ کسی بھوت پریت کی زد میں آگئے ہیں، مگر درحقیقت ان کے جسم پر کسی بھوت یا رُوح کا قبضہ ہوتا نہیں ہے۔ لیکن آج تک ایسا یقینی واقعہ تسخیر جسم و رُوح میں نے نہیں دیکھا تھا اور میں واقعی

اس وقت سخت حیرت میں تھا۔ تجربہ نے مجھے یہ بتا دیا ہو کہ دراصل
ارواح بہت کم زور طبیعت مخلوق ہوتی ہیں مصمم ارادہ کے
ساتھ اگر آپ کسی بھی قسم کی مخالفت کریں یا دھمکائیں
تو روح ڈر جاتی ہو۔ ذراسی آہٹ شمع کی روشنی،
گھنٹی کی آواز سے رُوح کے کام میں خلل ڈالا
جاسکتا ہو۔ اور مَیں نے آج تک ایسی کوئی
رُوح نہیں دیکھی کہ اگر کسی معقول سائنٹی فک
طریقے سے اس کے پیچھے پڑا جائے تو
اسے صدمہ نہ ہوا ہو اور وہ جھنجلا کر بھاگ
نہ گئی ہو یا تسخیر میں نہ آگئی ہو۔



اس سلسلے میں میرا طریقۂ کار
نہایت سیدھا سادہ تھا۔
میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ
اگر کوئی دماغ
جسم کے باہر
ہو تب بھی
ویسا ہی ہوتا
ہو جیسا کہ جسم کے
اندر۔ اس لیے
اسے اپنے
دماغ یا
ارادہ کی
زد سے نیچا
دکھایا جاسکتا
ہو خواہ وہ
بھوت ہی کا
کیوں نہ ہو۔
چناں چہ یہ
سوچ کر میں
نے فیصلہ کیا کہ مصری کے خلاف ارادہ کی قوت کا

ظاہر کردوں گا اور جس طرح مصری نے عملِ تنویم یا کسی اور طاقت سے مسٹر گے کو ان کے جسم سے نکال بھگایا تھا، میں اپنے ارادہ کی قوت سے ان کو واپس ان کے جسم میں بھیج دوں گا۔

اس وقت تک ان ارواح کو مسٹر گے اور میرے موجود ہونے کا شاید احساس نہ تھا۔ کیوں کہ وہ اپنے گھناؤنے کام میں اس درجہ منہمک تھے کہ انھیں ہوش ہی نہ تھا کہ کوئی اور بھی موجود ہے۔ لیکن جب میں نے اپنا عمل شروع کیا تو ایک قابلِ لحاظ تبدیلی دیکھنے میں آئی۔

مصری کو میری موجودگی کا خاص طور پر احساس ہوا۔ اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں پر گرا کر وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف گھور کر دیکھنا شروع کیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو چہرے کی ہڈیوں میں دھنسی ہوئی تھیں، کانچ کی سرخ گولیاں معلوم ہوتی تھیں۔ نگاہیں مجھ پر حملہ کر رہی تھیں اور اندر پیوست ہوئی جا رہی تھیں، جس کی وجہ سے میں پسینے پسینے ہو گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ میرا ارادہ کمزور ہو گیا اور قوتِ فیصلہ جاتی رہی اور قریب تھا کہ گر پڑوں کہ پھر ہمت بندھی اور بہت پختہ ارادے کے ساتھ اور سنبھل کر میں نے مصری کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ اور اس کی طرف پورے زور کے ساتھ توجہ کرنی شروع کی۔ مصری کے لبوں پر ایک حقارت آمیز تبسم آیا۔ شیطانی آنکھوں میں خوفناک بدیاں نظر آنے لگیں اور اسے میری قوت ارادی کے برتر ہونے کا احساس ہونا شروع ہو گیا جس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ چہرہ پر آثار وحشت ہویدا ہو گئے۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے۔ لیکن اس سے ایک غلطی ہو گئی اور وہ بہت سخت تھی یعنی یہ کہ اس نے میری طرف توجہ کر کے شیخ کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ شیخ بغیر اپنے ممد و معاون کے کچھ نہیں کر سکتا تھا! وہ اگر غیر جسم پر قابض تھا تو محض اپنی کمزوری اور مصری کی اس طاقت کی وجہ سے جو اب مجھ پر صرف کی جا رہی تھی۔

خیر۔ اب ایک اور دلچسپ واقعہ رونما ہوا۔ مسٹر گے کو ان کی مرضی کے بالکل خلاف ان کے جسم سے باہر نکالا گیا تھا اس لیے قانون خود حفاظتی کے ماتحت ان کے جسم کو ہر وقت یہ آرزو رہتی تھی کہ غیر متعلق ساکن کو جسم سے نکال کر اصل مالک کو جگہ دی جائے۔ کوئی عقلمند اور صحیح الدماغ انسان اپنی انفرادیت اور اپنی ہستی کو ضائع کرنے پر آمادہ نہیں ہو گا۔ قدرت نے یہ جذبہ ہر ذی روح میں ودیعت کیا ہے تاکہ وہ اپنی حفاظت کر سکے۔ صدیوں سے فطرت ہمیں اپنی حفاظت آپ کرنے کے لیے سبق دے رہی ہے اور سمجھا رہی ہے کہ کس طرح ایسا کیا جائے۔ اس قانون فطرت کا اس معاملہ میں یہ اثر ہوا کہ جب مصری نے اپنے مسخر شیخ کو کام کرنے کے لیے مناسب قوتِ ارادی بہم نہ پہنچائی تو وہ غیر جسم میں بے کار محض ہو کر رہ گیا اور ادھر جسم کے اصل مالک یعنی مسٹر گے نے غاصب روح کو اپنے جسم سے نکالنے کی جستجو کی اور دونوں روحوں میں خوب کشمکش رہی۔ بعد میں جو واقعات رونما ہوئے میں نے ان سے یہی نتیجہ اخذ کیا۔

گوشۂ چشم سے میں نے دیکھا کہ شیخ آہستہ آہستہ اس جسم میں سے جو کرسی پر ہے نکل رہا ہے

اور مسٹر کے کی لطیف رُوح اپنے مادّی جسم میں واپس داخل ہو رہی ہے۔

جس وقت مصری کو اس چیز کا علم ہوا اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ شیخ اپنے "جلائے ہوئے" جسم میں سے باہر نکل آیا اور نکل کر سیدھا مصری کی طرف بڑھا اور اس قدر زور سے دونوں کا تصادم ہوا کہ مجھے یہ معلوم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا کہ ان دونوں خبیثوں میں ضرور کوئی مقناطیسی کشش ایک دوسرے کے لیے پائی جاتی ہے۔ جونہی کہ مصری پر یہ آفت ناگہانی نازل ہوئی وہ لڑکھڑا گیا، اور اپنے ساتھی کی اس حرکت پر سخت حیران و ششدر تھا۔ یہ صورتِ حال بالکل یکایک پیدا ہوئی تھی اور چونکہ اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے اس لیے اس سے بچنے کی بھی کوئی تدبیر نہ تھی !! اب دیر اس قدر ہو چکی تھی کہ مصری کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مسٹر کے خود اپنے جسم میں داخل ہو چکے تھے اور آہستہ آہستہ انھیں ہوش آ رہا تھا۔

میں نے رُوحوں کو چھوڑ کر سیدھا مسٹر کے کی طرف رُخ کیا کیوں کہ اس وقت انھیں میری مدد کی فوری ضرورت تھی۔ مَیں نے ان کے پاس پہنچ کر جلدی جلدی "پاس" کرنے شروع کیے جس طرح کہ مسمریزم کرنے والے ہوش میں لانے کے لیے اپنے معمول کے لیے کیا کرتے ہیں۔

ہر چند کہ شیخ اور مصری کی "زبان" سے نہ کوئی لفظ نکلا تھا اور نہ کسی قسم کی آواز سننے میں آئی تھی۔ لیکن پھر بھی تبادلِ خیال کا کوئی ذریعہ ضرور تھا اور وہ انتقالِ خیال (Telepathy) ہی کا ذریعہ ہو سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی اس معاملہ سے ربط پیدا کر لینے کے باعث ان نامرئی پیام کو اس طرح وصول کرنے لگا تھا جیسے ریڈیو بے تار برقی لہریں "اخذ" کر لیا کرتا ہے۔ میں نے بھی دماغی لہریں اپنے حواس کے ریڈیو میں "اخذ" کرنی شروع کر دیں۔

شروع شروع میں تو وہ ایک دوسرے کو خوب جھڑکتے اور سخت سُست کہتے رہے اور پھر مجھ پر جھلّائے۔ بہت سخت ناراض ہوئے۔ مصری نے حقارت اور شدید جذبات نفرت کے ساتھ شیخ کو دیکھا اور پھر مجھے دیکھ کر برافروختہ ہُوا۔ مگر اس کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔

میں نے اب اپنے خیال کا رُخ ان بدمعاشوں کی طرف کر دیا اور انھیں خیالوں کی لہروں سے یہ بتایا کہ آئندہ ایسی ناپاک حرکت مت کرنا، یہ سخت ناروا حرکت ہے۔ اور تم بڑے سخت بدمعاش ہو۔ میں نے ذہن کی لہروں کے ذریعہ مسٹر کے کی حمایت کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ انھیں اپنے جسم میں رہنے اور اپنے وجود و روح کو برقرار رکھنے کا بخوبی اختیار حاصل ہے اور اگر انھیں اس حق سے محروم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ ان کے فطری حق میں مداخلت ہے۔ میں نے ان کی بیوی اور بچے کی حالت زار کا حال بھی سمجھایا۔ میں نے آج تک اس قدر شدید اور موثر توجہ کبھی نہیں ڈالی تھی۔ لیکن اس وقت اس کے جو امید افزا نتائج برآمد ہوئے میری طبیعت ان کو دیکھ کر خوش ہو گئی مصری نے ہار کر شکست مان لینے کا انداز اختیار کیا اور شیخ کو بالکل ناکارہ بنا دیا گیا۔ وہ بغیر مصری کی امداد و اعانت کے کچھ نہیں کر سکتا تھا اور جب مصری نے خود ہی اس کی مدد کرنے یا اس سلسلے کو

ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا تو وہ کم زور ہو گیا اور اس میں یہ طاقت ہی نہیں رہی کہ اپنے شکار کے جسم پر قابض رہ سکے۔
اب اس ڈرامے کا آخری اور حیرت انگیز منظر آیا۔

پرند آیا۔ پراسرار پرند! جسے دیکھنے کے لیے میں بہت مشتاق تھا۔ یہ اس وقت ہوا جب مسز گے ہوش میں آچکی تھیں اور مسٹر گے بھی اپنی اصل حالت میں آچکے تھے۔ انھیں اس بات کا بالکل علم نہ تھا کہ وہ اپنا مادی جسم چھوڑنے کے قریب ہو گئے تھے اور ایک عجیب افتاد ان پر پڑ چکی تھی۔

ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھے تھے، کسی قدر خاموشی تھی اور اس بات کے منتظر تھے کہ دیکھیے اب کیا چیز ظہور میں آتی ہے۔ کہ یکایک فضا میں جنبش ہوئی اور آواز گونجی، ہم یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ کمرہ میں یہ آواز کس جگہ سے آرہی تھی مگر تھی ضرور۔ اس کے بعد کسی پرند کے پھڑپھڑانے اور مسلسل پرواز کرنے کی آواز سنائی دی، مگر پرند ہمیں دکھائی ابھی تک نہیں دیا۔

یکایک مسز گے نے ششدر ہو کر کہا —— "وہ دیکھیے۔ پرند آگیا۔ پرند —— !" اب میں نے دیکھا کہ خوابگاہ کے ریشمین پردوں پر ایک بڑے پرند کا سایہ پڑ رہا ہے اور اس کی حالت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر ضیق طاری ہے اور مرنے کی تکلیف سے وہ بے حال ہے۔

ہم نے رُکے ہوئے سانسوں کے ساتھ اس چیز کی طرف غور سے دیکھا۔ سامنے ایک پرند کا سایہ جس کی ٹانگیں تشنج سے ٹیڑھی ہو گئی تھیں دکھائی دیا۔ یہ "موت" تھی جو عالم نامعلوم سے آئی تھی۔ ملک الموت!!

یکایک یہ سایہ اور اس کے ساتھ وہ چیز بھی جو عالم ماورائے ادراک سے آئی تھی اور جس کا یہ سایہ تھا نظروں سے اوجھل ہو گیا اور پھر معمولی تاریکی فضا پر طاری ہو گئی۔

ہم لوگ خاموش بیٹھے ہوئے تھے، سر چکرا رہا تھا۔ لیکن جو کچھ گزر چکا تھا اس کے بارے میں کوئی گفتگو کرنے کے لیے ہم میں سے کوئی بھی آمادہ نہ تھا۔ یہ کیفیت تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ مسز گے سسکیاں لیتی اور آنکھیں ملتی ہوئی اپنی کرسی پر سے اٹھیں اور اپنے شوہر کے گلے میں پیار سے بانہیں ڈال دیں۔
یہ دیکھ کر کہ اس مسرت میں خواہ مخواہ دخیل بنا ہوا ہوں میں چپکے سے کمرہ سے باہر نکل آیا اور انھیں باہمی ربط و محبت کا موقع دیا۔ ہال میں آ کر میں نے اپنا ہیٹ سر پر لگایا اور کوٹ پہن کر مکان کی طرف چل دیا۔

مسز گے کا علاج ہو گیا

اس روز کے بعد سے مسٹر گے کا اپنا فطری وجود موجود ہے۔ وہی خوش مزاجی، محبت، خلق، اور ذہانت و تعلقات جو اس سے قبل دونوں میاں بیوی کے درمیان تھے اب بھی وہی ہو گئے۔
وہ اب اپنے بچے کی طرف سے بھی غافل نہ رہے۔ عارضی طور پر جس افسوسناک روگ نے ان کا پیچھا لیا تھا وہ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ اس سے قبل میں نے تسخیر ارواح کا اتنا عمدہ اور قابل اطمینان عمل نہیں کیا تھا جس قدر اس موقع پر ہوا، اور اس خوب صورت عورت نے مجھے جس پیار سے میری ناچیز خدمات کے عوض —— اگر وہ خدمات ہی تھیں —— ایک تحفہ دیا جس کی بیش قیمت اہمیت میں ہمیشہ اپنے دل میں ایک دفینۂ لازوال کے طور پر محفوظ رکھوں گا۔

میں ابھی تک اس پراسرار پرند کی اصلیت کی طرف مطمئن نہیں ہوں۔ اس کی حقیقت پر مختلف پہلوؤں سے غور کرچکا ہوں لیکن اس کے صحیح مفہوم سے آشنا نہیں ہوسکا ہوں۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ جانور دوسرے جانوروں کی طرح تھا جنھیں مسخر کرکے عالم ارواح کا کام لیا جاتا ہے۔ خاص کر الو کی تسخیر سے ارواحِ خبیثہ بہت کام لیتی ہیں اور یہ بات بہت مشہور و معروف ہے۔ جوں جوں یہ ترقی کرتا تھا اور بڑھتا دکھائی دیتا تھا مصری اور شیخ کی حرکات مذبوحی میں بھی ترقی اور کامیابی ہوتی چلی جاتی تھی لیکن جب وہ مرگیا تو مصری بھی شکست کھا گیا اور اس نے جس بدنیتی کی وجہ سے ایک متمول انسان کے جسم کو مسخر کرکے اسے اپنی روحانی قزاقیوں کا شکار بنا دیا تھا وہ بھی اس چنگل سے آزاد ہوگیا۔ مصری اور شیخ کا خاتمہ وہی ہوا جس کی توقع تھی اور خوب ہوا +

خوشہ چینیاں

امریکن زیادہ کھاتے ہیں اور دوسرے بھوکے مرتے ہیں

"جبکہ یورپ کبھی غذا کی وجہ سے فاقے مر رہا ہو اکثر امریکن بسیار خوری کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا ہیں"۔ ڈاکٹر پال ڈڈلے وائٹ پروفیسر میڈیسن ہارورڈ یونیورسٹی نے ایک پرتکلف ضیافت میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ موصوف نے یہ بھی بتایا کہ اکثر کیبرسن اور ادھیڑ عمر والے امریکی روزانہ ضرورت سے زیادہ ہزاروں غذای حرارے (کلیوریز) چھوڑ کر اپنی صحت کو صحیح رکھ سکتے ہیں مگر بچوں کی غذا ذرا دیکھ بھال کر کم کرنی چاہیے۔

ڈاکٹر وائٹ نے کہا کہ مٹاپے کو قلب کی بیماری کا خاص سبب سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر ٹنن لی آرہرین پروفیسر میڈیسن ساؤتھ ویسٹ میڈیکل اسکول ڈالاس نے ایک تقریر میں بتایا کہ قلب کی بیماریوں سے ہر سال امریکا میں ۵۵۰۰۰۰ سے ۸ لاکھ تک اموات واقع ہو رہی ہیں۔ موصوف نے کہا کہ مرض سرطان سے جتنی موتیں واقع ہیں اس سے تین گنی زیادہ قلب کی بیماریوں سے ہو رہی ہیں۔

دی سیکرمینٹو یونین۔ امریکا۔

برطانیہ میں ڈاکٹروں کا احتجاج

ٹانسلز کا اپریشن بند کرنے پر گورنمنٹ کے خلاف نکتہ چینی

"میڈیکل ورلڈ" میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں وزارت صحت پر "حد درجہ تغافل اور انسانی زندگی کے ساتھ بے اعتنائی کا معاملہ" کرنے پر سخت الزام لگایا ہے۔ اس لیے کہ وزارت نے ڈاکٹروں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ٹانسلز کا اپریشن اس وقت تک بند کر دیں جب تک بچوں میں وبائی بیماریاں پھیل رہی ہیں

اس مضمون میں لکھا تھا کہ وزارت کے اس قسم کے "خوف دلانے والے اعلان" کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک کے طول و عرض میں ٹانسلز کا اپریشن بند کر دیا گیا۔ اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں بچے متعفن ٹانسلز لیے پھر رہے ہیں جنھیں جتنا جلد نکالا جائے اتنا ہی اچھا ہے، ورنہ آئندہ جاڑے میں ان کی تکلیف بڑھ جائے گی اور ان میں سے بہت سے اس کی سمیت کا شکار ہو جائیں گے وزارت صحت کے ایک افسر نے آج بتایا ہے کہ بچوں میں وبائیں پھوٹ پڑنے کی صورت میں امریکا اور آسٹریلیا میں بھی وزارت کی جانب سے یہی مشورہ دیا جاتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تمام دنیا کے ماہرین اس چیز کو صحیح سمجھتے ہیں اور وباؤں کے زمانے میں ٹانسلز کا اپریشن بند کرا دیتے ہیں۔

(نیویارک ٹائمز)

جنوبی افریقہ کی سائنسی و فنی انجمنیں

(از آر۔ شاڈر۔ بی ایس سی)

کیلوین ہاؤس کا نام جنوبی افریقہ کے سائنسی و حرفی کارکنوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے یہ جنوبی افریقہ کی متحدہ سائنسی و فنی انجمنوں کا ہیڈ کوارٹر ہے جو اس قسم کے تیرہ اداروں پر مشتمل ہے۔ انجمن کی حیات و برقراری انھی اداروں کی رکنیت کی رہین منت ہے۔ آج کل ہیڈ کوارٹر ایک عالی شان عمارت میں ہے جو شہر جوہانسبرگ کے مرکزی حصے میں واقع ہے۔ گزشتہ سال اس کے قیام کی پچیسویں سال گرہ منائی گئی تھی۔ اس کے ملحقہ اداروں کے ارکان کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ ہے۔ ان مختلف اداروں کے باہمی الحاق کا آغاز اب سے تیس سال قبل ہوا تھا جبکہ جوہانسبرگ کے بعض دور اندیش اراکین ایک ایسی عمارت کی موجودگی کی ضرورت محسوس کرتے تھے جو مشترکہ طور پر استعمال کی جا سکے اور جس کے اخراجات میں سب شریک ہوں۔ بہرکیف اس انجمن کی باضابطہ تاسیس سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک ایسے اجلاس میں ہوئی جس میں دس مختلف اداروں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔

انجمن کے مقاصد کا دامن کافی وسیع تھا جس کا اندازہ ایک حد تک دستور اساسی کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔

(ا) سائنسی، فنی و حرفی انجمنوں کے مفاد کی ترقی، ان پیشوں سے متعلق علوم کی توسیع اور ان پیشوں کے وقار کا تحفظ۔

(ب) سائنسی، فنی و حرفی انجمنوں اور ان کے اراکین کے خیالات کی اجتماعی حیثیت سے ترجمانی۔

(ج) ان انجمنوں کے لیے ہر قسم کی سہولتوں کی فراہمی اور ان کے لیے مناسب جگہ کا حصول۔

(د) قانونی تحفظات کا اضافہ یا ایسے معاملات میں جو مذکورۃ الصدر مقاصد و مفادات پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر انداز ہوں، حکومت، مجلس مقننہ یا مجلس انتظامیہ سے مراجعہ۔

(ہ) ایسے تمام امور پر جو اراکین کے پیشہ ورانہ مفاد پر اثر انداز ہوں، بحث اور غور و فکر کرنا۔

(و) سائنسی و حرفی مضامین کے مطالعہ کی ترقی و حوصلہ افزائی۔

(ز) اراکین کے لیے عام فوائد، مراعات اور سہولتوں کی فراہمی نیز کلب کے لیے جگہ کی دست یابی۔

(ح) کلب کے اراکین کے باہمی مفادات کی ترقی و تحفظ۔

(ط) اراکین کے باہمی نزاعات و اختلافات کا فیصلہ و تصفیہ۔

مرکزی عمارات:

انجمن کے جشن سیمیں کے موقع پر مسٹر پری کیز ملیٹ نے جو اس قسم کی مختلف مجالس اور اداروں کے باہمی اتحاد کے سرگرم محرکین میں سے ہیں اپنے پیغام میں کہا تھا کہ بعض اداروں کے

اراکین میں اس قسم کا اندیشہ پایا جاتا تھا کہ ایک مشترکہ انجمن کے قیام سے ایک حد تک ان کا تشخص و انفرادیت ختم ہو جائے گی۔ نیز ان مخصوص جماعتوں کی توسیع کے لیے ان کی جد و جہد کی آزادی محدود ہو جائے گی لیکن زمانہ مابعد نے ثابت کر دیا کہ یہ شبہات بے بنیاد تھے چنانچہ اب اس طرح کے شکوک قطعاً زائل ہو چکے ہیں۔ انجمن کے بنیادی و ابتدائی مقاصد میں سے ایسی موزوں عمارات کا حصول تھا جن میں ملحقہ اداروں کے اجلاس منعقد کیے جا سکیں، نیز سماجی اجتماعات اور مشترکہ تقریبات کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ چناں چہ ایک مناسب عمارت حاصل کر لی گئی اور نہایت موزوں نام کیلوین ہاؤس رکھ دیا گیا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں یہ طے ہوا کہ جدید طرز کی ایک نئی عمارت تیار کی جائے۔ اس کا سنگِ بنیاد جنوبی افریقہ کے گورنر جنرل ارل آف کلیرنڈن کے ہاتھوں رکھا گیا، اور اس عمارت کا رسمی افتتاح ٹرانسوال چیمبر آف مائنس کے صدر ڈاکٹر ول۔ ایم۔ اینڈرسن نے ۲۹ر اکتوبر سنہ ۳۷ء کو کیا۔ نئی عمارات کی تاسیس چیمبر آف مائنس کی فیاضی کی رہینِ منت ہے، جس نے وقتاً فوقتاً اس مقصد کے لئے قرضہ جات ادا کیے جن کی مجموعی مقدار ۴۴،۵۰۰ پونڈ ہوتی ہے۔ نیز اس کے سود کے معاملے میں بھی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

مندرجہ ذیل دس ادارے کیلوین ہاؤس سے ملحق ہو چکے ہیں:-

نام ادارہ		تعداد اراکین (سنہ ۱۹۴۴ء)
۱۔ انجمن کیمیا سازان و معدنیات و کان کنان،	جنوبی افریقہ	۸۷۷
۲۔ انجمن طبقات الارضی	جنوبی افریقہ	۲۵۷
۳۔ ادارہ پیمائشِ ارض	ٹرانسوال	۱۰۲
۴۔ ادارہ مستند انجنیئرس	جنوبی افریقہ	۶۶۲
۵۔ انجمن ترقیٔ سائنس	جنوبی افریقہ (شاخ و اٹرسرانڈ)	۲۵۱
۶۔ انجمن تجزیہ کنندگان معدنیات	جنوبی افریقہ	۲۰۳
۷۔ ادارہ کیمیا سازی (کیمیکل انسٹی ٹیوٹ)	"	۶۵۴
۸۔ ادارہ انجنیران بجلی	"	۱۱۴۴
۹۔ ادارہ انجنیران	"	۵۳۸
۱۰۔ ماہران تعمیرات جنوبی افریقہ کا صوبائی ادارہ (صوبۂ ٹرانسوال)		۳۷۶
	میزان	۵۰۶۴

علاوہ بریں ادارہ انجنیران نیٹال و انجمن انجنیران صوبہ شرقی بھی اس سے ملحق ہیں۔ ہر شامل ہونے والی جماعت سے فیس ممبری طلب کی جاتی ہے۔ کیلوین ہاؤس کا سکریٹریٹ (دفتر نظامت) ان میں سے بیشتر اداروں کے دفتر نظامت کے فرائض بھی انجام دیتا ہے اور اس صورت میں ان فرائض کے لیے مخصوص فیس علیحدہ دینی پڑتی ہے۔ لیکن یہ فیس ان مصارف کے مقابلہ میں

بہت کم ہوتی ہو جو اس ادارہ کو علیحدہ دفتر قائم کرنے میں پیش آئے۔

انجمن کے زیر اہتمام وقتاً فوقتاً عام لکچروں کا انتظام ہوتا ہو جن میں قومی نقطہ نظر سے اہم مضامین پر مسلمہ ماہرین خطبات دیتے ہیں۔

سماجی توقیر:

انجمن کا صدر منتخب ہو جانا بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہو اور سال ہائے گزشتہ میں کرسی صدارت پر جنوبی افریقہ کے صف اوّل کے سائنس داں و ماہرین فن متمکن ہو رہے ہیں۔ کیلوین ہاؤس نہ صرف شمولہ رکن اداروں کے لیے جلسہ گاہ ہی کا کام دیتا ہو بلکہ اراکین کی مختلف تقریبات کے سلسلے میں بھی اس کے استعمال کی اجازت مل جاتی ہو۔ ضیافتوں اور اسی قسم کی دیگر تقاریب کی سہولتیں بھی اس میں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی کیلوین ہاؤس کے قیام سے وہ تمام مقاصد پورے ہو رہے ہیں جو بانیانِ انجمن کے ذہن میں تھے لیکن بایں ہمہ بعض مجبوریاں بھی درپیش ہیں۔ مثلاً اس کے دلواٹرسرینڈ کے علاقہ میں واقع ہونے کی وجہ سے اس کے استعمال کا فائدہ وہی لوگ زیادہ حاصل کر سکتے ہیں جو اس نواح میں رہتے ہیں اور وہ لوگ جو اس سے زیادہ فاصلے پر بستے ہیں ان مراعات سے شاذونادر ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ بہرحال یہ توقع کی جاتی ہو کہ کیلوین ہاؤس کے مقاصد کی اشاعت عملی طور پر یونین کے اور بڑے مراکز میں بھی ہو گی اور پھر اسی طرح کی اس کی اور شاخیں قائم ہو جائیں گی۔

بہرصورت جنوبی افریقہ کی یہ سائنسی و حرفی انجمنیں سائنس کے مختلف شعبوں کے درمیان باہمی رشتہ اور کارکنان کے گہرے تعاون کا مظہر ہیں۔ جنوبی افریقہ نے اس انجمن کے قیام سے بڑے ترقی پسندانہ جذبات کا ثبوت دیا ہو اور دیگر ممالک کے لیے اس منزل پر گامزن ہونے کے لیے راہ تیار کر دی ہو۔ آنے والے زمانہ میں سائنسی کارکنوں کے فرائض کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔ عام طور پر انجمنیں صرف اپنے اراکین کے مخصوص مفادات کا لحاظ رکھتی ہیں لیکن متحدہ انجمنوں کا مطمح نظر اس سے کہیں زیادہ وسیع اور ان ذرائع کا فراہم کرنا ہو جن سے یہ رکن ملکی و قومی معاملات میں اجتماعی حیثیت سے اپنی صحیح جگہ حاصل کر سکیں۔ اگرچہ اس انجمن کے قیام کے بعد اس کے مقاصد بڑی حد تک پورے ہوئے ہیں لیکن امید ہو کہ آئندہ حصولِ مقاصد کے لیے کیلوین ہاؤس اور بھی زیادہ مستعدی اور تیز رفتاری سے کام لے گا اور سائنس دانوں کے افکار و خیالات کو زیادہ موثر بنانے میں اعانت کرے گا جس سے جنوبی افریقہ کے اہم مسائل کے مناسب اور فوری حل میں امداد ملے گی۔

سگریٹ کو چیلنج

(از- ایل- سی- ہیرنگ امریکا)

معلوم نہیں سگریٹ میں کون سی کشش موجود ہے جس سے اس کے خلاموں اور پرستاروں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے؟ کیا سگریٹ متمدن زندگی کے لیے کوئی ضروری چیز ہے؟ اگر ایسا ہے تو سگریٹ نہیں پینے والوں کی چھوٹی سی جماعت اس کے بغیر کیونکر زندگی بسر کر رہی ہے؟

کیا کوئی سبب ایسا بھی ہے جس سے سگریٹ کا وجود ضروری اور لازمی قرار دیا جاتے؟ کیا یہ کلچر اور صاف ستھری زندگی کی ایک خصوصیت ہے؟ کیا یہ فطری چیز ہے؟ کیا اس کے استعمال کرنے والوں کی صحت کو کوئی فائدہ ہوتا ہے؟ کیا اس سے دنیا کے حسن یا قوتِ پیداوار میں ذرّہ برابر بھی اضافہ ہوتا ہے؟ کیا بے پروا "سگریٹ نوشوں" کے باعث جتنے مکانوں میں آگ لگتی ہے انکو بجھانے کے لیے "فائر بریگیڈ" کی سروس پر مزید رقمیں خرچ نہیں ہو رہی ہیں، اور کیا پبلک کو دوسروں کے لیے یہ ٹیکس ادا کرنا نہیں ہوتا؟

میرا یہ دعوےٰ ہے کہ سگریٹ ایک سنگین اور بڑھتا ہوا خطرہ ہے جس کو روکنے کا فرض ہر ذہن اور سوجھ بوجھ والے انسان پر عائد ہوتا ہے۔ اب سے چالیس سال پہلے سگریٹ کو صحت کے لیے نقصان دہ سمجھا جاتا تھا اور اکثر والدین اپنے لڑکوں کو اس بری عادت سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس زمانے میں بہت کم مرد ایسے تھے جو سگریٹ پیتے تھے، اور عورتیں بھی بلندی سے اتنی پستی کی طرف نہیں گری تھیں۔ سنہ ۱۹۰۸ء سے پہلی عالم گیر لڑائی تک سگریٹ آہستہ آہستہ مگر یقینی اور مسلسل طور پر عام قبولیت حاصل کرتا رہا۔

اکثر "سگریٹ نوش" حضرات ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کی عافیت کا خیال نہیں کرتے وہ جہاں بھی ہوتے ہیں اپنی خواہش کے مطابق سگریٹ پینا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ کسی سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور اگر رسمی طور پر اجازت کے طالب بھی ہوتے ہیں تو سگریٹ کو منہ سے لگانے اور دیا سلائی کو سگریٹ تک پہنچانے کے بعد یہ رسم ایک تبسم کے ساتھ ادا کر دیتے ہیں اور اجازت کا انتظار کیے بغیر منہ سے دھواں نکالنے لگتے ہیں۔ مغربی ممالک کی عورتیں اس سلسلے میں سب سے بڑی مجرم ہوتی ہیں، اور جب کسی ہوٹل میں یا پبلک مقام پر بیٹھتی ہیں تو سگریٹ پی کر اپنے "اپ۔ ٹو۔ ڈیٹ" ہونے کا مظاہرہ ضروری سمجھتی ہیں۔ وہ کھانے کے وقت بھی دوسروں کی تکلیف کا خیال کبھی نہیں کرتیں۔

بعض ریل گاڑیوں میں سگریٹ یا سگار وغیرہ پینے والوں کے لیے الگ ڈبہ ہوتا ہے۔ لیکن عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ سگریٹ پینے والوں اور نہ پینے والوں کو ایک ہی ڈبہ میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ گویا ہر شخص کا فرض ہے کہ سگریٹ کا دھواں اپنے پھیپھڑوں تک پہنچائے خواہ اسے یہ چیز گوارا ہو یا ناگوار ہو۔

یہاں پر ایک سوال ہمارے سامنے آتا ہے۔ کیا مرد یہ پسند کرتا ہے کہ عورت سگریٹ پیے؟ اس کا جواب کھلی ہوئی نفی میں ہے۔ مرد اس حرکت کو کبھی دل سے پسند نہیں کرسکتا۔ وہ عورت کس طرح سوسائٹی میں گوارا کی جاسکتی ہے جس کے منہ سے سگریٹ کے دھوئیں کی بو آرہی ہو؟

اب انڈسٹری اور کارخانوں کا حال دیکھیے۔ کیا سگریٹ سے لوگوں کی صلاحیت کار اور صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے؟ کیا اس سے صحت کا تحفظ ہوتا ہے؟ ہمیں دیانت داری کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس سے پیداوار گھٹتی ہے۔ کام کی رفتار سست ہوتی ہے، صحت خراب ہوتی ہے، اور کارخانوں یا اس کے کسی حصے کو آگ لگنے کا خطرہ زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ بعض کارخانوں میں سگریٹ پینے کی ممانعت ہوتی ہے، پھر بھی سگریٹ نوش لوگ نہیں جانتے اور کسی نہ کسی طرح سگریٹ پی ہی لیتے ہیں۔ میں نے سامانِ جنگ تیار کرنے والے ایک کارخانے میں دیکھا کہ ہر جگہ تختیوں پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں "یہاں سگریٹ پینا سخت منع ہے، اور ایک قانونی جرم ہے" لیکن دیکھا کہ جب اس کارخانے کے خزانچی صاحب کمرے سے برآمد ہوئے تو ان کے منہ میں جلتا ہوا سگریٹ موجود تھا۔

سگریٹ کی کمپنیوں کی اشتہار بازی بے حد گمراہ کن ہوتی ہے۔ اس میں سگریٹ نوشی کے فائدے طرح طرح کے اشاروں اور کنایوں کے ذریعہ بتائے جاتے ہیں۔ حالاں کہ طبی اعتبار سے یہ ایک مسلّم امر ہے کہ سگریٹ پینے سے نقصان کے علاوہ کبھی کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ اگر سگریٹ سوسائٹی کے لیے مفید نہیں ہے تو اس کا کیا سبب ہے کہ سگریٹ نوشی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی؟ ہم جانتے ہیں کہ بہت سے سگریٹ نوش حضرات ایسے ہوں گے جو اس کے غلام ہو کر بھی اس کی غلامی سے خوش نہیں ہوں گے۔ وہ اس بری اور مخرب صحت عادت کو ترک کرنا چاہتے ہوں گے، مگر سگریٹ کی گرفت ان کی مجبوری کا باعث بن گئی ہوگی۔ ان کا فرض ہے کہ قوتِ ارادی سے کام لیں اور ایسی سوسائٹیوں میں شامل ہو جائیں جو سگریٹ نوشی کی مخالف ہوں۔

(فزیکل کلچر کے شکریے کے ساتھ)

جالینوس کے حکیمانہ اقوال

(۱) جالینوس سے کسی نے استفسار کیا کہ انسان کا مرنا کس وقت بہتر ہے؟ جالینوس نے اس سوال کا جو حکیمانہ جواب دیا وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:-

"انسان کا اس وقت مرنا بہتر ہے، جب وہ نیک و بد میں امتیاز نہ کر سکے"

(۲) جالینوس کہتا ہے، انسان کو سب سے پہلے اپنے آپ کو پہچاننا چاہیے۔ اسی سے اس کے اخلاق و اعمال کی اصلاح ہو سکتی ہے، اپنے آپ کو پہچاننا ہی بڑی حکمت اور دانائی ہے، کیوں کہ انسان کو اپنے آپ سے اس قدر محبت ہے کہ وہ اپنی بُری بات کو بھی بُری نہیں سمجھتا، اور اس پندار میں اپنی ذات کو دنیا بھر کے اوصاف کا مجموعہ سمجھنے لگتا ہے۔ کوئی اپنے آپ کو بڑا دلیر اور بہادر سمجھتا ہے، اور کوئی اپنے آپ کو بڑا سخی خیال کرتا ہے، حالاں کہ وہ درحقیقت ایسے نہیں ہوتے۔ اسی طرح ہر شخص اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ عقل مند سمجھتا ہے۔ حالاں کہ عقل مند وہ شخص ہے جو دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے عقل خیال کرے۔

انسان کو اس قسم کی خود پسندی سے بچانے کے لیے بہتر تدبیر یہ ہے کہ اپنے روزانہ افعال کی نگرانی کے لیے کسی دوسرے آدمی کو مقرر کرے، تاکہ وہ اس کے روزانہ کے نیک و بد کاموں سے اس کو شام کے وقت آگاہ کرتا رہے، پھر ان پر خود غور کرے اور آئندہ کے لیے نیک کاموں کو اختیار اور بُرے کاموں کو ترک کر دینے کی راہ اختیار کرے۔

(۳) میں بہت سے بادشاہوں کو دیکھتا ہوں .... جو عالم فاضل غلاموں کو بہت بڑی قیمتیں دے کر خریدتے ہیں، اسی طرح گھوڑے بھی اعلیٰ نسل کے پسند کرتے ہیں، لیکن افسوس وہ نیک انسان بننے کے لیے) اپنے اخلاق و اعمال کی اصلاح نہیں کرتے، اگر ان صفات کا غلام (جو خود ان بادشاہوں میں موجود ہیں) ان کی خدمت میں پیش کیا جائے تو وہ اس کو ہرگز خریدنا پسند نہیں کریں گے، یہ کتنی بُری بات ہے کہ غلام یا گھوڑا تو اپنی قیمت کے مطابق ہو لیکن مالک کی اتنی حیثیت بھی نہ ہو کہ کوئی اسے مفت حاصل کر سکے۔

(۴) جو بچے شریر ہونے کے ساتھ پرلے درجے کے بے حیا ہوں ان کی اصلاح ناممکن ہے، لیکن جو بچے بے حیا نہیں ہیں، ان کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

(۵) رنج و غم، فکر و تردد دل و دماغ کے لیے مضر ہیں، ان سے بچو، یہ جان کے بھی دشمن ہیں ۔


گھر میں، ہسپتال میں، سفر میں اور
شکار میں بھی ہمدرد مرہم ساتھ رکھنا
ضروری ہے، ہر حادثے کے وقت
کام آنے والا ہے، ہر تکلیف کو
رفع کرنے والا ہے۔
خالص نباتی چیز ہے،
اسے ہمدرد ــــ بناتا ہے
ہر جگہ ملتا ہے ــــ آج ہی خرید کر اپنے پاس رکھیے

سوال و جواب

حکیم حافظ محمد سعید دہلوی

بچوں کے لیے صنفی تعلیم

سوال: ہمارے ہاں اسکول میں لڑکے اور لڑکیوں کو صنفی تعلیم دینے کا کوئی انتظام نہیں ہے، حالاں کہ جب انھیں دنیا کے دوسرے تمام علوم پڑھائے جانے کا بندوبست کیا جاتا ہے تو صنفی تعلیم دینے کا بھی انتظام کیا جانا چاہیے۔ اس کا بندوبست نہ اسکولوں میں کیا جاتا ہے اور نہ کالجوں کے نصاب ہی میں اس کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے، یقین ہے کہ آپ کو بھی ہماری اس رائے سے اتفاق ہوگا۔ کہ صنفی تعلیم کو اسکولوں ہی کے نصاب تعلیم میں شامل کر لیا جائے۔ ہم ممنون ہوں گے اگر آپ اس وقت کے اہم ترین مسئلہ پر اپنے پاکیزہ خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اگر صنفی تعلیم کا صحیح صحیح بندوبست ہو گیا تو پھر ہمارے بچے بڑی حد تک ان غلط کاریوں کا شکار نہ ہوں گے جو اسکول کے زمانے میں وہ ایک دوسرے سے چھوت کی طرح لگا لیتے ہیں۔ یہ بھی فرمائیے گا کہ کس عمر میں صنفی تعلیم دینے کا بندوبست کیا جائے۔ امید ہے کہ صنفی معاملات پر جو وسیع تجربہ آپ کو ایشیا کے ایک بہت بڑے دواخانے کے مالک اور کارکن کی حیثیت سے حاصل ہے اس سے مستفید ہونے کا ہمیں اور دیگر ناظرین ہمدرد صحت کو آپ پورا پورا موقع دیں گے۔

عزیز احمد و محمد محسن علی۔ کراچی

جواب: یہ بات تو بلاشبہ صحیح ہے کہ بچوں کو عمر کی کسی نہ کسی منزل پر ضروری صنفی تعلیم دینے کا بندوبست کیا جانا چاہیے، اس لیے کہ اعضائے جسمانی میں جہاں دماغ، قلب، پھیپھڑے، معدہ، جگر، تلی اور گردے وغیرہ ہیں، وہاں اعضائے تناسل بھی ہیں۔ اب جس طرح دوسرے اعضائے رئیسہ کے افعال تشریح اور منافع بتائے جاتے ہیں، اسی طرح اعضائے تناسل سے متعلق بھی نہایت سنجیدگی اور وقار کے ساتھ ضروری معلومات بہم پہنچائی جاسکتی ہے۔ یہ ماہرین تعلیم نفسیات کا کام ہے کہ جس درجہ کے نصاب تعلیم میں وہ اسے شامل کرنا مناسب سمجھیں اس میں کردیں۔ آپ کے اس مطالبے سے ہمیں بھی اتفاق ہے مگر یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ صنفی معاملات پر اگر بچوں کو صحیح معلومات بہم پہنچا دی گئیں تو وہ ایک مرتبہ ہی ایسے نیک ہو جائیں گے کہ اعضائے تناسل کا استعمال کرنا ہی چھوڑ دیں گے آج انگلستان و امریکا جیسے مہذب ممالک میں صنفی تعلیم کا بہت چرچا ہے اور بڑے اہتمام کے ساتھ خود والدین اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ مگر اس قدر تعلیم و تعلّم کے باوجود بھی، وہاں کے متعلق ہماری معلومات تو یہ ہیں کہ جس قدر بدفعلیاں اور غلط کاریاں یورپ و امریکا میں ہوتی ہیں، ہندستان و پاکستان کو اس معیار تک پہنچنے کے لیے ابھی پندرہ بیس سال کی ضرورت ہے۔ دور کیوں جائیے آپ اپنے ملک ہی کا جائزہ

لے لیجیے آج سے پچاس سال پہلے ہمارے نوجوانوں میں بدکاریوں کا اس قدر چرچا نہیں تھا جتنا کہ آج ہے۔ اُس وقت ہمارے ملک کا پندرہ سولہ سالہ باشندہ صنفی معاملات کے متعلق عام طور پر بالکل ہی جاہل ہوتا تھا آج کی نسبت ان کی صحت بھی اچھی ہوتی تھی اور وہ ان بدکاریوں سے بھی ناواقف ہوتے تھے جنھیں آج کا شاید ہی کوئی دس سالہ بچہ ہو جو نہ جانتا ہو یا ان میں مبتلا نہ ہو۔ اب جہاں تک صنفی تعلیم کا تعلق ہے، اس کا اہتمام نہ اس وقت تھا نہ اب ہے، بلکہ اب تو کسی نہ کسی حد تک ہے بھی۔ اس وقت تو بچوں کے سامنے صنفی معاملہ کا ذکر بھی کرنا نہایت بُرا سمجھا جاتا تھا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ اس وقت بچے کم خراب ہوتے تھے اور اب زیادہ بدکار ہوتے ہیں۔؟ کبھی آپ لوگوں نے اس پہلو سے بھی اس مسئلے کو دیکھا؟

میں نے تو جتنا اس مسئلے پر غور کیا ہے اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بچوں کو بدکاریوں سے بچانے والی چیز صنفی تعلیم نہیں ہے، بلکہ معاشرہ اور سوسائٹی کی پاکیزگی ہے۔ آج سے پچاس سال پہلے ہماری سوسائٹی نسبتاً پاک تھی۔ گھر کا اور بازار کا ماحول اچھا تھا۔ مدرسوں میں بھی جو بچے پڑھتے تھے، وہ بھی ان بُرے کاموں سے ناواقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شادی سے پہلے انھیں صنفی معاملات کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالیے کہ میں بچوں کو ضروری صنفی تعلیم دینے کے خلاف ہوں، میں تو اس کے بڑے حامیوں میں سے ہوں۔ مگر میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کی حیثیت محض تعلیم کی ہوگی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ عمل بھی کر لیا جائے۔ بچوں کو عمل پر اُبھارنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے گرد و پیش میں جو لوگ رہتے ہوں، وہ بداعمال نہ ہوں، اخلاق کو بگاڑنے والے کام نہ کرتے ہوں، ان کے گھر کا ماحول نہایت پاکیزہ ہو۔ اور جو آواز ان کے کان میں پڑے وہ انھیں بداعمالیوں سے باز رکھنے کی ترغیب دینے والی ہو، اس کے ساتھ ہی انھیں اپنے خدا کا خوف بھی ہو۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہو کہ اگر ہم نے ان قوتوں کو ضائع کیا تو ہم نہ صرف یہ کہ دنیا ہی میں تکلیف سے رہیں گے بلکہ اس کا عذاب اور برا بدلہ ہمیں آخرت میں بھی ملے گا۔ ہماری سوسائٹی میں سے بدکاریوں کا استیصال اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اس سے پیشتر بھی ایک سوال کے جواب میں مَیں اپنے خیالات کا اِظہار کر چکا ہوں اور اب بھی مَیں تو یہی سمجھتا ہوں کہ صنفی تعلیم کی بڑی سے بڑی مقدار بھی ہمارے بچوں کو صنفی بدکاریوں کے ارتکاب سے نہیں بچا سکے گی۔

آنت اترنا

سوال:۔ ابھی حال ہی میں مجھے کچھ فتق کا شبہ ہوا تھا تو میں نے ایک ڈاکٹر کو دکھایا۔ اُس نے میرے پٹھوں کو دیکھ کر یہ بتایا کہ ابھی تک تو آپ کو فتق کی شکایت نہیں ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ آئندہ یہ شکایت بہت جلد ہو جائے۔ مجھے اس نے پیٹی باندھنے کی ہدایت دے کر رخصت کر دیا۔ مجھے ڈاکٹروں کے مشورے پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں ہے، کیا آپ مجھے اس سلسلے میں صحیح صحیح مشورہ دے کر ممنون فرمائیں گے؟

محمد اشرف محمود

جواب:۔ مَیں نے آپ کا معائنہ تو نہیں کیا، لیکن آپ فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر نے دیکھ کر یہ کہا ہے کہ ابھی تک

تو فتق کی شکایت نہیں ہے، لیکن آئندہ ہونے کا امکان ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے چڈھوں سے ذرا اوپر آنت کا کچھ حصہ اُبھر کر اپنی موجودگی کا پتہ ضرور دے جاتا ہے۔ اور اگر یہی حال رہا تو آنت ایک نہ ایک دن بالکل نیچے اوکر خصیتین کی تھیلی میں آجائے گی۔ اگر واقعی یہی حال ہو تو یہ سمجھ لیجیے کہ ابھی اس کی ابتدا ہوا ہے اس سے متعلق جو مخصوص پٹی بازار میں ملتی ہے، اس کے باندھنے سے یہ شکایت قطعی طور پر رفع ہو سکتی ہے اس کے ساتھ ہی میں آپ کو کچھ دوسری تدبیریں بھی بتانا چاہتا ہوں کہ جن پر عمل پیرا ہونے سے یہ شکایت یقینی طور پر ہمیشہ کے لیے رفع ہو سکتی ہے۔

اول تو اس کا خیال رکھیے کہ آپ کو قبض نہ ہونے پائے۔ اس لیے دوا میں موزِ منقّی کا استعمال کیجیے رات کو سوتے وقت ۹ دانے اس کے ویسے بھی کھائے جا سکتے ہیں اور اس کے پندرہ دانے چوبیس گھنٹے پانی میں بھگو کر، خوب مَل چھان کر اس کا پانی بھی پیا جا سکتا ہے۔ اس کا پانی ہمیشہ نہار منہ صبح اٹھتے ہی پی لینا زیادہ مناسب ہے اور غذا میں موسمی پھلوں اور سبزیوں اور ترکاریوں کا استعمال زیادہ کرنا چاہیے۔ بے چھنے آٹے کی روٹی خوب چبا کر کھائی جائے۔ امید ہے اس تدبیر سے قبض ہمیشہ کے لیے جاتا رہے گا۔

دوم، کچھ خاص خاص ورزشیں بھی کرنی چاہییں۔ اور وہ کسی ایسے تختے پر لیٹ کر کی جانی چاہییں جس کا سرہانہ ڈھائی یا تین فٹ پائنتیوں کے مقابلے میں نیچا ہو۔ اس طرح سر نیچا رہے گا اور ٹانگیں اوپر۔

. ورزش ۱: کسی ایسے تختے پر اس طرح چت لیٹ جائیے کہ آپ کے پاؤں کسی تسمے وغیرہ کے ہک میں پھنسے ہوئے ہوں۔ پھر کمر پر سے بالائی حصۂ جسم کو دائیں جانب موڑیں اس طرح کہ دونوں ہاتھ بھی دائیں طرف ہی پھیلیں۔ اس کے بعد اسی طرح بائیں طرف موڑیں۔

اپنے دھڑ کو اسی طرح باری باری سے کبھی دائیں تو کبھی بائیں موڑتے رہیے۔ یہ خیال رہے کہ ٹانگیں بالکل سیدھی رہیں گی۔ یہ ورزش اتنی مرتبہ کیجیے کہ عضلات متعلقہ میں تھکن کا احساس ہو جائے۔

دوسری ورزش: ورزش ۱ کی طرح تختہ پر چت لیٹنا ہے۔ سر نچلی طرف رہے گا اور ٹانگیں اوپر کی طرف۔ ہاتھوں سے سرہانے کی طرف مضبوطی کے ساتھ پکڑیے تاکہ نیچے نہ پھسل جائیں۔ اس کے بعد پہلے دائیں ٹانگ بالکل سیدھی اٹھائیے۔ اور پھر اسے بائیں طرف جتنا جھکایا جا سکے جھکائیے۔ اسی طرح اس کے بعد بائیں ٹانگ کے ساتھ کریں۔ یہ ورزش بھی باری باری اتنی بار کیجیے کہ عضلات متعلقہ میں تھکن کا احساس پیدا ہو جائے۔

تیسری ورزش: اس ورزش میں سطح فرش پر لیٹ جائیے اور دونوں ٹانگوں کو ملا کر اوپر اٹھائیے پہلے کولھوں تک اٹھیں گی، پھر مزید زور لگا کر، ہاتھوں کا کمر پر سہارا دے کر انھیں اتنا اونچا اٹھائیے کہ فقط آپ کے شانے اور گردن زمین پر ٹکی رہے، پھر دونوں ٹانگوں کو آہستہ آہستہ سر پر سے گزار کر انھیں زمین پر ٹکا دیں۔ شروع میں کچھ دقت ہوگی، لیکن کچھ عرصے بعد آپ کی ٹانگیں سر کے پیچھے زمین پر ٹکنے لگیں گی۔ اس ورزش کا چار پانچ مرتبہ کر لینا کافی ہوگا۔

اس دوران میں اول تو دوسری ورزشیں کرنی نہیں چاہییں، لیکن اگر کی جائیں تو بہت ہی ہلکی

قسم کی ورزش نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تازہ ہوا میں کچھ وقت گزارنا بہرحال ضروری ہے۔ یقین ہو کہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے آپ ہمیشہ کے لیے قبض سے محفوظ ہو جائیں گے۔

کیا قند مضر ہے؟

سوال۔ میں نے اکثر ہمدرد صحت میں پڑھا ہے کہ شکر سفید (قند) مضر صحت ہوتی ہے، اسے استعمال نہ کیا جائے۔ براہ مہربانی آپ یہ بھی بتائیے کہ یہ شکر ہمارے لیے کیوں مضر ہوتی ہے؟ عبدالمغنی

جواب: اصل میں شکر سفید (قند) جس طریق پر صاف کی جاتی ہے، اس کی وجہ سے اس میں سے بہت سے کارآمد غذائی اجزا ضائع ہو جاتے ہیں اور اس کے استعمال سے نظام جسمانی کے تغذیہ میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ اس میں چوں کہ حیاتین و معدنی نمکیات نہیں ہوتے، اس لیے اس کی وجہ سے ہمارے خون میں تیزابیت بڑھ جاتی ہے۔ اب اگر ہم ایسی غذا استعمال کرتے ہیں جس میں حیاتین اور معدنی نمکیات کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں، تب تو سفید شکر کے نقصان کا ازالہ ہو جاتا ہے، ورنہ پھر خون اپنی تیزابیت کو دور کرنے کے لیے ان ضروری اجزائے غذا کو ہمارے جسم ہی میں سے حاصل کرے گا۔ اب سمجھ لیجیے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ ہماری غذا میں حیاتین اور معدنی نمکیات کا بہت کم ہونا اور جو کچھ ہمارے جسم میں موجود ہے، اس کا دن بدن کم ہونا جو صورت حال پیدا کر سکتا ہے، اس کا بآسانی تصور کیا جا سکتا ہے۔ استحالۂ غذا میں بگاڑ رونما ہو جائے گا، اور جسم کے کیمیائی توازن میں خرق آجانے کے سبب سے بہت سی تکالیف کھڑی ہو جائیں گی۔

سفید شکر کے متعلق جدید ترین سائنٹفک تحقیق یہ ہے کہ یہ انسانی جسم کے لیے قطعی بے کار ہے اور اس کے کثرت استعمال سے نظام جسمانی میں مرضی کیفیات کے پیدا ہونے پر تعجب ہونا چاہیے۔ اس علمی تحقیق کی روشنی میں جب آپ ان طرح طرح کے امراض کا جائزہ لیں گے جن میں آج کل لوگ گرفتار پائے جاتے ہیں تو ان کے اصل و بنیادی سبب کا کھوج لگانے میں آپ کو کچھ زیادہ دقت نظر سے کام لینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

ورزش کا بہترین وقت

سوال: جسمانی ورزشوں کے لیے آپ کے نزدیک کون سا وقت سب سے بہتر ہے؟

(منہاج علوی۔ بی اے)

جواب: اصولی طور پر جسمانی ورزش کرنے سے پہلے جسم کو کافی آرام دے دینا چاہیے۔ اس صورت میں صبح اٹھتے ہی ورزش کرنا سب سے بہتر ہے اور ویسے کھانا کھانے کے دو ڈھائی گھنٹے کے بعد کسی وقت بھی کی جا سکتی ہے۔ معدے میں کافی غذا موجود ہونے یا اس کے تھکا ہوا ہونے کی صورت میں ورزش کرنا مضر ہے۔ اس کے علاوہ ایک تن درست آدمی کے لیے کوئی وقت بھی غیر موزوں نہیں ہے۔ ہاں گرم ملکوں کے رہنے والوں کو ورزش کرتے وقت اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ سخت گرمی کی حالت میں ورزش

نہ کی جائے تو اچھا ہے۔ صبح اور شام اس کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ یہ وہ وقت ہوں گے کہ جب یا تو معدے میں سرے سے غذا ہی نہ ہوگی اور اگر ہوگی تو معدی ہضم تقریباً مکمل ہو چکا ہوگا۔

تپ دق اور یوگا ورزشیں

سوال: آپ نے ماہ فروری سنہ ۴۷ء کے ہمدرد صحت سے یوگا ورزشوں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلہ میں میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ ان ورزشوں میں آپ کوئی خاص چیز بتائیں تو بات بھی ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ آپ یہ کہیں سے لے کر یا ترجمہ کر کے اپنے ہاں رسالے میں نقل کریں گے۔ سنا ہے کہ سری نگر کشمیر میں لالہ برج لال نہرو اکاونٹنٹ جنرل کشمیر اسٹیٹ مدت سے ٹی بی کے مریضوں کو یوگا ورزشوں کی مدد سے تن درست کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:-

"ٹی بی کا اصل سبب تازہ ہوا کی کمی ہے۔ اگر پھیپھڑوں کو تازہ ہوا دینے کا بندوبست کر لیا جائے تو مریض ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یہ اصول یوگا سے لیا گیا ہے اور اس پر ہر جگہ کتابیں ملتی ہیں۔"

اب یہ عرض ہے کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ یوگا ورزشوں کے سلسلے میں سے کون سی ورزشیں ٹی بی کے لیے مفید ہوں گی۔ آپ کو چاہیے کہ یوگا سے متعلق ناظرین ہمدرد صحت کو یہ نئی معلومات بہم پہنچائیں۔ ویسے ایلوپیتھک ڈاکٹر تو ٹی بی کے مریض کو ورزش کرنے سے عمر بھر کے لیے منع کر دیتے ہیں۔ اگر حکیم اقبال حسین صاحب آج کل موجود ہوں تو جواب ان ہی سے لکھوائیے کہ ذرا ورزشوں سے انھیں زیادہ لگاؤ ہے۔

(جسونت سنگھ۔ پٹھان کوٹ)

جواب:- جی ہاں یہ یوگا ورزشیں ہم مختلف مفید کتابوں سے اخذ کر رہے ہیں اور ماہرین یوگا کے مشورے سے ہمدرد صحت میں شائع کرتے ہیں۔ رہا ان میں کوئی نئی بات پیدا کرنا، تو ہم نے اس سلسلے میں اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے کہ جو یوگا ورزشیں دی جائیں ان کی معالجاتی افادیت پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھا جائے۔ اب یہ اور بات ہے کہ آپ کے لیے اس میں بھی کوئی نئی بات نہ ہو۔

ہمیں تو معلوم نہیں لالہ برج لال نہرو، کن یوگا ورزشوں سے تپ دق کا علاج کرتے ہیں، اور اگر یہ معلوم بھی ہو جائے تو میرے نزدیک اس میں کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ تپ دق میں میں خود بھی ورزش کرنے کا قائل ہوں اور اس پر یقین رکھتا ہوں کہ ورزش کی مدد سے مریض نہایت تیزی سے صحت یاب ہو سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ تپ دق کے مریض کے لیے ورزش کرنا اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب اس کی قوت مدافعت اتنی اچھی ہو جائے کہ اسے بخار نہ رہتا ہو اور پھیپھڑوں میں مرضی تحریک بڑی حد تک کم ہو چکی ہو۔ ورنہ اگر اس سے پہلے کی گئی تو سخت مضر ہوگی خواہ وہ یوگا ہی ورزش کیوں نہ ہو۔ بلکہ یوگا ورزش جب مضر پڑتی ہے تو معمولی قسم کی ورزش سے زیادہ مضر پڑتی ہے۔

جی ہاں تپ دق کا سبب تازہ ہوا کی کمی بھی ہے اور کیلسیم کی کمی بھی۔ اس لیے تپ دق کے مریضوں کو کھلی ہوا میں رکھنا اور پھل اور دودھ کا استعمال زیادہ سے زیادہ کرانا چاہیے تاکہ اس کے

نظامِ ہضم پر کم سے کم بار پڑے اور تغذیہ جسم اور قوتِ مدافعت زیادہ سے زیادہ بڑھے۔ ایسے مریضوں کے لیے جو ٹہلنے لگے ہوں کھلی ہوا میں آہستہ آہستہ دیر تک گہرے گہرے سانس لینا ہی سب سے اچھی ورزش ہے۔

شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ میں خود تپِ دق میں مبتلا ہو چکا ہوں اور ممکن ہے کہ اب بھی میرے پھیپھڑے پر اثر موجود ہو۔ ایکسرے لوں گا تو پتہ چلے گا۔ جولائی سنہ ۴۶ء میں مجھے یہ مرض ہوا تھا، جولائی، اگست، ستمبر، اور اکتوبر تک میں سینی ٹوریم میں رہا۔ اور سوائے قدرتی علاج کے اور کچھ نہیں کیا۔ وہاں سے چلا تو مرض اس وقت بھی میرے پھیپھڑے میں موجود تھا، اگرچہ میں پانچ چھ میل روزانہ پھرتا تھا۔ اس دوران میں ورزش کا جب بھی خیال کرتا اور ذرا یونہی ہاتھ پیر ہلا لیتا تو سخت تکلیف ہو جاتی اور میں اسے ڈر کر چھوڑ دیتا تھا۔ اپریل سنہ ۴۷ء میں پھر دوبارہ ایکس رے کرایا تو معلوم ہوا کہ مرض ابھی تک موجود ہے، اگرچہ پہلے کی نسبت کچھ کم حصے میں ہے۔ اب خدا کے فضل سے پانچ مہینے سے میں خوب ورزش کر رہا ہوں۔ شروع میں گہرے گہرے سانس کھلی ہوا میں لیتا ہوں اور اس کے بعد آدھ گھنٹے تک امریکن چارلس اٹلس کی کافی سخت ورزشیں کرتا ہوں۔ الحمدللہ میری طبیعت روز بروز بہتر ہی ہوتی جا رہی ہے۔ آئندہ ایکس رے لینے والا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے پھیپھڑے اب مرض کے اثرات سے صاف ہو گئے ہوں گے۔
(اقبال)

افادیت عالم آشکارا ہو گا۔ اعداد غور طلب ہیں :—

ٹیکہ لگے ہوئے مبتلائے مرض	۱۰	ٹیکہ لگے ہوئے مریضوں کی اموات	۴
بغیر " " "	۲۲۶	بغیر " " " " "	۱۸۶

ان اعداد سے ثابت ہوتا ہے کہ ٹیکہ لگے ہوئے مریضوں سے ۴۶ گنا زیادہ بغیر ٹیکہ لگے ہوئے مریض جاں بحق ہو گئے۔ مزید برآں ٹیکہ لگ جانے کے بعد جو لوگ اپنے کسی طاعون سے متوفی عزیز یا قریب کی تعزیت یا تجہیز و تکفین میں شرکت کرتا ہے تو وہ اپنے ہمراہ طاعون کے جراثیم لے جا کر معصوم و منزہ آبادیوں کو اس مرض سے ملوث نہیں کر سکتا۔ یہ قطعی غلط ہے کہ ٹیکہ لگنے کے ۷۲ گھنٹے بعد تک طاعون کا اثر ہو سکتا ہے۔ درصل ٹیکے کا اثر اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے۔ تجربات سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ جسے ایک مرتبہ ٹیکہ لگ چکا ہو وہ طاعون کا اثر قبول کرنے کے لیے دوبارہ مستعدین میں سے ہوتا ہے۔ نیز یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ حاملہ عورتوں کو ٹیکہ لگانے سے اسقاط ہرگز نہیں ہوتا۔ البتہ احتیاطاً سات ماہ کی مدت حمل کے بعد ٹیکہ نہیں دیا جاتا۔ ٹیکہ کا ردعمل بخار کی شکل میں ہوتا ہے، لیکن بعض طبائع ایسے بھی دیکھے جاتے ہیں جن پر یہ ردعمل نہیں ہوتا، اور ان کی نسبت یہ فیصلہ کرنا کہ ٹیکہ موثر نہیں ہوا محض وہم ہے۔

بہرکیف عوام کا فرض ہے کہ وہ من حیثیت المجموع زیادہ سے زیادہ طاعون کا ٹیکہ لگوائیں اور اس طرح قومی صحت و زندگی کو برقرار رکھیں[1]۔

---

[1] ٹیکے کے بارے میں ہمدرد صحت میں جنوری تا ستمبر سنہ ۴۷ء سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے۔ ٹیکے کے سلسلے میں ادارہ کے خیالات اس سلسلۂ مضامین سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

12547

ہمدرد دواخانہ

ہم بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے ہمدرد کی مخصوص ادویہ اور عام مرکبات کی فراہمی کا کراچی میں انتظام کردیا ہے۔ ہم کوشاں ہیں کہ "نسخہ بندی" کا بھی انتظام کرسکیں۔ انشاء اللہ جلد ہی اس کا بھی انتظام ہوجائے گا۔

ہمدرد دواخانہ فریر روڈ پر واقع ہے۔ اور رام باغ کے سامنے ہے۔

بندر روڈ سے ہمدرد دواخانہ پہنچنے کا راستہ

سول ہسپتال کے سامنے والی سڑک سے جاتا ہے۔ صدر سے "بس" فریر روڈ رام باغ جاتی ہے اور ہمدرد دواخانہ کے پاس جاکر ٹھیرتی ہے مریضوں کے معائنہ کا انتظام بھی کیا جارہا ہے۔ انتظام ہوتے ہی اخبارات میں اعلان کردیا جائے گا

ہم سب کو اپنی بہتر خدمات کا یقین دلاتے ہیں۔

ناظم اعلا